Part -2

برفیلی بلندیاں

مستنصر حسین تارڑ



ہوں... بھٹکتا ہوں.. ٹھوکریں کھاتا ہوں.. کہ ہر سُو دُھند راج کرتی ہے.. اس کی شناخت چھین لیتی ہے.. میں فارغ ہو کر الٹے قدموں خیمہ گاہ میں واپس بھی آ سکتا تھا لیکن یوں بھٹکنا.. ایک بھید بھرے جنگل میں ٹھوکریں کھانا مجھے اچھا لگ رہا تھا.. نیند رخصت ہو چکی تھی.. آنکھیں کھلی تھیں لیکن ان کے سامنے دھند کی سفیدی کے سوا کچھ نہ تھا.. ہاں کبھی کوئی ٹہنی.. ایک شاخ ایک شجر.. اور پھر دُھند کے حرکت کرتے سفید لبادے..

البتہ ایک غلطی ہو گئی تھی.. میں اپنے تئیں صرف چند لمحوں کے لیے خیمے سے باہر آیا تھا تاکہ اپنے آپ کو ہلکا کروں اور واپس چلا جاؤں.. اور صرف ایک سویٹر میں آیا تھا چنانچہ اب میں ٹھٹھرتا تھا.. درہ ملتر سے اُترتی تمام ہوائیں اسی وادی میں شوکتی اترتی تھیں اور یہاں اپنے سامنے برچ کا ایک گھنا جنگل پا کر الجھ الجھ جاتی تھیں جیسے موسم بہار میں مرغان چمن کے پاؤں پھولوں میں الجھ الجھ جاتے ہیں.. اس رکاوٹ کے باوجود سردی اپنا نیلا منجمد رنگ دکھاتی تھی اور میں ٹھٹھرتا تھا..

میں نے کچھ دیر اپنے آپ کو ہنری مور کے شاہکار مجسمے ''دی تھنکر'' کے سٹائل میں ایک ٹیلے پر براجمان ہونا چاہا.. کچھ سوچ بچار میں گم ہونا چاہا لیکن گھاس بھی اتنی یخ تھی کہ اس پر بیٹھے رہنا برداشت میں نہ آتا تھا.. اس نے لمحوں میں میری نشست خاص کو یکسر منجمد شل کر دیا اور میں اسے سہلاتا ہوا پھر سے جنگل میں بھٹکنے لگا..

دُھند کی سفیدی اب گھلتی جاتی تھی.. اس کا گھنا پن چھدرا اور ہلکا ہونے لگا تھا جیسے گاڑھی لسی میں پانی ملانے سے اس کی گھنی سفیدی ہلکی ہونے لگتی ہے.. دہی کے ذرے الگ الگ دکھائی دینے لگتے ہیں.. یہ اس لیے ہو رہا تھا کہ دھند کی رخصتی کا لمحہ آن پہنچا تھا.. اور سویرا ہونے کو تھی..

برف کے اندھے کنویں میں گرنے والے پانی کے مرغولے روشن ہونے کو تھے..

گھاس کے تنکوں میں کہیں کہیں جو اکا دُکا پھول پوشیدہ تھے ان کے رنگ نظر آنے لگے تھے.. دُھند الٹے قدموں لوٹ رہی تھی.. جنگل کو خالی کر رہی تھی..

اور میں نہیں جانتا کہ وہ کونسا لمحہ تھا جب سورج کی پہلی شعاعیں برچ کے اس سفید جنگل میں نقب لگا کر داخل ہوئیں اور دھند کو چیرتی ہر بوٹے ہر شاخ اور ہر ٹہنی کو منور کرتی چلی گئیں..

یہ ایک معجزہ نما تبدیلی تھی.. کرنوں کے زرد برچھوں کے آگے دھند کی سفید گمشدگی اور تاریکی ہتھیار ڈالتی جاتی تھی اور دھوپ غالب آتی جاتی تھی..

دھوپ ہر شجر کے پہلو میں سے ہو کر نکلتی تھی..

چوں جھاڑیوں، جنگلی بیلوں اور گھاس پھونس میں اپنی روپہلی شکل بھرتی ہوئی نمایاں ہوتی تھی.. میں نے طلوع آفتاب کا ایک منظر ہرات میں.. ملکہ گوہر شاد کے مقبرے سے پرے ایک ٹیلے پر ایک چری جرمن سیاح کے پہلو میں بیٹھے دیکھا تھا جب شعاعوں کے تیر ہم پر سے شاں شاں کرتے گزرتے تھے.. اور اب اسی.. کسی عام فرد کے تجربے میں نہ آنے والی اسی کیفیت کو یہاں برچ کے ایک جنگل میں اپنے آپ پر وارد ہوتے محسوس کر رہا تھا..

جب وہ پورے کا پورا جنگل عیاں ہو گیا.. دُھند کا لبادہ اٹھ گیا اور وہ عریاں ہو گیا.. تو اس کا سحر ریزہ ریزہ ہو گیا..

چونکہ میں بھی اب تک اس سفید پوشیدگی میں تھا اس لیے دھوپ نے مجھے بھی برہنہ کر دیا اور بے آرام کر دیا..

اب یہ محض ایک اور جنگل تھا..

اور میں محض ایک اور انسان..

اب یہاں نہ کوئی ونڈر لینڈ تھی اور نہ کوئی سنڈریلا..

چراگاہ کی جانب سے پورٹروں کی آوازیں آ رہی تھیں.. وہ جاگ چکے تھے اور ناشتہ تیار کرنے کے لیے جنگل میں سے لکڑیاں جمع کرنے کے لیے آ رہے تھے..

''جنگل کے پار ایک اور جنگل اور پیاس بھرا ایک خشک صحرا..''

ایک اور جنگل تھا..

جنگل کے پار ایک اور جنگل تھا..

لیکن یہاں ہر شے عیاں تھی..کوئی بھید کوئی پوشیدگی نہ تھی..

ہم اپنے پہاڑوں کے سفر کے آخری دن میں تھے..

آج کی شب کے بعد ہم نے پھر اپاہج ہو جانا تھا..جیپوں..کاروں..موٹر سائیکلوں اور سائیکلوں پر زندگی گزارنی تھی..اگر چلنا بھی تھا تو مجبوراً چلنا تھا خوشی سے نہیں چلنا تھا..

ہم اپنی آخری منزل پھسو را گاؤں کی جانب سفر کرتے تھے..

اگرچہ اس لمحے ہم نہیں جانتے تھے کہ آج کا سفر کتنا طویل' کتنا پیاس بھرا اور بدنی اذیت سے بھرپور ہوگا..

ہم اپنی خیمہ گاہ سے..رخصت ہو چکے تھے اور پھر سے ایک اور جنگل میں آ گئے تھے..

بے شک اس جنگل میں کوئی بھید نہ تھا لیکن اس کے باوجود وہ مجھے اس عریانی میں بھی اپنے آپ پر فریفتہ کرتا تھا..

ایک مفروضہ ہے کہ حُسن اور کشش صرف پردہ پوشی اور پوشیدگی میں ہے..عریانی اور بے لباسی میں یہ سب کچھ زائل ہو جاتا ہے..

لیکن ایسا صرف وہ کہتے ہیں جنہوں نے محض ہوس میں مبتلا ہو کر پوشیدگی کو دیکھا ہوتا ہے..

عریانی اور بے لباسی ہی تو آپ کا امتحان ہوتی ہے..کہ آپ محض ایک ہوس گزیدہ شخص

ہیں یا اُس صنم کے سچے پجاری ہیں..

دراصل بے لباسی ہی سرمد منصور کا لباس ہوتی ہے..تب عریانی اصل ہو جاتی ہے اور اس کو ڈھکنے والا پیراہن دکھاوا ہو جاتا ہے..

عشق محض پوشیدگی سے مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ عریانی اس کا امتحان نہ لے..میں نے اس جنگل کو آج سویرے پردہ پوش دیکھا تھا اور اب اسے برہنہ دیکھ رہا تھا تو اس کے باوجود اس کے سحر میں کمی نہ ہوئی تھی..بلکہ اس کی کشش بڑھ گئی تھی اس لیے کہ میں ہوس گزیدہ نہ تھا..

ہم اپنی خیمہ گاہ سُرخ پتھر سے رخصت ہو چکے تھے..شیخ بابا کے جھونپڑے کے برابر میں سے گزر کر برج کے ایک اور جنگل میں داخل ہو چکے تھے اور خوش تھے کہ یہ آخری دن ان جنگلوں کی چھاؤں چھاؤں گزر جائے گا..

تقریباً دو گھنٹے کی مسافت کے بعد برچ کی چھدری چھاؤں میں..ایسے کُنج بھی تھے جو گھنے اور پُرفریب تھے..تالاب تھے..چھوٹی ندیاں تھیں اور چڑیاں اڑان کرتی تھیں..ہم جنگل کے کناروں تک آئے جن کے نیچے پھسو را نالہ بہتا تھا..شور کرتا تھا..جھاگ اُڑاتا تھا..ایک پگڈنڈی نیچے پانیوں اور پتھروں تک جاتی تھی..ہم احتیاط سے اترتے نالے تک پہنچے جس پر ایک پل تھا..خوش نصیبی تھی کہ یہ ایک محفوظ پل تھا لیکن جب ہم اس کے پار گئے تو گویا خوش نصیبی پل پر ہی رہ گئی کہ اس کے پار ایک نہایت تیکھی اور بھربھری اونچائی شروع ہو رہی تھی..اور اس کے تیور اچھے نہیں تھے..ہمیں اس مقام کی اس چڑھائی کے بارے میں گلگت میں ہی خبردار کر دیا گیا تھا کہ یہاں توبہ تائب ہو کر قدم رکھے گا..یعنی ہو سکتا ہے یہ آپ کا آخری سفر ہو..

دوسرے کنارے پر کوئی کنارہ نہ تھا..

محض کنارے کا ایک اشارہ تھا..

ہم پار ہو کر اس کے نیچے کھڑے ہو گئے اور منہ اٹھا کر اسے دیکھنے لگے..اس پر ایک راستے کے نشان تو تھے لیکن مجھے یقین تھا کہ اسے آج تک کسی بکری نے بھی پار نہیں کیا ہوگا..

میں نے اپنے آپ کو خوب بُرا بھلا کہا کہ شریف آدمی پچھلی شب تم نے ضرور یہ بڑھ ماری تھی کہ اس ٹریک میں تسلی نہ ہوئی..قربت مرگ کے کوئی واضح آثار پیدا نہیں ہوئے..اب کر لو تسلی..

''میاں صاحب..'' میں نے فرزند علی کو پکارا جو اس راستے کو دیکھ کر بار بار اپنی عینک

اتارتا تھا اور اسے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے چیک کرتا تھا "اپنی روح میں بالیدگی پیدا کیجیے۔"

"میں نے جناب عالی جھک ماری تھی.." "میاں مذاق کے موڈ میں نہ تھا" آپ نے ضرور یاد دلانا تھا.."

اس راستے کو بھی کسی برالڈو دریا پر معلق ہی سمجھیے.. صرف اس فرق کے ساتھ وہاں آپ گرتے ہیں تو ذرا دیر کے بعد پانی میں گرتے ہیں اور یہاں آپ پھسلتے ہیں تو فوراً ہی پھورا نالے کے پانی آپ کو قبول کر لیتے ہیں..

پہلے تو متعدد ہاتھوں نے ہمیں کنارے سے گھسیٹ کر اوپر راستے پر ڈھیر کیا.. جب ہم اٹھے تو اٹھا نہ گیا.. ہم نے پھر مدد کے لیے ہاتھ کھڑے کر دیے.. کیونکہ اٹھتے تھے تو چکرا جاتے تھے.. پورٹروں کے ہاتھ تھام کر.. ان کے بدنوں پر بوجھ ہوتے.. ایک دوسرے کے سہارے لیتے.. تھوک نگلتے.. ٹانگوں میں سے جان کب کی زائل ہو چکی تھی.. انہیں گھسیٹتے.. گرتے پڑتے.. پھورا نالے کے پانیوں سے نظریں چراتے اور دل ہی دل میں ان سے درخواست گزارتے کہ بڑے بھائی ہمیں یاد نہ کر لینا.. اپنے پاس نہ بلا لینا.. اور جب اس راستے کا یکدم اختتام ہوا تو ہم ظاہر ہے حیران ہوئے کہ آگے تو ایک عرش مقام بلند ہے تو ہم نے اب کہاں جانا ہے.. لیکن ہم نے انہی بلندیوں پر فائز ہونا تھا.. اسی عرش تک پہنچنا تھا جہاں غالباً فرشتوں کے پر بھی جل سکتے تھے لیکن ہمارے پورٹر ایسے باکمال تھے کہ وہ وہاں پہنچ رہے تھے اور ان کا کچھ بھی نہیں جلتا تھا..

عرش پر پہنچے ہوئے پورٹروں نے جب ہمیں نیچے فرش پر دیکھا تو جان گئے کہ ہم کوئی ایسی پاکیزہ ارواح نہیں ہیں کہ وہاں تک پہنچ پائیں چنانچہ ان میں سے کچھ نیچے اترے.. ایک زنجیر بنائی اور پھر باری باری ہمارے ہاتھ پکڑ کر ہمیں بے جان بوریوں کی مانند گھسیٹتے ہوئے اوپر لے گئے.. لیکن وہ ہمیں ایک خاص مقام تک ہی لے جا سکتے تھے اور وہاں عرش دس بارہ فٹ اونچا تھا.. اس اونچائی پر صرف ایک شخص کے چڑھنے کی گنجائش تھی.. تو اب تصویر کچھ یوں بنتی تھی کہ عرش پر کچھ پورٹر لیٹے ہوئے ہیں اور ہاتھ نیچے کیے ہوئے ہیں کہ دس بارہ فٹ کا فاصلہ بلکہ بلندی طے کر کے جو کوئی بھی آ سکتا ہے آ جائے ہم اسے دبوچ لیں گے..

میں اس مرگ صفت مقام کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ یہ کیا تھا.. کیسی آزمائش تھی.. نہ کوئی واضح راستہ تھا.. نہ کہیں پاؤں رکھنے کی جگہ تھی.. نوے درجے کے زاویے پر ایک اٹھان تھی جس پر محض پرواز کر کے بلند ہوا جا سکتا تھا.. چڑھا نہیں جا سکتا تھا..

پورٹروں کے متعدد ہاتھ تھامے.. مٹی میں ناک رگڑتے.. اپنا دایاں ہاتھ ہوا میں اور "پکڑ لو.. پکڑ لو" کی فریاد کرتے ہم ایک ایک کر کے اونچے ہوئے اور جانے کس نے کیسے گھسیٹ کر اوپر کھینچ لیا..

یہ ایک نہایت واہیات مقام تھا.. جہاں موت واقع ہو سکتی تھی.. پر نہ ہوئی..

اس عبرت ناک مقام پر ہم کچھ دیر اپنے حواس اور قوت گویائی بحال کرتے رہے.. بہت نیچے رہ گئے پھورا نالے کو دیکھتے رہے.. رکے ہوئے سانس کو قدرے رواں کیا اور جب یہاں سے چلے تو سب کے سب ساتھی خوشحال اور خوش مزاج ہو گئے کہ.. ہم بچ گئے ہیں.. برچ کا ایک اور جنگل ہمارا منتظر تھا..

ایک اور گھنا شجر آور علاقہ سامنے آ گیا اور ہم اس میں داخل ہو گئے.. اور داخل ہوتے ہوئے بھول گئے کہ ہم ابھی ابھی کیسی موت آور بلندی کو چڑھتے تھے کہ یہ جنگل بھی قدرت کے عجائبات سے اٹا پڑا تھا.. ایک مقام پر ایک نہایت خوش نما شکل والا درخت جنگل کی گھاس پر اوندھا پڑا تھا.. اس کی جڑوں نے زمین کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور وہ گھاس کے سبزے پر ایک سفید تصویر کی مانند جڑا ہوا تھا.. سفید ٹہنیاں بل کھاتی الجھتی تھیں اور ہم ان کے درمیان میں سے گزر رہے تھے جب میں نے بے دھیانی میں ایک چھوٹی سی ٹہنی کو توڑ کر اپنے رک سیک میں رکھ لیا..

آج یہ چھوٹی سی ٹہنی.. میری سٹڈی بیورو کے اوپر ایک گلدان میں سجی ہے.. اور میں نے ابھی تک برچ کے جنگلوں کا جو بیان کیا ہے.. جتنی تفصیل اور کیفیت لکھی ہے وہ سب.. کہ میرے پاس نوٹس نہیں ہیں صرف اس ایک ٹہنی کو سامنے رکھ کر لکھی ہے کہ یہ ایک ٹہنی برچ کے تمام جنگلوں کو بیان کرتی ہے.. خود ایک جنگل ہے..

اور ہاں کبھی کبھار جب میں صبح سویرے اپنی پڑھنے کی عینک لینے کے لیے اپنی سٹڈی میں آتا ہوں تو ایک چڑیا اس پر براجمان ہوتی ہے جو مجھے دیکھ کر اڑ جاتی ہے.. وہ بھی شاید اس میں برچ کا پورا جنگل دیکھتی ہے..

ہم اس جنگل کی چھاؤں میں سے باہر آئے تو ایک ایسی کھلی فضا میں آئے جہاں ڈھلوان پر ایک مختصر بستی تھی..

اوپر پتھروں کی چند چار دیواریاں اور جھونپڑے تھے جو برچ کے درختوں کے تھے اور نیچے جہاں ہم نکلے تھے کچھ بچے تھے.. چند نوجوان اور دو بوڑھے تھے..

انہوں نے اول اول ہمیں تشویش سے دیکھا..ہمیں جنگل میں سے برآمد ہوتے دیکھ کر چپ رہے..ہمیں قریب آنے دیا..

ہم نڈھال ہو چکے تھے..اپنے اپنے رک سیک کاندھوں سے اتارے اور گھاس پر ڈھیر ہو گئے..

وہ سب ہمارے قریب ہوئے کہ کیا یہ مر گئے ہیں..

ہم اگرچہ مشقت اور اذیت سے اور موت کے خوف سے مر گئے تھے لیکن مکمل طور پر نہیں مرے تھے..

یہ ایک گوجر بستی تھی..

انہوں نے ہمیں زندہ کرنے کے لیے دہی اور لسی پیش کی اور پھر ہمیں گھیرے میں لے لیا..ہماری پوشاکوں اور رک سیکوں کو ٹٹولنے لگے..ہنستے گئے..آپس میں ہمارے بارے میں..ہماری حالت زار کے بارے میں باتیں کرتے گئے اور ہنستے گئے اور تب بڈھے گوجر کا نزول ہوا..وہ جو اوپر دو چار پتھریلی آماجگاہیں تھیں..جھونپڑے تھے ان میں سے یکدم ظاہر ہوا..اور یکدم نیچے آیا..

وہ اس بستی کا بابا آدم تھا..

یہ جو ہمیں گھیرے میں لیے ہوئے تھے..بچے..نوجوان..دو بوڑھے..سب کے سب اس کی آل اولاد تھے..

چنانچہ جب وہ نیچے آیا..کوہ طور سے اترتے باریش موسیٰ کی مانند نیچے آیا تو وہ سب کے سب چپ ہو گئے..اس کے احترام میں خاموش ہو گئے..

یہ بڈھا اگر لاہور میں ہوتا تو یقیناً "وحشی گوجر" اور "گوجر دا ویر" نامی فلموں کا پروڈیوسر ہوتا..لیکن وہ لاہور میں نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ دوران گفتگو کھلا کہ موصوف زندگی میں صرف ایک بار گلگت گئے ہیں..اور اس سے پرے جو بھی لاہور پشور وغیرہ تھے ان کے بارے میں لاعلم تھے..

انہوں نے بلھے شاہ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے..علموں بس کریں او یار..بس کر دیا تھا..اور یہیں پھورا وادی میں بس کر دیا تھا..

عمران بڑے شوق سے گوجر بابا اور اس کی آل اولاد کے بگ بگ کلوز بناتا رہا..اس کی دلی خواہش تھی کہ وہ اوپر ان پتھریلے جھونپڑوں کی جانب کیمرے کی بوتھی کر کے زوم لینز سے زوم ان کر کے کسی کھڑکی میں سے جھانکتی گوجر حسینہ کا کلوز اپ بنائے..لیکن ایسا نہ ہوا..اگر وہاں کچھ گوجر حسینائیں تھیں تو وہ بڈھے گوجر کے ڈر کے مارے کہیں کونوں کھدروں میں دبکی ہوئی تھیں اور ان کی جرأت نہ تھی کہ وہ کسی کھڑکی میں سے جھانک کر ہم پردیسیوں پر ایک نظر ڈال لیں..چنانچہ عمران کا زوم لینز پتھروں پر زوم ان ہو کر سر ٹکراتا رہا..

اس گوجر گڑھ میں ایک مختصر قیام کے بعد ہم پھر کمر بستہ ہوئے اور برچ کے درختوں کے ایک مختصر ذخیرے میں آ گئے..

یہ برچ کی سفیدی کی آخری جھلک تھی..

''پیاس کے صحرا میں ایک آبشاری شالیمار''

ہم ایک مرتبہ پھر ایک بکری پگڈنڈی پر بکری ہوتے اُترے اور پھورا نالے کے پاس آ گئے.. یہاں اس نالے کے اوپر ایک ایسا شاندار پُل تھا کہ کہیں تھا اور کہیں بالکل نہیں تھا.. برچ کے دو چار شہتیر ..در جن بھر ٹہنیاں جو شائد کسی انسان نے نہیں چند بکریوں نے وہاں رکھ دی تھیں.. یعنی اے مردِ مجاہد جاگ ذرا اب وقتِ شہادت ہے آیا کا بورڈ وہاں نصب ہونا چاہیے تھا.. لیکن مردِ مجاہد کی زندگی میں یہ پہلا وقتِ شہادت تو آیا نہیں تھا جو گھبرا جاتا.. تو بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق.. یعنی ہم پار ہو گئے..

پار ہوئے تو دوسری جانب ذرا ویرانی تھی.. بیابانی تھی.. چٹیل چٹانوں کی خشکی تھی جس پر گھاس اگر کہیں تھی تو بے روح اور جلی ہوئی.. کسی ایک جھاڑی کا نشان بھی نہ ملتا تھا..

ایک مختصر پگڈنڈی اس خشک چٹانی بلندی پر اُٹھتی تھی جس پر ہم کبڑے عاشقوں کی مانند جھکے جھکے اُٹھنے لگے..

جب ہم پوری طرح اُٹھ چکے.. یعنی پھورا نالے سے اُٹھ کر اس ویران بلندی پر پہنچ گئے تو وہاں تیز تپتی سلگتی دھوپ ہماری منتظر تھی..

یہ تیز دھوپ گھات لگائے بیٹھی تھی.. ہمیں بہت دیر سے کھوجتی رہی تھی لیکن ہم برچ کے جنگلوں میں پوشیدہ چلتے تھے اور وہ ہمارا سراغ نہ لگا سکی تھی کہ وہاں کی گھناوٹ میں چھید کر کے ہم تک نہیں پہنچ سکتی تھی.. اور اب جب ہم ایک چٹیل ڈھلوان پر چڑھ کر اوپر ایک پگڈنڈی پر آ گئے تھے تو اس کے گرم جال میں آ گئے تھے..

اُس نے بہت دیر ہمارا انتظار کیا تھا اس لیے غصیلی ہو چکی تھی.. غضب ناک ہو چکی تھی..

وہ ہم پر یوں اُتری کہ ہمارے بدنوں کو جلا کر رکھ دیا..

تاحدِ نظر ایک تنگ وادی چلی جاتی تھی..

نہ کوئی شجر تھا اور نہ کوئی سایہ.. بس دھوپ تھی.. چٹیل بلندی تھی اور نیچے پھورا نالہ تھا جو کہیں نیچے تھا.. گہرائی میں.. کبھی دکھائی دے جاتا اور کبھی ڈھلوان کی اوٹ میں غائب ہو جاتا اور صرف اس کا شور باقی رہ جاتا.. پگڈنڈی پُرخطر نہ تھی.. لیکن احتیاط پھر بھی لازم تھی کہ دائیں جانب جو ڈھلوان تھی اس پر اتفاقاً گرنے سے.. یقیناً پھورا نالے تک گرتے ہی چلا جانا تھا..

بعض مقامات پر وادی تنگ ہو جاتی.. نالے کے پار کی چٹانیں اتنی قریب ہو جاتیں کہ ہم انہیں سنگسار کر سکتے تھے.. ان پر پتھر پھینک سکتے تھے.. وہ اتنی نزدیک آ جاتیں.. اتنی کہ ہمارے اور ان کے درمیان کسی نالے کا وجود ممکن نہ لگتا..

جہاں تک ہم دیکھ سکتے تھے ایک خشک اور ویران گھاؤ نظر آتا تھا جس کے ایک جانب خشک چٹانوں میں ایک پگڈنڈی بل کھاتی کبھی نہ ختم ہونے والی بے جان کیفیت میں چلی جا رہی تھی..

کبھی اس یکسانیت میں کوئی سخت مقام بھی آ جاتا.. پگڈنڈی غائب ہو جاتی اور اس کی بجائے گہرائیوں پر ایک گیلری معلق ہوتی.. چند ٹہنیاں.. کچھ پتھر.. اور ہم سانس روکے کچھ نہ کچھ پڑھتے سانس روکے اس پر سے پھونک پھونک کر قدم رکھتے گزر جاتے.. اور پھونک بھی آہستہ سے مارتے کہ کہیں وہ گیلری ہل نہ جائے..

جہاں ہم وادی کا اختتام دیکھتے وہاں مارو مار کر کے بھوکے پیاسے پہنچتے تو ایک اور ویران وادی سامنے آ جاتی جس پر وہی لامتناہی پگڈنڈی بے تھکان بل کھاتی چلی جاتی..

اگرچہ یہ ایک پہاڑی سفر تھا لیکن یہاں ایک صحرا کی مسافت ایسی پیاس تھی..

ہماری فلاسکس میں جتنا پانی تھا وہ ہم پی چکے تھے..

سورج سوا نیزے سے بھی نیچے ہو کر تقریباً آدھے نیزے تک آ گیا تھا اور ہم سے برچ کے جنگلوں میں پوشیدگی کا بدلہ لے رہا تھا..

گدا اور گرد آمیز کا فرق ہم سے الگ ہو کر آگے چلا گیا تھا اور اب نظروں سے روپوش ہو چکا تھا.. صرف ہم قدیمی تھے جو ایک دوسرے کا ساتھ دے رہے تھے..

عجیب لایعنی اور پُرآزار گرم مسافت تھی.. نہ آس پاس کوئی منظر تھا اور نہ کسی ہریاول کا کوئی شائبہ یا نشان.. ہم اس تنگ وادی میں قید تھے اور دھوپ کا کڑا پہرہ تھا.. ہم پیاس اور پسینے

سے نچڑتے تھے..

خیال تھا کہ کہیں پیٹ پُوجا کے لیے رُکیں گے.. لیکن آج تو صرف مشقت.. تھکاوٹ اور پیاس کی پوجا کا دن تھا..

دوپہر ڈھلنے لگی.. لیکن یاد رہے کہ صرف دوپہر.. سورج نہیں.. وہ بدستور آدھے نیزے پر تھا.. اُس کی تمازت اور کرنوں کی آتش نہیں ڈھلی تھی.. کبھی کوئی ایسا موڑ آتا جب ہم پل بھر کے لیے سائے میں چلے جاتے تو وہاں اپنے رُک سیک اتار کر گرم چٹانوں کے ساتھ ٹیک لگا کر ہانپنے لگتے..

ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ اس تنگ وادی کا کوئی اخیر نہیں.. کوئی انجام نہیں.. ہم چلتے ہی رہیں گے اور یہ یونہی ہمیں ایک لامتناہی بل کھاتی پگڈنڈی دکھاتی.. جو کہ ایک آتش برساتے سورج کی ہمسائیگی میں ہے.. بس جاری رہے گی.. یہ دیوارِ چین کے پار ہو جائے گی.. اہرامِ مصر، تاج محل اور مسجد قرطبہ کو دائیں بائیں چھوڑتی دنیا کے.. یا شائد کائنات کے کسی ایسے کنارے پر جا پہنچے گی جہاں سے ہم ایک قدم آگے اٹھائیں گے تو خلاء میں گر جائیں گے..

کوہ نوردوں کے لیے اگرچہ انعام بھی بہت ہیں لیکن سزائیں کہیں زیادہ ہیں..

ایک یونانی فلسفی کا کہنا ہے کہ آپ کو زندگی میں جتنی بھی مسرت حاصل ہوتی ہے آپ کو اس کے عوض اتنی ہی اذیت بھی ملتی ہے.. شائد ہمیں علتر جھیلوں.. لوز شاہی.. برف کے کنویں اور برچ کے جنگلوں کی قیمت ادا کرنی پڑ رہی تھی..

اور جب ہم گرمیوں کی آگ برساتی.. کڑکتی اور لُو تپتی دوپہروں میں گاؤں کی سنسان گلیوں میں کسی گندی نالی میں لوٹ کر بدن کو اس کی غلاظت میں بھگو کر تھوڑی سی آسودگی حاصل کرنے کی خواہش کرنے والے کُتّے کی مانند زبانیں لٹکائے چلتے تھے تو ایک موڑ پر مڑتے ہی چٹانوں کے خشک گھاؤ میں سے ایک آبشار اُتر رہی تھی..

اس کے نیلگوں پانی ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک ہوئے لیکن ہم بے یقین بھی ہوئے کہ پیاس کے اس صحرا میں یہ کیسے ممکن ہے.. سراب ہو گا..

اور وہ آبشار ایک آبی شالیمار کی مانند چٹانوں سے تختہ بہ تختہ اُتر رہی تھی.. اوپر سے گرتی آتی ہے تو چٹانوں میں ایک تالاب بناتی ہے.. اور پھر اُس تالاب میں سے رُکے شفاف سرد پانی چھلکتے ہیں تو ایک دھارے کی صورت چٹانوں کی کوکھ کو بھرتے.. انہیں لبریز کر کے پھر نیچے آتے

ہیں.. ہماری پگڈنڈی کے قریب ہو کر فردوس بہ روئے زمیں ہو کر ایک اور تالاب میں اُترتے ہیں.. اور پھر اُسے لبالب بھر کر پگڈنڈی پر سے ایک سیلاب کی طرح رواں ہو کر کہیں نیچے گر جاتے ہیں..

ہم اس آبشار کے وعدے پر اگر جیے تو یہ جان جھوٹ جانا.. کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا..

ہم نے اُس کے قریب پہنچ کر بے اختیاری میں اپنے رُک سیک اتار پھینکے.. سجدہ ریز ہوئے اور اس کے سرد پانیوں میں ناکیں ڈبو کر کہ بے شک ہم بھی ڈوب جاتے.. اس کے پانی پیتے رہے تا آنکہ اس کی آبی خنکی سے ہمارے پیٹ مشکیزے جو پیاس سے پچک چکے تھے.. پھول گئے اور ان میں گنجائش باقی نہ رہی اور وہ چھلکنے کو آئے.. تب ہم نے مجبوراً اپنی ناکیں اٹھائیں.. پھر ہم نے بیتابی سے اپنے کپڑے اُتارے اور ایسے اُتارے جیسے "جلتا ہے بدن" گاتے ہوئے فلم کی ہیروئن اُتارتی ہے.. اور اگر کسی نے انڈرویئر پہن رکھا ہے تو خیر ہے نہیں پہن رکھا تو بھی خیر ہے ہم اس کے پہلے تالاب میں کود کر رنگ رلیاں منانے لگے.. کبھی شفاف اور نیلے پانیوں میں اوندھے ہو جاتے کبھی چھینٹے اُڑانے لگتے اور کبھی پتھروں میں سے نیچے گرتے پانی کے نیچے بیٹھ جاتے.. کبھی ایک مختصر آبشار تلے نہاتے اور کبھی دوسری آبشار تلے سانس روک کر بیٹھ جاتے..

میاں صاحب چونکہ سنگل پسلی کے ہیں.. پھرتیلے ہیں اس لیے وہ کدکڑے مارتے ہوئے پتھروں پر چڑھتے ذرا بلندی پر جو تالاب تخلیق ہو رہا تھا اس میں جا کر اشنان کرنے لگے.. کوشش تو میں نے بھی کی کہ اس آبی شالیمار کے دوسرے تختے تک پہنچ کر فرزند کے ساتھ ڈبکیاں لگاؤں لیکن میرا وجود بھاری اور ناہنجار تھا.. خدشہ تھا کہ میں اوپر جاتے ہوئے پانی میں بھیگے ہوئے پتھروں پر پھسل نہ جاؤں اس لیے میں نے پگڈنڈی کے برابر میں پہلے والے تالاب کو ہی غنیمت جانا اور اوپر سے چھینٹے اُڑاتے آتے پانیوں کی برفیلی آغوش میں سرد وصال کے مزے لوٹتا رہا.. جب کچھ زیادہ ہی مزے لوٹے گئے تو ہمارے بدن نیلے پڑنے لگے.. چھینکیں آنے لگیں.. ہم بے اختیار کپکپانے لگے.. ٹھٹھرنے لگے.. ہماری بتیسیاں بجنے لگیں.. ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم سن سٹروک سے ہلاک ہونے ہونے کو تھے اور اب نمونیے سے انتقال کر جانے کا خدشہ پیدا ہو گیا.. چنانچہ ہم نہ چاہتے ہوئے بھی آبشار سے الگ ہوئے.. ٹھٹھرتے ہوئے کپڑے پہنے.. رُک سیک اٹھائے اور پھر سے چلنے لگے..

''وادیٔ اشکومن میں اُترتے ہیں.. اور سفر تمام کرتے ہیں''

پھر سے چلنے لگے تو تنگ وادی نے پھر سے اپنے آپ کو ایکشن ری پلے کی صورت میں دوہرایا اور لامتناہی ہو گئی.. کوئی انجام نہ تھا.. مشقت پھر سے شروع ہو گئی..

ہاں کچھ دیر کے لیے ہم ان بلند اور خشک چٹانوں سے اُتر کر نیچے آئے تو ہمیں نالے کے پار ایک گاؤں نظر آیا.. ہریاول کا ایک ایسا جنت نظیر ٹکڑا نظر آیا کہ اسے دیکھتے ہوئے آنکھیں ہری ہو جاتی تھیں.. بدن کے در و دیوار پر سبزہ اُگنے لگتا تھا.. اسے گاؤں تو میں نے یونہی کہہ دیا کہ وہاں گھر نہ تھے.. بس سبز چارے کے کھیت تھے اور کہیں ایک آدھ جھونپڑا تھا اور خشک چارے کے ڈھیر تھے..

یہ ''اُتر'' تھا.. کھوار زبان میں ''چشمہ''..

شاید اس پر سایہ فگن چٹانوں میں سے کوئی بڑا چشمہ نکلتا تھا اور نیچے آ کر اس کے کھیتوں اور کھلیانوں کو سیراب کرتا تھا..

یہ علاقہ ہریاول کا ایک سمندر تھا جو ارد گرد کی خشک چٹانوں کے بیچ ایک نیلم کی مانند دمکتا تھا..

اگرچہ ہم ابھی ابھی نہائے تھے.. سردی نے بدن نیلے کر دیے تھے لیکن یہاں تک آتے آتے حالات پھر سے دگرگوں ہو گئے تھے.. ہم نے جیسے کبھی کسی آبشار میں اپنے آپ کو بھگویا ہی نہ ہو ایسے خشک اور پیاسے ہو گئے تھے اور ہمارا جی چاہتا تھا کہ نالے کے اوپر کمندیں ڈال کر اس ہرے بھرے نگر کی آغوش میں پہنچ جائیں..

نہ صرف یہ کہ وہاں کوئی گھر نہ تھا بلکہ کوئی ذی روح بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا.. وہاں کوئی بھی نہ تھا.. اشکومن پہنچنے پر ہمیں بتایا گیا کہ لوگ یہاں سے اوپر ''چشمہ'' کو جاتے ہیں اور چارہ

کاشت کر کے پھر نیچے آ جاتے ہیں وہاں قیام نہیں کرتے..

اس ہرے بھرے نظارے سے ہم آگے چلے گئے.. وہ پیچھے رہ گیا اور پھر سے ویرانی اور خشکی کی کائنات شروع ہو گئی..

سورج کی حدت قدرے کم ہوئی کہ دوپہر ڈھلتی جا رہی تھی لیکن پکھورا کا کوئی نشان نظر نہ آتا تھا.. درّہ تھا وادی پہلے سے بھی تنگ ہونے لگی.. بکریوں کے اس راستے پر چلتے چلتے ہم بکری ہو گئے.. نہایت ہی لعنتی راستہ تھا..

جب ہماری جان بدن سے رخصتی چاہ رہی تھی اور ہماری نظر میں فرق آنے لگا تھا.. ایک کی بجائے تین تین پتھر نظر آنے لگے.. پکھورا نالے کے پانی دھندلانے لگے تو پگڈنڈی یکدم نیچے ہونے لگی اور نالے کے کنارے پر پہنچ گئی.. بے حد شور تھا.. ہم بات نہیں کر سکتے تھے.. ظاہر ہے اگر پگڈنڈی نیچے اُتری تھی تو بلاوجہ نہیں اُتری تھی اس نے ہمیں نالے کے پار لے جانا تھا.. سو ہم چلے گئے.. پانیوں میں سے گزر کر نہیں بلکہ ایک پل پر سے گرتے پڑتے گزر گئے.. دوسری جانب یہی پگڈنڈی پھر سے اوپر ہوئی لیکن اس نے مہربانی کی کہ زیادہ اوپر نہیں ہوئی.. نالے کی قربت میں ہی رہی..

شام ہونے کو تھی اور شور تھا..

ہم نے کسی گائیڈ بک میں پڑھا تھا کہ اس پل کے پار پکھورا آ جاتا ہے..

ہم چلتے گئے.. لیکن پکھورا نے آنا نہ چاہا..

ہمارے گھٹنے آپس میں بجنے لگے.. ہم گرنے لگے.. گرنے لگتے تو پتھروں پر ہاتھ رکھ کر اپنے آپ کو سنبھالتے.. ہتھیلیاں بھی چھل گئیں.. ہماری نظر میں کچھ زیادہ ہی فرق آنے لگا.. کبھی دھند چھا جاتی اور کبھی اس میں آبشاریں گرنے لگتیں اور کبھی پیاس کے صحرا پھیل جاتے.. ہمارا جی چاہا کہ ہم سفر ترک کر دیں اور قہقہے لگانے لگیں.. تب ہمیں اس دھند میں.. وادی کے آخر میں ہریاول کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نظر آیا.. قریب ہوتے گئے تو وہ پاپلر کے چند درخت ہوتے گئے.. اور قریب ہوئے تو وہ تیز ہوا سے جھول رہے تھے.. یہ تیز ہوا ہم ساتھ لے کر آئے تھے.. یہ طلتر درّے سے پکھورا کے نالے کے اوپر تنگ وادی میں تیز ہوتی شرلاتے بھرتی آتی تھی اور وادی کے اختتام پر اپنے راستے میں ان درختوں کو پا کر غضب ناک ہوتی اُن کے بدن دوہرے کرتی تھی..

پکھورا کا پہلا گھر آ گیا..

اب پکھورا نالہ ذرا پرے بہتا تھا اور ہم انسانی ہاتھوں کی بنائی ہوئی ایک برفانی پانیوں

والی قل یا چھوٹی سی نہر کے کنارے چلتے تھے.. چلتے تھے یا اپنے آپ کو پاجیوں کی مانند گھسیٹتے تھے..

قل میں سے ریت نکالنے والے چند مقامی افراد نے ہمیں اپنی جانب آتے دیکھا تو اُن کے سپید چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی کہ اچھا یہ بے وقوف وزہ غلتر کو عبور کر کے ادھر آتے ہیں اور پریشان حالوں میں ہیں.. انہیں کس حکیم نے کہا تھا کہ یہ حماقت کریں.. ہمیں اُن کی یہ مسکراہٹ زہر لگی اور ہم نے ان سے کلام تک نہ کیا..

پگڈنڈی جس پر ہم چلتے تھے پہلے آزاد تھی اب آہستہ آہستہ قید ہونے لگی.. اس کے دونوں جانب گھروں اور کھیتوں کی دیواریں اُبھرنے لگیں.. کھیت میں کھڑا ایک نوجوان ہمیں دیکھ کر کدال اٹھائے راستے پر آ کھڑا ہوا جیسے روکنے کے لیے آیا ہو.. اُس کا منہ کھلا تھا اور چہرہ فاترالعقل لوگوں کی مخصوص ڈھیلی بناوٹ لیے ہوا تھا.. ہنستا ہوا.. وہ ہمیں دیکھ کر اور زیادہ ہنسا کہ مجھے تو ربّ نے اسی طور تخلیق کیا تھا اس میں مرا تو کوئی دوش نہیں لیکن تم جو ہو.. سمجھ بوجھ رکھتے ہوئے بھی ان راستوں پر آئے ہو تو ہم میں سے پاگل کون ہوا..

اس نوجوان سے ہم نے مختصر ڈائیلاگ کیے اور آگے بڑھ گئے..

دائیں جانب ایک قبرستان کے آثار تھے..

آثار اس لیے کہ ان بلند وادیوں میں باقاعدہ قبریں نہیں ہوتیں.. بنائی باقاعدہ جاتی ہیں لیکن برفباری اور بارشوں سے ان کے ڈھیر ڈھے جاتے ہیں اور بس کتبے رہ جاتے ہیں.. یہ پتہ نہیں چلتا کہ کونسا کتبہ کس قبر پر تھا.. تارڑ کا کتبہ شیخ صاحب کی قبر کے سرہانے اوندھا پڑا ہے اور شیخ صاحب پتہ نہیں کہاں پڑے ہیں.. اکثر قبریں گڑھوں میں بدل جاتی ہیں کبھی شیخ صاحب کی ہڈیاں بھی دکھائی دینے لگتی ہیں..

ہمیں بتایا گیا تھا کہ پھورا کی کیمپنگ سائٹ کو اسی قبرستان سے راستہ ہو کر جاتا ہے.. چنانچہ ہم اہلِ قبور سے معذرت کرتے ان کے لیے فاتحہ پڑھتے ان کے کتبوں کو پاؤں تلے آنے سے بچاتے اس قبرستان میں سے گزرے اور چند کھیتوں اور گھروں اور دیواروں کے بعد پھورا کی خیمہ گاہ میں پہنچ گئے.. کچی چاردیواری میں گھرا ایک چھوٹا سا میدان تھا جس کے ایک کونے میں چند درخت تھے..

پورٹر پہنچ چکے تھے..

گدا اور گرد آمیز بھی پہنچ چکے تھے اور اطمینان سے تاش کھیل رہے تھے.. اخروٹ کے درخت تلے ہمارا سامان اور خیمے جوں کے توں پڑے تھے..

"ابراہیم" میں نے اپنے واحد مونس و غم خوار کو پکارا "ابھی تک خیمے کیوں نہیں لگائے؟"

"گدا صاحب کہتے تھے کہ تارڑ صاحب آئیں گے تو خود لگوائیں گے"

"کھانے کا کیا بندوبست ہے؟"

"گدا صاحب کہتے تھے کہ تارڑ صاحب آئیں گے تو بتائیں گے ابھی ہم تاش کھیلتے ہیں ہمارے لیے چائے بناؤ.."

میں گھاس پر گرا اور بے سدھ ہو گیا..

کوہ نوردی کا اَن لکھا دستور ہے کہ جب کوئی ساتھی سب سے پہلے منزل پر پہنچتا ہے تو فوری طور پر خیمے نصب کرواتا ہے.. خوراک کی تیاری میں مشغول ہو جاتا ہے تا کہ بعد میں آنے والے ساتھی جو تھکن سے چور آئیں گے خیموں میں آرام کر سکیں اور پھر ان کے لیے خوراک تیار ہو.. شہرت ایک لعنتی شے ہے.. آپ اپنے ہم خیال اور مشترکہ دلچسپی رکھنے والے لوگوں سے دوستی کر لیتے ہیں.. پہلے پہل وہ آپ کی قربت پر فخر کرتے ہیں اور پھر ایک ایسا وقت آتا ہے کہ وہ آپ کو ناپسند کرنے لگتے ہیں کہ یہ شخص تو ہم جیسا ہے.. اس میں کوئی خاص خوبی تو نہیں تو اسے ہر جگہ اولیت اور توقیر کیوں دی جاتی ہے.. وہ آپ کے حوالے سے نامور ہو جاتے ہیں کہ آپ دوستی میں ان کی بے جا توصیف کرتے ہیں اور پھر وہ آپ کو ناپسند کرنے لگتے ہیں..

صرف میں ہی نہیں.. سلیم.. میاں.. حسن اور شاہد بھی اس خبر سے بے سدھ گرے کہ نہ خیمے نصب ہیں اور نہ چولہا گرم ہوا ہے اور اخروٹ کے ایک گھنے شجر کے نیچے بے سدھ گرے.. یہ صرف عمران.. کاظمی اور طاہر تھے جو ابھی تک مکمل طور پر چاق و چوبند اور پھرتیلے تھے اور ایک مرتبہ پھر بندر ہو چکے تھے..

عمران نے میرے عالم بے سُدھی میں خلل ڈالا اور نیکر نٹول کر بولا "سر آپ تو جُوں کی ٹُور تُرتے ہیں.. ٹھیک ہے عمر کا تقاضہ جو ہوا.. ہم لوگ تو دو گھنٹے پہلے پہنچ گئے تھے"

"تو مجھ پر احسان کیا ہے.." میں نے غضب ناک ہو کر کہا.. "میں پہنچ تو گیا ہوں ناں.. تم میری عمر کے ہو گے ناں تو کہیں بھی نہیں پہنچو گے.. زیادہ سے زیادہ تمہاری خاک پہنچے گی جہاں کا خمیر تھا.. نہیں سمجھے؟"

"نہیں" اس نے داڑھی کھجلا کر کہا "لیکن سر کیا گاؤں ہے یہ پھورا کا اور کیا وادی ہے اشکومن کی.. ہم نے آپ کی آمد سے پہلے کچھ چہرے.. کچھ گھر اور کچھ کھیت شوٹ کیے ہیں.. سر اس

وادی میں بھی ایک گھر ہونا چاہیے..کیا خیال ہے؟''

''نیک خیال ہے..میں یہاں پہلی بار نہیں آیا'' میں اپنے عالم بے سُدھی میں سے اٹھا'' میں چند برس پیشتر اس گاؤں سے گزر کر آگے اسّت تک گیا تھا..اور وہاں سے ''یاک سرائے'' کے ٹریک کا آغاز کیا تھا..یہ جو گاؤں کے پار ایک وسیع پھیلاؤ والا دریا ہے یہ اشکومن ہے اور اس کے پار جو بلند درّے ہیں وہ وادی یاسین میں اترتے ہیں..کچھ کوہ نورد طلتر ٹریک مکمل کر کے اس دریا کے پار اترتے ہیں اور پھر ان بلند درّوں کو عبور کر کے وادی یاسین میں جا نکلتے ہیں۔''

''تو کل صبح چلتے ہیں ناں سر''..کاظمی نے دانت نکال دیے..

''ہاں جی ہاں جی..طاہر نے الف لیلیٰ کے ایک ناکام جن کی مانند سر ہلایا تو اس کے کانوں کی بالیاں بھی ہلنے لگیں..

''مجھے کوئی اعتراض نہیں..''عمران بولا..

مجال ہے جوان تینوں پر اس مسافت کا کوئی اثر ہوا ہو..شاید وہ ہم سے جدا کوئی اور نسل تھے..انسان نہ تھے..بندر سے تھے..ان پر تھکاوٹ اور پہاڑی مشقت اثر نہ کرتی تھی..

''نہیں..کل صبح جیپیں ہمیں لینے کے لیے آ جائیں گی..ہم گلگت جائیں گے اور وہاں سے سیدھے رُکے بغیر لاہور جائیں گے..ہم انسان ہیں تمہاری طرح بندر نہیں ہیں..نہیں سمجھے؟''

''سمجھ گیا سر..تو پھر یہ فیصلہ ہو گیا ہے کہ ٹریک کا اختتام ہو گیا ہے..تو اس صورت میں اس ڈاکومنٹری کے آخری منظر کے لیے آپ ذرا میرے ساتھ آ جائیں..''

''کہاں؟''

''قبرستان میں..''

''قبرستان میں تو کندھوں پر اُٹھا کر لے جایا جاتا ہے..میں خود بخود چلتا ہوا کیسے چلا جاؤں؟''

''ویسے تو ہم تینوں آپ کو کندھوں پر اٹھا کر بھی لے جا سکتے ہیں لیکن سر مذاق الگ..میں چاہتا ہوں کہ..''

''نہ تم چاہنے والے کون ہوتے ہو..''

''میں آپ کا ہدایت کار ہوتا ہوں سر..اتنے دنوں سے مکمل تعاون کرتے رہے ہیں تو آخری شاٹ کے لیے بھی تعاون کر لیجیے..میں چاہتا ہوں کہ آپ ٹریک کے اختتام پر ایک قبرستان

میں گلے میں مائک ڈالے کسی بے نام قبر کے کتبے کو تھامے ہوئے..یعنی کسی اور قبر کے کتبے کو تھامے ہوئے کیمرے سے مخاطب ہو کر کہیں..خواتین و حضرات میں کتنا خوش بخت ہوں کہ اس خوفناک اور حیرت ناک مہم سے زندہ بچ کر آ گیا ہوں..پھسو را پہنچ گیا ہوں، نہ پہنچتا تو اسی قبرستان میں ہوتا..شائد اس کتبے پر میرا نام ہوتا..چلیں؟''

میں اپنے آپ پر جبر کر کے زبردستی اس بے سدھ کیفیت میں سے اٹھا اور عمران اور اس کے بغل بچوں کے ہمراہ اس قبرستان میں چلا گیا..مائک گلے میں ڈالا اور اپنی بڑھی ہوئی داڑھی اور سرخ آنکھوں سے کیمرے کو گھورتا اداکاری کرنے لگا'' خواتین و حضرات اگرچہ میری مسرت کا کوئی ٹھکانہ نہیں کہ میں طلتر پھسو را مہم کے آخر تک بخیر و عافیت پہنچ گیا ہوں لیکن یہ کتبہ جو میں نے تھاما ہوا ہے اس پر میرے نام کا امکان بہت کم کم تھا..اگر میری قسمت میں ایک گمنام قبر میں ہونا ہوتا..تو یہاں نہ ہوتا..براللدو..بیافو یا ہسپر کی کسی بھی دراڑ میں ہونا ہوتا..میں سنو لیک یا درّہ ہسپر..چٹی بوئی یا درّہ درکوت میں دفن ہوتا..یہاں نہ ہوتا..اس لیے کہ یہ ٹریک ان کی نسبت محض بچوں کا کھیل تھا..اگرچہ بچوں کے کھیل میں بھی کبھی جان چلی جاتی ہے..تھینک یو''

''سر جی'' عمران کیمرے میں سے سر نکال کر دھاڑا'' سچ نہ بولیں..جھوٹ کی انتہا کر دیں..ڈرامہ کریں..کوئی ہولناک بات کریں..کوئی ایسی بات کریں کہ دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں..''

''سوری..'' میں نے معذرت کی..یعنی لوگ عشق کی انتہا چاہتے ہیں اور تم جھوٹ اور ڈرامے کی انتہا چاہتے ہو تو عمران مجھ سے بہتر تم اور کسی کو نہ پاؤ گے..شاٹ دوبارہ کرو''

اوکے..'' عمران نے کیمرے میں سر گھسا کر مجھے اشارہ کیا'' کیو..''

''خواتین و حضرات..'' میں ایک نہایت المناک شکل بنائے شروع ہو گیا'' میں اس انتہائی خوفناک مہم سے زندہ بچ کر بالآخر پھسو را کے گاؤں میں پہنچ گیا ہوں جہاں کل صبح دو جیپیں آئیں گی اور مجھے اور میرے ساتھیوں کو گلگت لے جائیں گی..ان جیپوں کی بجائے کل ایک تابوت بھی آ سکتا تھا..میرے سائز کا..کہ یہ ایسا..دنیا کا خطرناک ترین ٹریک ہے کہ بہت کم لوگ زندہ بچ کر آتے ہیں..میں نے خود اپنی آنکھوں سے راستے میں جگہ جگہ مُردہ کوہ نوردوں کے ڈھانچے دیکھے ہیں..اب اسی قبرستان کو دیکھیے جس میں مَیں کھڑا ہوں اس میں بیشتر قبریں ان کوہ نوردوں کی ہیں جو اس ٹریک کے دوران ہلاک ہو گئے..وہ میری طرح خوش قسمت نہیں تھے..یہیں کہیں میری

قبر کا کتبہ بھی اوندھا پڑا ہوتا اور اس پر میرا نام لکھا ہوتا.. اگرچہ اشکومن کے کتبہ نویسوں کو میرا نام لکھنے میں بے حد دشواری ہوتی' لیکن کتبوں پر درج ناموں کے ہجے کون چیک کرتا ہے.. مستنصر کو ''س'' سے لکھا جاتا یا ''ص'' سے تو کون چیک کرتا ہے.. یعنی اگر قسمت یاوری نہ کرتی میں بھی ان بے نام قبروں میں سے ایک ہوتا.. اور بے نام قبروں پر کوئی دیا جلانے بھی نہیں آتا.. آپ بھی نہ آئیے گا.. وادی اشکومن بہت دور ہے.. خدا حافظ!''

''واہ سر جی واہ.. آپ نے تو کمال کر دیا.. آج اخیر کر دی.. یہ ڈاکومنٹری ہٹ ہے سر'' عمران اینڈ کمپنی نے کیمرہ آف کیا اپنا ساز و سامان سمیٹا اور پھوراگاؤں کو شوٹ کرنے کی خاطر قبرستان سے اتر کر میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئے.. اب میں ان کے لیے بیکار ہو چکا تھا.. وہ پروفیشنل لوگ تھے مجھے استعمال کرنے کے بعد وہ مجھے یکسر ترک کر گئے.. گویا کوڑے کے ایک ڈھیر پر پھینک گئے..

اب میں آپ سے.. اس قبرستان کی تنہائی میں صرف آپ سے.. اپنے پڑھنے والوں سے مخاطب ہوتا ہوں کہ آپ مجھے کبھی ترک نہیں کرتے'' خواتین و حضرات.. اگرچہ اس سفرنامے کے آغاز میں میں نے اقرار کیا تھا کہ یہ سفر اس لائق نہیں کہ اسے بیان کیا جانا چاہیے.. البتہ اس کے کچھ کردار ایسے ہیں جو اس لائق ہیں یا نالائق ہیں کہ انہیں بیان کیا جانا چاہیے.. لیکن اب اس کوہ نوردی کے اختتام پر مجھے یہ اقرار کرنا ہے کہ اگر دنیا بھر کی جھیلوں میں سے سب سے آئینہ دار اور رنگ ریز علتر جھیلوں کو بیان نہ کرتا.. سر شام لوئر شاہی کی ڈھلوانوں پر سے اترتے یاک قافلوں کی سموں سے اٹھنے والی دھول اور دھمک کو تحریر میں نہ لاتا.. تین سروں والی شاہی پیک میں سے گرتے برف کے آبشار ایولانچ کو قلم بند نہ کرتا.. کوہ قاف کے اس ہرے بھرے بلند برفانی تخت کا تذکرہ نہ کرتا جس میں یاک اور گھوڑے کھلونے تھے.. کہیں بلند پہاڑوں میں رسول حمزہ توف کی نظم ''اے عورت'' نہ پڑھتا.. برف کے کنویں میں گرتی اس آبشار میں ایک حنوط شدہ چہرے سے نہ جھانکتا جب کہ میرے جوگرز میں میری جان تھی اور انہیں ابراہیم نے جکڑ رکھا تھا.. برچ کے سفید جنگلوں میں چھید کرتی سورج کی اولین شعاعوں کو دھند میں نقب لگاتے نہ بیان کرتا.. ایک آبی شالیمار میں بدن ڈبونے کی کیفیت.. نہ تحریر کرتا.. تو کتنا بڑا گناہ کرتا.. سوہنے رب نے جو کچھ بنایا ہے اسے دیکھنا اور پھر بیان نہ کرنا کتنا بڑا گناہ ہے.. تو میں نے بیان کر دیا تو کیا برا کیا؟.....

دوسرا سفر

''چٹان پر ایک لڑکی.. کچھ نہ بن سکو تو گھاس بن جاؤ''

چٹان پر ایک لڑکی...
چٹان بلند ہوتی جا رہی ہے اور جب چوٹی تک پہنچتی ہے تو وہاں ایک لڑکی...
چٹان کی چوٹی پر ایک لڑکی... براجمان!
اور چٹان حرکت کرتی جاتی تھی اور اس کے ساتھ لڑکی جو اس کی چوٹی پر براجمان تھی، وہ بھی حرکت کرتی جاتی تھی.. بہت تیزی سے.. جیسے میں ایک تیز رفتار ہیلی کاپٹر میں بیٹھا اس کے قریب سے گزر رہا ہوں...
چٹان پر اطمینان سے بیٹھی لڑکی سرخ لباس میں تھی۔
وہ ایک جل پری کی مانند چوٹی پر ٹانگیں سمیٹے بیٹھی تھی..
ایک سرخ جل پری بھوری چٹان کی بلندی پر ٹانگیں سمیٹے بیٹھی تھی اور وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ تو سامنے اُفق کے پار تک تھی نیچے نہیں دیکھتی تھی اور اگر وہ نیچے نگاہ کرتی تو دیکھتی کہ ڈوبتے سورج کی زردی میں نہائی ایک جیپ ہے جو دھول اُڑاتی ہوشے جانے والے کچے راستے پر چلی جاتی ہے اور اس کے پچھلے حصے میں رک سیک اور چند کوہ نورد ٹھنسے پڑے ہیں.. پیک ہو چکے ہیں اور وہ ہوشے کے اوپر سایہ فگن مشابرم کو تکتے ہیں اور اس کے دامن سے آنے والی سرد ہوا کو اپنے رخساروں پر محسوس کرتے مسکراتے ہیں کہ وہ نیچے سے..... پنجاب کے میدانوں سے اوپر آئے ہیں اور ابھی تک اُن کے چہروں میں سے پنجاب کی گرمی پھوٹتی ہے۔ اور جیپ کی اگلی نشست پر ایک موٹے ڈرائیور کے برابر میں ایک بھوری آنکھوں والا شخص حیرت کی کیفیت میں گرفتار منہ اٹھائے اُسے تک رہا ہے اور اس کی بھوری آنکھوں میں بھی ایک حرکت کرتی ہوئی بلند چٹان ہے جس پر

ایک سرخ لباس میں، ٹانگیں سمیٹے بیٹھی لڑکی ہے جو گزرتی جاتی ہے..

اگر وہ نیچے نگاہ کرتی تو یہی دیکھتی..

یہ پل دو پل کا منظر تھا لیکن اُس پر ابدیت نے مُہر لگا دی تھی...

چٹان پر بیٹھی سُرخ لباس والی لڑکی بھوری آنکھوں میں ثبت ہو گئی تھی..

جیسے ٹکسال میں ایک سکّے پر کسی سکندر، کسی اشوک یا کسی شاہ جہان کی شبیہہ ثبت ہو جاتی ہے..اور وہ سکّہ سینکڑوں یا ہزاروں برس بعد جب کسی کھنڈر میں سے برآمد ہوتا ہے تو متروک ہو چکا ہوتا ہے لیکن..اُس پر ثبت شبیہہ قائم ہوتی ہے..

یوں اُس شخص کی بھوری آنکھیں بھی ایک ایسا سکّہ تھیں جو لمحہ موجود میں تو دیکھ سکتی تھیں، رائج تھیں اور اُن پر چٹان کی چوٹی پر براجمان سرخ لباس والی لڑکی ٹانگیں سمیٹے بیٹھی ثبت ہو چکی تھی ایسے کہ کل کلاں جب یہ آنکھیں متروک ہو چکی ہوں گی..خاک در خاک ہو چکی ہوں گی تو بھی اُس خاک میں سرخ پیراہن میں ملبوس چٹان پر بیٹھی ایک لڑکی کی شبیہہ محفوظ ہو گی...

میں جیپ کی ونڈ شیلڈ پر نظریں جمائے ہوشے جانے والے کچّے راستے کی خطرناکی سے آنکھیں چراتے سامنے مشابرم کی چوٹی کو تک رہا تھا جو شام میں جا رہی تھی اور میرے دل میں وسوسے تھے..کہیں ہوشے کے راستے میں ہی رات نہ ہو جائے..اگر رات ہو گئی تو خیمے کیسے اور کہاں نصب کریں گے..بدن میں کلبلاتی بھوک کا مداوا کرنے کے لیے چولہا کیسے روشن کریں گے...جب میں نے جیپ کی کھڑکی میں فریم ہوتے اُس میں سے تیزی سے گزرتے منظر کی جانب نگاہ کی..

اور اُس لمحے ایک ویرانے میں خشک اور چٹانی ویرانے میں چٹانوں کی اوٹ میں اُن درجنوں گھروں کو دیکھا جو شاید ان چٹانوں کی کوکھ میں سے جنم لے رہے تھے..درجنوں کھڑی نما صرف انسانی ہاتھوں کی مدد سے تعمیر کردہ گھر جو کاندے کے سیلاب میں بے گھر ہو جانے والے لوگوں نے یہاں آ بنائے تھے...یہاں کینداس تھنگ نامی ایسے مقام پر جہاں پانی کی ایک بوند نہ تھی..کاندے میں پانی نے اُن کو بہا دیا تھا اور یہاں کینداس تھنگ میں کربلا تھی..پانی کا ایک گھونٹ نہ تھا...

اسی لیے ہماری جیپ کے پچھلے حصے میں میرے ساتھیوں کو بے آرام کرتے پانی سے بھرے تین پلاسٹک کین تھے جو ہم کاندے کے فرات سے بھر کر اُن کے لیے لائے تھے..

اور پھر اگلے لمحے جیپ کی کھڑکی میں سے ایک چٹان بلند ہونے لگی..وہ گزرتی جاتی تھی۔ اسی رفتار سے جس رفتار سے ہماری جیپ جاتی تھی اور اس کی چوٹی پر یہ لڑکی بیٹھی تھی..چٹان کے پس منظر میں جو برفپوش بلندیاں تھیں، وہ یکدم غائب ہو گئیں اور وہ چٹان اور اُس پر بیٹھی لڑکی جو جانے کس دھیان میں تھی اور جانے چوٹی تک کیسے پہنچی تھی، آسمان میں تیرنے لگی..

یہ محض پل دو پل کا سماں تھا..جو تیزی سے گزر گیا..آنکھ جھپکتے ہی گزر گیا لیکن میری یادداشت پر ثبت ہو گیا..سکّے پر مُہر لگ گئی...

وہ کوپن ہیگن کی "لٹل مرمیڈ" کی مانند اُس چٹان پر بیٹھی تھی..

کوپن ہیگن کی لٹل مرمیڈ ایک بڑے پتھر پر براجمان سمندر کو دیکھتی تھی، اُس شہر کی علامت ہوتی تھی..اتنی مختصر تھی کہ قریب پہنچنے پر بھی غور کرنے سے نظر آتی تھی لیکن کینداس تھنگ کی یہ جل پری اس کی نسبت ہزاروں گنا بڑی اور بلند چٹان پر..اور جانے وہاں تک پہنچی کیسے تھی، اطمینان سے بیٹھی تھی..اور اُس کے سامنے سمندر نہ تھا..خلاء تھا...وہ اتنی بلندی پر تھی..اور اس خلاء کے کہیں نیچے دریائے ہوشے اور شیوک تھے..اور بہت دور خپلو کی وادی تھی اور سیاچن جانے والے راستے تھے...وہ ایک لیڈی گوڈائیوا تھی جو اپنے بے لباس بدن کو محض اپنے طویل گیسوؤں سے ڈھکتی ایک سفید براق گھوڑے پر سوار تھی..

ایک جون آف آرک تھی جو اپنے جلائے جانے کی منتظر تھی..

حضرت عیسیٰ کا وہ سفید مجسمہ تھی جو ریوڈی جنیرو کی بلند ترین پہاڑی پر ہاتھ پھیلائے کھڑا ہے..

اگرچہ وہ یہ سب کچھ تھی لیکن ان سب سے افضل تھی کیونکہ وہ زندہ تھی..اس کا سرخ دوپٹہ ہوا کے زور سے کبھی کبھار پھڑ پھڑا کر اٹھتا تھا اور گر جاتا تھا..

"بن سکو تو پہاڑ کی چوٹی بن جاؤ"
یہ ممکن نہ ہو تو پہاڑ کی کھائی میں کھلنے والا ایک زرد پھول بن جاؤ..
ایسا نہ ہو سکے تو ایک چھوٹا سا جھرنا ہی سہی..
اور کچھ بھی نہ بن سکو تو گھاس بن جاؤ..
ایسی گھاس جس پر کسی کے قدموں کے نشان ثبت ہو جائیں..

میں کچھ بھی نہ بن سکا تھا، اس لیے وہ گھاس بن گیا تھا جس پر جیپ کی کھڑکی میں سے تیزی سے گزر جانے والی چٹان پر بیٹھی لڑکی کے نشان ثبت ہو گئے تھے..

منظر کب کا گزر چکا تھا..

سب کچھ پیچھے رہ گیا تھا..

لیکن اس کے باوجود وہی چٹان وہی لڑکی اس کی چوٹی پر ٹانگیں سمیٹے بیٹھی گزرتی رہی..

جیسے ایکشن ری پلے ہوتا جائے..

میری بھوری آنکھوں کے سکّے پر وہ بار بار ثبت ہوتی رہی...

کہیں بلند پہاڑوں میں...

ایک ٹرانگو ٹاور ایسے چٹانی مینار پر براجمان.. سرخ لباس والی لڑکی.. تیزی سے جیپ کی کھڑکی کے فریم میں سے گزرتی رہی..

چونکہ ابھی میری بھوری آنکھوں کا سکّہ رائج ہے.. اس لیے نقش بھی تازہ ہے.. ابھی ابھی ٹکسال میں ڈھلا ہے.. اس لیے اسے میں اتنی تفصیل سے بیان کر رہا ہوں..

ایک بلند چٹان.. عرش کی قربت میں.. چوٹی پر ایک لڑکی.. سرخ لبادے میں.. تیزی سے سرکتی... جیپ کی کھڑکی میں سے گزرتی.. بلندیوں کی جل پری پاؤں سمیٹے جانے کس کی منتظر..

ہوشے کی شام میں جاتی دھول اڑاتی ایک جیپ کے عین اوپر..

چٹان پر ایک لڑکی...

"ویگن جس میں موسم، بلندیاں اور چند چہرے ٹھہرے ہوئے تھے...... واپسی!"

ویگن خاموشی کے چُپ جزیرے میں سے یکدم... سکوت کے کواڑ توڑتی یکدم.. شہر کے شور میں داخل ہو گئی..

لاہور شہر کے شور میں داخل ہو گئی..

ہمارے کانوں کے پردے پھٹنے کو آئے.. چہرے شور کی بوچھاڑ سے زخمی ہونے لگے.. ریڑھے، تانگے، ویگنیں، بسیں، رکشے شور مچاتے دندناتے ہمیں روندتے ہماری ویگن کے آس پاس ایک ہولناک قیامت برپا کر رہے تھے.. اور پھر لوگ.. بہت ہی لوگ.. شہر کے لوگ.. لاکھوں لوگ بھیڑوں کے ریوڑ.. لالچ اور حماقت کے ریوڑ ایک سیلاب کی مانند ہماری ویگن کو دھکیلنے لگے..

ہم نے ایسا منظر کبھی نہ دیکھا تھا..

دندناتی لہراتی بے قابو بے اختیار ہوتی ویگنیں ہمیں کچلنے کے لیے آ رہی تھیں.. بسیں اپنے بانٹ کھولے ہمیں ہڑپ کرنے کو تھیں.. تانگوں میں جُتے گھوڑے عفریتوں کی مانند منہ کھولے ہمیں نوالہ بنانے کے لیے ہنہناتے چلے آ رہے تھے.. کاریں صرف ہمیں کچلنے کی خاطر چیختی چلاتی ہماری ویگن کی جانب بڑھتی تھیں.. اور ہم سہمے ہوئے تھے..

ہم دُبکے ہوئے کھڑکی کے کھلے شیشوں میں سے ان آفتوں اور بلاؤں کو اپنے آس پاس چنگھاڑتے ہوئے دیکھتے تھے اور سہمے ہوئے تھے..

ہم مکمل طور پر ایک سٹیٹ آف شاک میں تھے..

ہماری ویگن موٹروے سے اُتر کر کالا شاہ کاکو کے قریب گرینڈ ٹرنک روڈ میں داخل ہوئی تھی اور اب لاہور شہر میں پہنچ کر اس کے گھنے بدہیئت شور میں ڈوبتی جاتی تھی.. ہماری ویگن.. اگرچہ... بلکہ بظاہر ان تمام ویگنوں جیسی اور ان کی شکل کی تھی جو ہارن ہونکتیں ہمیں کچلنے کی نیت سے بے قابو اڑتی پھرتی تھیں لیکن شکل سے کیا ہوتا ہے، ہماری ویگن کی روح ان سے مختلف تھی۔

اس کا ڈھانچہ اور ماڈل ان جیسا تھا لیکن اس کی روح کچھ اور تھی..

ہماری ویگن کے اندر ابھی تک کچھ موسم ٹھہرے ہوئے تھے..

اور اس ویگن میں جو ہم تھے.. ہمارے رُک سیک۔ پانی کی بوتلیں۔ خیمے۔ جیکٹیں، واکنگ سٹکس اور جو ہائکنگ بُوٹ تھے، ان میں بھی کچھ موسم ٹھہرے ہوئے تھے.. بشام کی شام میں شیر دریا سندھ کی لہروں کی کروٹوں کا بہاؤ اس میں تھما ہوا تھا.. اس کی کچھ نمی باقی تھی..

برسین.. یا برزین کی بلند تنہائی کے موٹل کے ایک کمرے میں بستر پر بچھی بے شکن چادر کی ایک یاد تھی..

رائے کوٹ پُل پر.. سُرخ ریش پورٹر شکور کا چہرہ تھا جو اوپر فیئری میڈو سے آیا تھا اور مجھ سے کہتا تھا.. صاحب.. اوپر چلو.. فیئری میڈو تمہیں یاد کرتا ہے.. گلگت کی ایک مست شام تھی..

سکردو روڈ پر سفر کرتے ہوئے اس تنگ درّے میں.. اس کی پُر پیچ اٹھان اور اُتران میں دریائے سندھ کی گرج نے جو دل کو روکا تھا، اس ویگن میں ابھی تک اُس دل کی دھک تھی.. سکردو کی وسعت میں وہ ہلکی بارش تھی جو سندھ کے بہاؤ پر گرتی تھی..

گئی رات وادی ہپلو کی جانب سفر تھا.. شیوک ابھی تک اس ویگن میں بہتا تھا.. مچلو کی خانقاہ کے تنی مینار اور ستارے تھے۔ کاندے کا ٹوٹا ہوا پل تھا اور اس کے پار ایک چٹان پر براجمان سرخ لباس والی لڑکی تھی.. ہوشے تھا.. درّہ گندگورو تک کا ایک پُر اذیت سفر تھا.. شائی چُو میں اڑتی پتنگ تھی.. ڈل سنگ پا کی جھیل میں اُترتے ہوئے سات گلیشیر تھے اور ہسپاں تھا جہاں لیلے ہماری منتظر تھی..

اس ویگن کے اندر جو ابھی ابھی موٹروے سے جدا ہو کر اس کے سکوت کے قفل توڑ کر یکدم لاہور شہر کے شور میں داخل ہوئی تھی، بہت کچھ باقی اس لیے تھا کہ اس میں کچھ موسم ٹھہرے ہوئے تھے..

اگرچہ دور سے.. ٹریفک کی بھیڑ میں یہ ایک عام سی کوئی سی ویگن لگتی تھی لیکن اس میں چند موسم... چند بلندیاں اور چند چہرے ٹھہر گئے تھے..

ویگن کے فرش پر ابھی تک کچھ کانٹے تھے.. کسی پہاڑی پودے کے جو کسی کوہ نورد کے بوٹوں سے چپک کر اندر آئے تھے اور ہمارے ساتھ ہی شہر کے شور میں چلے آئے تھے..

نشستوں تلے رُک سیکوں میں ٹھنسے ہمارے قدموں میں پڑے اُس شاپنگ کے ڈھیر ڈبے اور کارٹن تھے اور بیگ تھے جو گلگت کی این ایل آئی مارکیٹ میں کی گئی تھی.. بچوں کے کھلونے، جوگر، ریشمی زنانہ سوٹ، ہیلی کاپٹر، چینی ڈنر سیٹ اور ٹی سیٹ۔ ایک عدد ٹیلی ویژن اور بے شمار کلاک جو بے حد سستے تھے اور اب درجنوں کے حساب سے ٹِک ٹِک کیے جا رہے تھے۔

اور ہاں.. ہماری گندی جرابوں کی بہت ہی بُری بُو تھی..

ویگن میں میری شاپنگ سب سے مختصر تھی کیونکہ شاپنگ تو ہمیشہ بیٹیوں کے لیے کی جاتی ہے.. اور میری بیٹی ملک سے باہر جا چکی تھی.. اگر ایک بیٹی آپ کے پاس ہو تو کسی بھی شاپنگ سنٹر کے سارے شیلف اس کے لیے خرید کیے جا سکتے ہیں.. وہ نہ ہو تو وہاں خریدنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہوتا.. اور بیٹے بھی اتنے بڑے ہو چکے تھے کہ میں ان کے لیے تالیاں بجاتے بندر یا ہیلی کاپٹر نہیں خرید سکتا تھا..

میرے پاؤں میں سینڈل تھے اور ٹریکنگ بوٹ فرش پر پڑے منہ کھولے ہانپ رہے تھے کہ وہ چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر تو آسانی سے سانس لے سکتے تھے.. برفباری کے دوران ان کے تسمے کس دینے سے وہ آرامدہ محسوس کرتے تھے لیکن لاہور کی اس حبس زدہ گرمی میں وہ چڑیا کے بچوں کی مانند منہ کھولے ہانپ رہے تھے اور ان کو سانس نہیں آ رہا تھا.. ویسے وہ یہ جانتے تھے کہ یہ شخص اگر اگلے برس تک صحت مند رہا اور زندہ رہا تو باز نہیں آئے گا اور ہم پھر اس کے پاؤں سے آشنا ہوں گے اور بلندیوں تک جائیں گے۔

ویگن سے باہر ایک ہولناک شور تھا جیسے کوئی ڈائنا سور چکوال یا بلوچستان میں اپنی ہڈیاں جوڑ کر زندہ ہو کر لاہور کے برج مینارے ڈھاتا شہر میں گھس آیا ہو.. اتنی افراتفری مچی ہوئی تھی۔

اگر مجھے فوراً یہیں کہیں ڈراپ کر دیا جاتا اور کہا جاتا کہ آپ سڑک کے پار چلے جائیں تو میں کبھی بھی ایسا نہ کر پاتا کہ مجھ میں کاروں، ویگنوں اور رکشوں سے بچ کر سڑک پار کرنے کی

حس مفقود ہو چکی تھی.. میں ایک ہی مقام پر بیٹھی مرغابی کی مانند شکار ہو سکتا تھا.. مجھ میں کسی گہری دراڑ کو پھلانگنے یا گلیشیئر کے بلند راستے کی دھار ایسے کنارے پر چلنے کی صلاحیت تو تھی لیکن اس طوفانی شور اور زوم زوم گزرتی ٹریفک میں سے بچ کر سڑک کے پار کرنے کی صلاحیت نہ تھی..

میں ابھی تک ہسپاں میں تھا۔

لیلیٰ پیک کی آغوش میں تھا..

میرا چہرہ اور ہاتھ جلے ہوئے تھے.. بلندیوں کے اژدھے کی پھونک سے ڈسے ہوئے تھے.. اگر کوئی میرے پورے بدن کو اُلفت سے دیکھتا تو وہ کہتا کہ.. یہ کیا ہے کہ تمہارے بدن کے کچھ حصے نیم سفید ہیں لیکن تمہارے ہاتھ سیاہ ہیں، چہرہ جلا ہوا ہے اور ٹانگوں پر سیاہی کے آثار ہیں اور تمہاری جلد اکھڑ رہی ہے.. یہ کیا ہے.. اور میں کہتا کہ یہ بلندی کی ڈائن ہے جس نے میرے بدن کے کچھ حصے سیاہ کر دیے ہیں..

تو پھر کیوں کہیں بلند پہاڑوں میں جاتے ہو؟..

میں نے کہیں اپنے گاؤں کے اس جولاہے کا قصہ بیان کیا ہے جو ایک بار سانپ سے ڈسا گیا تو پھر ایک خاص موسم میں پھر سے ڈسے جانے کے لیے بے چین اور مضطرب ہو جاتا تھا.. وہ اس سانپ کا منتظر رہتا.. اور وہ آتا اور اسے ڈس کر چلا جاتا اور وہ جولاہا شانت ہو جاتا۔

میں بھی وہی جولاہا ہوں..

ایک خاص موسم میں میں بھی بے چین اور مضطرب ہوتا ہوں اور پھر خود بلندی کی ڈائن تک جا پہنچتا ہوں کہ وہ میرے بدن کے کچھ حصوں کو سیاہ کر دے تاکہ میں بھی شانت ہو سکوں..

ویگن.. شہر کے اس شور میں ڈوب رہی تھی جس سے فرار ہو کر ہم شمال کو گئے تھے..

ہم سب سہمے ہوئے تھے..

"روانگی کا دن، ڈرائیور نیم حکیم اور کلر کہار میں بریک ڈاؤن"

یہ تو کچھ روز پہلے کی بات ہے..

چند روز پہلے کا قصہ ہے..

جب ہم..

لیکن کتنے روز پہلے؟.. نہ دن یاد ہے اور نہ تاریخ.. اس قصے کو گزرے ہوئے چند صدیاں بھی ہو سکتی تھیں..

کیونکہ چند روز میں تو انسان اپنے شہر کو نہیں بھولتا.. اس میں دوبارہ داخل ہونے پر سہم نہیں جاتا.. خوفزدہ تو نہیں ہو جاتا کہ یہ میں کہاں آ گیا ہوں، یہ کونسا دیار ہے.. تو یقیناً اس قصے کو چند صدیاں گزر چکی تھیں جب ایک ایسی سویر تھی جب میرے گھر کے مونگیے رنگ کے پھاٹک کے باہر ایک ایسی ویگن کھڑی تھی جس میں میرے کوہ نورد ساتھیوں کے رک سیک اور سامان لوڈ کیا جا رہا تھا.. اور پھر ہم لوڈ ہوئے تھے بلکہ ٹھنس گئے تھے کیونکہ ویگن کی چھت پر کیریئر نصب نہ تھا اور ہم اور سامان اس کے اندر ہی بمشکل پیک ہوئے تھے..

ویگن گلبرگ میں سے نکلی تو موٹروے کی بجائے ملتان روڈ کی ایک ایسی ورکشاپ کے سامنے جا کھڑی ہوئی جس کے چھوٹے ابھی نیند میں تھے اور استاد کے نمودار ہونے میں ابھی بہت وقت تھا کیونکہ یہ صبح سویر تھی۔

"کیا ہوا ہے؟" میں نے حکیم سے پوچھا..

اور یہ حکیم ہمارا ڈرائیور تھا اور عجیب و غریب حکیم تھا.. نہ کچھ بولتا تھا نہ کچھ کہتا تھا.. شاید نیم حکیم تھا.. ہم نے سفر کے آغاز میں اس سے کچھ فرینڈلی ہونے کی کوشش کی لیکن اس نے ہمیں

پھر زیادہ لفٹ نہ کرائی صرف ''جی'' اور ''ہوں'' کے ساتھ ہمیں ٹرخا دیا.. ایک بہت ہی طویل سفر کے دوران ڈرائیور کے ساتھ فرینڈلی ہونا بلکہ کسی حد تک اس کی خوشامد کرنا بے حد ضروری ہوتا ہے.. کیونکہ شاہراہ قراقرم اور سکردو روڈ پر آپ ایک ناراض اور ناخوش ڈرائیور افورڈ نہیں کر سکتے..

''ہوں..'' اس نے جواب دیا..

''یار حکیم پلیز بتاؤ کہ کیا پرابلم ہے؟''

''ایئر کنڈیشنر کی بیلٹ آواز دے رہی ہے.. اسے چیک کراتا ہے۔'' حکیم نے اونگھتے ہوئے حکمت سے کہا۔

''پہلے کیوں نہیں چیک کی..'' حسن صاحب ذرا ناراض ہو گئے کہ یہ انہی کا بندوبست تھا.'' آپ تو کہتے تھے ویگن بالکل برینڈ نیو ہے اور ابھی تک اس کی سیلیں نہیں ٹوٹیں۔''

''میں نے نہیں کہا تھا.. مالک نے کہا تھا..''

ایک زبردستی بیدار کیا گیا اونگھتا ہوا چھوٹا کچھ ڈرا ڈرا ویگن کے پیٹ کے نیچے رینگتا ہوا روپوش ہو گیا..

یہ کوئی اچھا شگون نہ تھا..

پاؤلو کوہلو کہتا ہے کہ شگونوں پر ہمیشہ دھیان دو..

لیکن ہم نے اس کا کہنا نہ مانا کہ سفر کا آغاز اچھا نہ تھا.. ایئر کنڈیشنر کی بیلٹ کا آواز دینا ایک بُرا شگون ہو سکتا تھا.. ہم اس شگون پر دھیان دیتے تو سفر کا ارادہ ترک کر دیتے۔ چنانچہ ہم نے آس پاس دیکھنا شروع کر دیا۔

اور آس پاس ملتان روڈ کا وہ علاقہ تھا جہاں شاہ نور سٹوڈیو واقع تھا.. شاہ یعنی شوکت حسین رضوی اور نُور یعنی نور جہاں دونوں مر چکے تھے لیکن ان کا سٹوڈیو ابھی زندہ اور بارونق تھا.. اس کے آس پاس اور قربت میں ایسے ''ادارے'' اور ''اکیڈمیاں'' تھیں جو ہیرو بننے، گلوکاری میں کمال حاصل کرنے کے خواہش مندوں کے لیے مینارۂ نور تھیں..

ہر جانب مختلف ''پرفارمنگ آرٹس'' کی اکیڈمیوں کے بورڈ تھے جو یقیناً ان بلند پایہ اداروں کے پرنسپل حضرات نے خود اپنے ہاتھوں سے لکھ کر وہاں لٹکائے تھے..

''شاہی بینڈ باجہ.. پوپ سانگ کے ایکسپرٹ.. بلّو بھائی۔''

''رائل ڈانس اکیڈمی.. استاد اچھے خان ولد ستارۂ ہند استاد چھتو خان۔''

''ناچ ناچ گھر.. ہر قسم کے ناچ کی ٹریننگ..''

''ملٹری بینڈ سروس.. یہاں بگل بجانا بھی سکھایا جاتا ہے۔''

''ہالی وُڈ ایکٹنگ اکیڈمی..''

''بھائی گلّو حسین بھاٹی گیٹ والے کا گٹار سکول.. اور بانگو ڈرم۔''

ہم یہ سائن بورڈ پڑھتے رہے.. اور بار بار گھڑیاں دیکھتے رہے کہ آٹھ بج چکے تھے اور ابھی تک ہمارا سفر شروع نہیں ہوا تھا۔

اور شیڈیول کے مطابق ہمیں آج شام... بشام میں ہونا تھا..

بشام... سندھ کے کنارے.. ایک ناممکن آرزو ہو رہی تھی..

ویگن کے نیچے روپوش ہونے والے پہلے چھوٹے کے بعد ایک اور چھوٹا کچی نیند میں جھولتا آیا اور اس نے اپنی مردانگی ظاہر کرنے کے لیے شلوار میں ہاتھ ڈال کر ایک کھجلی کی حالانکہ فی الحال دس برس کی عمر میں وہاں کھجلانے کے لیے بہت کچھ نہ تھا اور وہ بھی ویگن کے نیچے لیٹ کر سرکتا ہوا غائب ہو گیا..

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ایئر کنڈیشنر کی بیلٹ تبدیل ہوئی.. حکیم نے حکمت سے سر ہلایا اور ہم موٹروے کے مسافر ہو گئے.. جانب اسلام آباد..

اس برس بھی میری ٹیم میں وہی آزمودہ چہرے تھے جو ہر برس میرا ساتھ دیتے تھے.. یہ وہ لوگ تھے جن کی طفیل میں ہر برس شمال کو جا سکتا تھا.. یہ میرا خیال رکھتے تھے.. میرا سہارا بنتے تھے۔ البتہ ایک چہرہ ایسا تھا جو ایک مدت کے بعد ہمارے سفر میں شریک ہوا تھا..

یہ عامر کے ٹُو تھا..

عامر کے ٹُو اس لیے کہ ایک عامر ہمارے ہمراہ ناراض ناراض.. روٹھا ہوا ''سنو لیک'' کے ٹریک میں چلا تھا۔

اُس عامر سے اِس عامر کو الگ کرنے کے لیے یہ کے ٹُو تھا جو میرے پہلے بڑے ٹریک میں... ''کے ٹو کہانی'' میں میرا ساتھی تھا..

عامر کے ٹُو نیت کا بُرا نہ تھا لیکن ہر برس شدید خواہش کے باوجود اپنے کاروباری جھمیلوں کے جال میں پھنس کر رہ جاتا تھا اور ہمارا ساتھ نہ دے سکتا تھا..

اس برس بھی ہمیں یقین نہ تھا کہ وہ آخری لمحوں میں نمودار ہو گا یا نہیں.. لیکن وہ ہو گیا

یہ وہی تھا جس نے بیافو کی برفوں کے آغاز میں واقع کوردفون کیمپنگ میں یہ خواہش کی تھی کہ تارڑ صاحب ہم کبھی نہ کبھی یہاں سے کنکورڈیا جانے کی بجائے اوپر بیافو پر جائیں گے اور سنولیک تک پہنچیں گے لیکن وہ نہ جا سکا تھا.. اور آج جا رہا تھا.. اپنی یکتا جس مزاح.. اور دنیا کے بارے میں ایک الگ نکتۂ نظر رکھنے کی اہلیت اور دل کو خوشی دینے والی اپنی شخصیت کے ہمراہ.. ہمارے ساتھ جا رہا تھا۔

مجھے صرف یہ قلق تھا کہ ایک اور نہایت بلند پایہ جگت باز خان سلیم ہمارے ساتھ نہ تھا.. شائد ایک میان میں دو تلواریں.. عامر اور سلیم نہیں سما سکتی تھیں..

ایک چہرہ.. سلمان کا تھا جسے میاں صاحب ہمیشہ سُلمان کہتے تھے..

سلمان میرے ہمراہ دیوسائی کو عبور کر چکا تھا.. ''سنولیک'' پر گُڈی اڑانے کی کوشش کر چکا تھا لیکن پھر وہ آسٹریلیا چلا گیا۔ وہاں کے باسیوں کے علاوہ وہاں کے کنگروؤں نے بھی اسے بے حد پسند کیا۔ وہ بنجر زمینوں سے بھی پیار کشید کر لینے والا ایک گولو مولو بچہ تھا.. پھر وہ آسٹریلیا سے امریکہ سدھارا اور وہاں سے واپس آیا تو سیدھا اس بشام جانے والی ویگن میں آ بیٹھا.. بنیادی طور پر وہ ایک بچہ جاسوس تھا جو میری ہر حرکت پر کڑی نظر رکھتا تھا کہ سر جی اگر آپ ایسا کریں گے تو میں واپس جا کر بھر جائی کو رپورٹ کر دوں گا.. بتا دوں گا کہ آپ پہاڑوں میں جا کر اپنی جان کی پروا نہیں کرتے.. مسخریاں کرتے ہیں..

عامر کے ٹُو اور سلمان کے علاوہ اس برس ہمارے درمیان پہلی بار ایک اور نہایت اجنبی اور ناقابلِ بیان سا چہرہ بھی تھا.. بس یوں جان لیجیے کہ یہ چہرہ ایسے مجرمانہ خدوخال کا حامل تھا کہ اس کی تصویر کسی بھی تھانے میں آویزاں ہو سکتی تھی اور اس کے نیچے ''موسٹ وانٹڈ'' کے علاوہ دس لاکھ روپے کے انعام کی نوید ''زندہ یا مردہ'' کے عنوان سے درج ہو سکتی تھی.. لیکن اس چہرے پر آپ اتنی معصوم نرمی اور الفت بھی دیکھ سکتے تھے کہ وہ محض ایک کونپل کے لیے.. سندھ کے اوپر پرواز کرتے ایک راج ہنس.. برف کے ایک ذرّے اور فیئری میڈو میں کھلنے والے ایک پھول کے لیے بھی پگھل کر بہہ جاتا تھا..

یہ ''مجرم'' ڈاکٹر عباس برمانی تھا..

ایک زمانے میں وہ.. اپنی جناتی ہینڈ رائٹنگ میں مجھے اپنے نہایت عجوبہ سفروں کی داستانیں لکھا کرتا تھا.. اور ایسے انداز میں کہ میری خواہش تھی کہ وہ کچھ نہ کچھ کتابی صورت میں بھی

لکھے.. پھر ہماری ملاقات ہوئی تو ایک فین، ایک دوست میں بدل گیا.. اس نے میری فرمائش پر ''کیلاش کتھا'' اور ''میرا سندھ سائیں'' ایسے کمال کے سفرنامے لکھے.. لیکن اُس میں ایک بہت بڑی خامی تھی.. وہ نہایت نامناسب انداز میں اتنے دھیمے اور سرگوشی سے بھی کم دھیمے پن میں بولنے والا ہے کہ سننے والا صرف نہایت تگ و دو کرنے کے بعد ہی اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس ڈاکٹر نے کیا کہا ہے.. کیا برمانی نے یہ کہا ہے کہ مارکس کا فلسفۂ اقتصادیات اب بھی اہمیت رکھتا ہے.. یا یہ کہا ہے کہ سائیں آپ جہنم میں جاؤ، مجھے نیند آ رہی ہے.. کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔

ایک ایسا شخص جو بیک وقت ایک سفید چوٹی اور ایک سفید گھوڑی کے عشق میں مبتلا ہو، اس کے بارے میں کیا پتہ چل سکتا ہے..

باقی وہی، آزردہ.. سالخوردہ.. اور ساتھ دینے والے چہرے تھے۔ حسن، شاہد، میاں صاحب! احسن کو اپنی بیگم سے جدا ہوئے ابھی دو گھنٹے نہ ہوئے تھے کہ وہ ان کے لیے اداس ہو گئے اور اتنی بے قراری سے کوئی پی سی او تلاش کرنے لگے جتنی بے قراری سے کوئی نہایت دباؤ میں آیا ہوا شخص ٹائلٹ تلاش کرتا ہے۔

شاہد صاحب.. سیاہ چشمے اور سُرخ پی کیپ میں اپنے گنج گراں مایہ کو چھپاتے جاسوس بنے بیٹھے تھے اور حسبِ سابق ٹیم کے حساب کتاب کے انچارج تھے.. ٹیم کا کُل کیش ان کی بیلٹ کے بٹوے میں پھولا ہوا تھا اور وہ اس کی حفاظت اس طرح کرتے تھے جیسے کروسیڈز کو جانے والا کوئی شکی نائٹ اپنی بیوی یا محبوبہ کی کمر کے ساتھ ایک ''چیسٹٹی بیلٹ'' باندھ کر اسے مقفل کر کے اس کی چابی اپنی زرہ بکتر میں سنبھال کر ساتھ لے جاتا تھا تا کہ بیوی یا محبوبہ اس کی غیر موجودگی میں گلچھرے نہ اُڑانے لگے۔

یہ الگ بات کہ گلچھرے پھر بھی اُڑ جاتے تھے..

میاں صاحب حسبِ معمول چھریرے و چھیرے.. اور اپنے لاہوری لہجے میں ''ڑ'' کو ''ر'' سے بدلتے اور ''ر'' کو ''ڑ'' بولتے.. یعنی چھرّیرے و چھیڑے..

کلرکہار کی چڑھائی آئی تو ویگن ڈگمگانے لگی.. ہچکیاں لینے لگی اور کھڑی ہو گئی..

''اب کیا ہوا ہے؟''

''پتہ نہیں۔'' ٹیم حکیم نے کہا..

اس نے ریڈی ایٹر کا ڈھکن کھولا تو اس میں سے اُبلتا ہوا گرم پانی ایک فوارے کی مانند

بلند ہوا۔ سرد اور گرم کی اطلاع کرنے والی سوئی گرم کے سرخ نشان سے بھی اوپر لرز رہی تھی.. نیم حکیم کبھی ریڈی ایٹر کے ڈھکن کو سونگھتا کبھی سر ہلاتا اور کبھی کہتا کہ گیس بن رہی ہے اور خارج ہو رہی ہے۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گی..

ہم ویگن سے باہر کڑی دھوپ میں بے آسرا کھڑے رہے.. تاکہ گیس بنتی رہے اور خارج ہوتی رہے۔

ہمارے سفر کی شروعات اچھی نہ تھیں.. شگون بُرے تھے..

آغازِ سفر کی نشہ آور شگون کے بُلبلے جو آج سویر ہمارے تن بدن میں سے پُھوٹ رہے تھے.. ہر بُلبلا کسی ایک منزل کی نوید دے رہا تھا.. بشام۔ گلگت۔ سکردو۔ ہوشے.. تو یہ سب بُلبلے کلر کہار کی دھوپ میں ایک ایک کر کے پھٹتے جاتے تھے، ہموار ہوتے جاتے تھے۔ پہلے ایئر کنڈیشنر کی بیلٹ بدلنے کے باوجود ہمیں اس کی سرد راحت نصیب نہ ہوئی اور اب یہ ریڈی ایٹر جس کا گرم پانی ڈھکن پر زور لگاتا چھلکتا تھا اور وہ نامہ نیم.. نیم حکیم بس اس ڈھکن کو سونگھتا تھا اور کہتا تھا ''ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔''

''تم نے تو کہا تھا کہ گاڑی بالکل برینڈ نیو ہے..''

''میں نے نہیں، مالکوں نے کہا تھا..''

میں نے بے دھیانی میں وہی سوال پھر سے کر دیا اور اس نے وہی جواب دیا جو وہ پہلے دے چکا تھا..

کلر کہار کی ڈھلوانوں پر.. موٹروے کے لیے تراشے گئے سرخ پہاڑوں کے درمیان، کاریں رینگ رہی تھیں۔ ٹرک اور بسیں چڑھائی پر بے بس تھے اور ساکت لگتے تھے.. زور لگاتے مگر ساکت لگتے تھے۔

ایسی چڑھائیوں پر مجھے سب سے زیادہ ترس فُلی لوڈڈ ٹریلروں اور ٹرکوں پر آتا ہے جو لاچار نظر آتے ہیں۔ ایک زخمی مکوڑے کی مانند بے چارے رینگتے ہیں، زور لگاتے ہیں اور ان کے پھیپھڑے پھٹنے کو آتے ہیں..

ہم تو رینگ بھی نہیں رہے تھے کڑی دھوپ میں کھڑے تھے..

کلر کہار سے بشام آن انڈس ایک دور کی آواز تھی.. ہمیں آج شام تک.. رات گئے تک بھی اس آواز تک پہنچنا تھا ورنہ کوہ نوردوں کا پورا شیڈیول درہم برہم ہو جانے کا خدشہ تھا۔ پھر کسی کو

ایمرجنسی فون کا خیال آیا جو موٹروے کے کنارے پر دکھائی دے رہا تھا... سلمان اور برمانی نے نزدیکی فون تک کوئیک مارچ کی اور امداد کی درخواست کی.. اور ہمیں بے حد خوشگوار حیرت ہوئی جب چند لمحوں بعد نہایت سمارٹ اور مددگار قسم کی پولیس موقعِ واردات پر پہنچ گئی۔

''تارڑ صاحب ہم آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو اسلام آباد پہنچا دیتے ہیں.. ویگن بعد میں آتی رہے گی۔''

''شکریہ.. لیکن یہ ویگن آتی نہیں رہے گی کیونکہ اس کی عمومی صحت اچھی نہیں ہے اور ڈرائیور بھی نیم حکیم ہے.. اس ویگن میں ہم سب کے گھر اور اُن کی آرائش کے سامان ہیں.. اور ہمیں صرف اسلام آباد نہیں بہت آگے جانا ہے..''

بالآخر فیصلہ ہوا کہ ایئر کنڈیشنر آف کر دیا جائے.. خاموشی اختیار کر لی جائے.. دعاؤں کا ورد کیا جائے.. اور ویگن کو ہولے ہولے چلایا جائے.. ہر دو چار کلومیٹر کے بعد جب پانی زیادہ اُبلنے لگے تو اسے روک کر ٹھنڈا ہونے کا موقع دیا جائے.. چند کلومیٹر تک موٹروے پولیس ہمارے آس پاس منڈلاتی رہی اور پھر ہماری سست روی سے تنگ آ کر ہمیں سلیوٹ کر کے اباؤٹ ٹرن ہو گئی..

''راولپنڈی میں استاد زاہد کی ورکشاپ تک پہنچ جائیں تو وہ اسے ایک دن میں پھر سے چالو کر دے گا۔'' نیم حکیم نے خوش خبری دی..

یعنی آج رات راولپنڈی میں ہو جائے گی.. کہاں ٹھہریں گے.. کیا کریں گے.. اور کوہ نوردوں کا شیڈیول..

اور راولپنڈی میں نالہ لیہ کے کناروں پر ایک اداس گرم اور موبل آئل سے لتھڑی اور کاروں کے ڈھانچوں سے مزین ایک ورکشاپ میں ہماری ویگن ہولے ہولے ہونکتی اُتری..

جہاں نالہ لیہ میں حالیہ سیلاب کی تباہ کاریاں، دروازوں اور دیواروں سے اوپر اپنے نشان چھوڑ چکی تھیں اور اس ورکشاپ کے پتھر، جھاڑیاں، چھوٹوں کے چہرے یہاں تک کہ دھول بھی موبل آئل سے سیاہ تھی..

استاد زاہد ذرا صحت مند موٹاپے والا اپنے کام کو تھرو اینڈ تھرو جاننے والا کہ وہ بھی کبھی اسی ورکشاپ میں ایک ''چھوٹا'' تھا۔ ریڈی ایٹر کا ڈھکن اٹھا کر اسے سونگھتے ہوئے بولا۔ ''ریڈی ایٹر فٹ ہے۔ صرف اس ڈھکن کے پیچ کھوچلے ہو گئے ہیں اور ہوا ایک ہوتی ہے.. بس ڈھکن بدل

دیں تو ویگن فٹ ہے جناب۔ تارڑ صاحب آپ اس کے مسافر نہ ہوتے تو ہم اس کا انجر پنجر کھولتے سارا دن لگا کر.. اور پھر چپکے سے ڈھکن بدل دیتے.. لیکن آپ تو ہمارے چاچا جی ہیں.. فٹ ہے۔"

"کیا گلگت تک جانے کے لیے بھی فٹ ہے؟"

"بادشاہو اسے بے شک لنڈن لے جاؤ.. فٹ ہے۔"

"فٹ ہے.." ٹیم ممبران نے نعرہ لگایا..

"بشام کی شام۔ برسین کی سویرا اور چلاس کا انصاف"

ویگن.. ٹیکسلا اور رواہ میں سے گزرتی جا رہی تھی..

اور ہم سب دم روکے بیٹھے تھے.. چپ تھے کہ کہیں ریڈی ایٹر پھر سے نہ اُبل پڑے لیکن ویگن واقعی فٹ تھی..

ہم نے جو دم روکا ہوا تھا، اس دم کو لینے کے لیے ہم حسن ابدال میں رُکے.. وہاں ستانے اور باقاعدہ فروکش ہو کر کھانے کی بجائے ہم نے وہاں کے نہایت خستہ پکوڑے اور مچھلی خریدی.. گرم روٹیاں حاصل کیں اور پھر سے رواں ہو گئے کہ ہنوز بشام دور است..

ہری سنگھ کا ہری پور، ایبٹ کا ایبٹ آباد... مان سنگھ کا مانسہرہ.. اشوک اعظم کے پتھروں پر کھدے فرمان.. اور پھر "ہوٹل تنجراب" گزرا جسے دیکھ کر اکثر سیاح اس غلطی فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ بس اب تو درّہ تنجراب کہیں آس پاس ہی ہے جب کہ وہ ابھی تین روز کی مسافت پر ہوتا ہے.. بٹل۔ چھتر پلین۔ چائے کے باغ، جنگل منگل..

اور جنگل منگل میں شام ہونے لگی..

ہم ابھی تک دم روکے بیٹھے تھے.. یہاں تک کہ سلمان بھی گفتگو سے پرہیز کر رہا تھا کہ کہیں ویگن کے میکانکی نظام میں کوئی اور خلل نمودار نہ ہو جائے..

شام کے بعد ظاہر ہے رات اُتری اور گہری ہوتی گئی.. اور اس کی گہرائی میں ہمارے دل ڈوبتے تھے..

پھر ایک بہاؤ کا ہلکا شور ہمارے کانوں میں اُترا.. یہ ہمارے کانوں کے لیے موسیقی تھا.. بیتھوون یا موزارٹ کی کسی سمفنی سے بڑھ کر مترنم تھا کہ یہ شیر دریا کا آرکسٹرا تھا جو ہمارے کانوں

میں بہتا آ رہا تھا..

تھاکوٹ کا پل.. رات کی تاریکی میں ویگن کی ہیڈ لائٹس سے روشن ہوا اور ہم تنہا تھے جو اس کے پار جاتے تھے..

بشام دور نہ تھا.. سندھ کے پار ہوئے تو بشام دور نہ تھا..

ہمیں سفر نے تو نہیں اس ذہنی اذیت نے تھکا دیا تھا جو ویگن کی خرابیوں نے ہم پر مسلّط کر دی تھی..

ہم ابھی تک چُپ تھے.. دم روکے ہوئے تھے اور تب ہم نے دریائے سندھ کے اوپر بہت بلندی سے نیچے دریا کے کنارے ایک ایسے تاج محل کو دیکھا جس کی روشنیاں پانیوں میں ٹمٹماتی تھیں..

پی ٹی ڈی سی موٹل بشام.. کمرہ نمبر ۲۲..

بہت سے لوگ اپنے آپ کو خوش نصیب تب گردانتے ہیں جب وہ ایک سکوٹر سے اُتر کر ایک مرسیڈس میں بیٹھ جائیں.. موچی دروازے کے گھر سے ڈیفنس کے بنگلے میں منتقل ہو جائیں.. شیدا قلفیاں والا کی بجائے ترقی کرتے ہوئے ملک آئس کریم پارلر کی ایک ملک گیر چین کے مالک ہو جائیں.. لال کھوئی والے فتّے حلوائی کی بجائے رفیق سویٹ ہاؤس کی لاجواب برفی کے پروپرائٹر ہو جائیں یا.. اپنی خالہ زاد بیوی خورشید بانو کی بجائے.. بلکہ اس کے بعد آپ ایشوریا رائے جیسی کسی خاتون کے شوہر ہو جائیں.. لیکن میری خوش نصیبی کے پیمانے ذرا مختلف رہے ہیں..

میں اپنے آپ کو خوش نصیب تب گردانتا ہوں جب.. شاہ گوری مجھے اپنا گورا بدن دکھلا دے اور اس کی برفوں پر میری نظروں کے بوسوں کے نیل ہوں.. جھیل کرومبر کے پانی مجھے آغوش میں لے لیں.. یا.. بشام موٹل میں مجھے کمرہ نمبر ۲۲ مل جائے.. جی ہاں.. یہ کمرہ نمبر ۲۲ میرے لیے ایک بڑی خوش نصیبی ہے کہ اس کی بالکونی سندھ پر یوں کھلتی ہے کہ اس کی سفید آہنی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے یہ مہران.. یہ انڈس آپ کے نیچے ہولے ہولے بہتا ہے اور یوں بہتا ہے کہ اس کے پار جو پہاڑیاں ہیں، ان کے کھیتوں میں جو اِکّا دُکّا جھونپڑے ہیں اور ان میں سے کسی ایک جھونپڑے میں اگر ایک لالٹین یا دیا روشن ہے تو اس کی روشنی دریا کی سطح پر پڑتی ہے.. دریا بہتا چلا جاتا ہے لیکن اس لالٹین اس ایک دیئے کی روشنی وہیں ایک ہی مقام پر ٹھہری رہتی ہے..

یہ منظر ایسا ہے کہ بے شک آپ کے ایئر کنڈیشنر کی بیلٹ خراب ہو جائے.. ریڈی ایٹر اُبلنے لگے.. آج دوپہر آپ راولپنڈی میں استاد زاہد کی موبل آئل سے لتھڑی ورکشاپ میں ناامید اور مایوس بیٹھے ہوں.. تو آپ یہ سب آفات بھلا دیتے ہیں اور کمرہ نمبر ۲۲ کے نیچے.. سندھ کی سلیٹی چادر کو سرکتے.. گزرتے.. دیکھتے جاتے ہیں اور سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ گئی رات تھی اور کمرہ نمبر ۲۲ کی بالکونی تھی..

میرے ہمراہ حسن اور برمانی سفید آہنی کرسیوں پر براجمان تھے اور وہ بھی بھول چکے تھے کہ آج ہمارے ساتھ کیا کیا ظلم ہوئے تھے.. اگر ہوئے تھے تو کن زمانوں میں ہوئے تھے.. کیا یہ آج کی سویر تھی جس میں ہم شاہ نور سٹوڈیو کی قربت میں بینڈ باجوں اور ڈانس اکیڈمیوں کے اشتہار پڑھتے تھے..

اور کلر کہار میں وہ قہر انگیز دھوپ جو ہماری بے بسی کو جھلساتی تھی۔ وہ آج دوپہر کی بات ہے.. وہی کلر کہار جس کے آس پاس نندنا کا وہ قلعہ تھا جہاں محمود غزنوی کے سپاہیوں کی قبریں تھیں اور جہاں بیٹھ کر البیرونی نے زمین کا گھیر ماپا تھا.. جہاں محض ایک ڈھکن کی خرابی کے باعث ہم بے بس اور غمگین اور لاچار ہوئے تھے.. یہ تو کسی اور صدی میں ہوا تھا۔

یہ قصّہ تو جانے کن زمانوں کا ہے..

ہم سب کچھ بھول چکے تھے اور کمرہ نمبر ۲۲ کی بالکونی میں بیٹھے.. گئی رات تک بیٹھے دریائے سندھ کی چادر پر کسی ایک لالٹین.. کسی ایک دیئے کی روشنی کو اس پر عکس ہوتے دیکھتے رہے۔

اور جب سویر ہوئی.. بشام میں سویر ہوئی تو میں اپنی مختصر نیند کے بعد جاگا تو میں نے دیکھا.. بالکونی میں آ کر دیکھا کہ سندھ کے پار جو پہاڑیاں تھیں، وہ گہری دھند میں گم تھیں..

میں کمرہ نمبر ۲۲ سے نکل کر.. نیچے دریا تک چلا گیا..

ابھی سویر تھی اور سندھ پر دھند تھی..

میں بہت بار اس کنارے پر اُترا تھا.. پچھلے بیس بائیس برسوں میں شائد پندرہ سولہ بار.. لیکن ہر بار یہی کنارا نہ تھا.. یہی دریا نہ تھا.. یہ ہمیشہ کسی اور منظر میں ہوتا تھا.. یہ ہمیشہ مجھے ایک الگ سی خوشی دیتا تھا..

وہاں وہ بڑا پتھر تھا جس پر بیٹھ کر.. بمشکل بیٹھ کر کئی برس پہلے عینی نے تصویر کھنچوائی تھی..

یہیں پر میرے بیٹے نے میری چپل کو سندھ میں پھینکا تھا کہ ابو وہ بوڑھا انتظار کر رہا ہوگا.. اور ایک پتھر ایسا بھی تھا جس پر ایک ناآسودہ تمنا براجمان تھی..

میں نے اس ناآسودہ تمنا سے دریافت کیا کہ تم کون ہو؟

تو اس نے کہا ''میں ازل سے ہوں.. کمرہ نمبر ۲۲ کی بے شکن چادر کی ایک سلوٹ بننا چاہتی ہوں.. میں شیر دریا سندھ کی روانی کو تکتی تمہارا انتظار کرتی ہوں.. میں ازل سے ہوں اور ابد تک رہوں گی..''

اور کون ابد کا انتظار کرتا ہے..

بشام سے اگلا سٹاپ ظاہر ہے داسو کے پل کے پار ناشتے کے لیے برسین موٹل میں تھا۔ دریائے سندھ کے اوپر.. شاہراہ قراقرم سے اوپر ایک ویران تنہائی میں معلق یہ برسین.. سلمان جو مکمل طور پر آسٹریلوی ہو چکا تھا.. اور اپنے تن و توش کے حوالے سے نہ کنگرو ہوا تھا اور نہ کوالا بیئر.. اپنے نئے وطن کی یاد میں جذباتی ہو کر کہہ رہا تھا۔ ''سر جی یہ برسین ہے یا برزبین..''

''برزبین؟''

''جی سر جی.. ایک تو آپ کا جغرافیہ بڑا کمزور ہے.. سر جی آسٹریلیا کا بڑا مشہور شہر ہے.. میں ایک مرتبہ وہاں گیا تھا.. وہاں بڑے زبردست رنگا رنگ طوطے ہوتے ہیں.. آبشاریں اور زرد پھول ہوتے ہیں..''

''ہوں گے۔'' میں نے بیزار ہو کر کہا.. ''لیکن تمہارا برزبین میرے برسین سے بہتر نہیں ہو سکتا.. کیا وہاں بھی میرے سندھ ساکیں ایسا کوئی دریا ہے..؟''

''دریا تو نہیں سر جی.. لیکن.. کچھ ندیاں ہیں جذباتی قسم کی..'' وہ ایک بھالو کی مانند جو کہ وہ تھا، ناراض ہو گیا..

اس برسین میں... یا برزبین میں ہم نے حسب روایت.. پچھلے درجنوں برسوں کی روایت کے مطابق ناشتہ کیا.. اور اسی روایت کی پیروی میں... میں نے موٹل کے ایک کمرے میں جا کر کچھ دیر کے لیے اپنے آپ کو مکمل طور پر تنہا کیا..

اور اس تنہائی میں بشام کے سندھ کنارے اُس پتھر پر براجمان ناآسودہ تمنا نے اپنی

جھلک دکھلائی اور چلی گئی.. میں آج تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ دریائے سندھ کے اوپر ایک پتھریلے بنجر علاقے میں برسین کا جو موٹل ہے، اس کے کسی ایک کمرے کی تنہائی مجھے اپنا تمنائی کیوں کرتی ہے.. اُس کمرے میں ایک اچھے ہوٹل کی تمام تر سہولتیں میسر ہیں.. صاف ستھرا باتھ روم ہے، تولیے ہیں، فرش پر قالین اور بستر پر چادریں ہیں اور خوراک بھی مناسب مل جاتی ہے.. اور یہ کمرہ ایک ویرانے میں ایک پتھریلے ویرانے کی بلندی پر دنیا جہان سے کٹا ہوا ہے.. شاید یہی وجہ ہے کہ میں ایک سہولت آمیز زندگی بھی چاہتا ہوں اور ایک ویرانہ بھی.. نہ میں محض سہولت آمیز زندگی میں خوش رہتا ہوں اور نہ مجھ میں ویرانے کی سختیاں برداشت کرنے کا حوصلہ ہے تو برسین کا یہ کمرہ میری ان دونوں خواہشوں کو یکجا کرتا ہے.. شائد اس لیے.. برسین سے آگے گئے تو چلاس میں ایک وقوعہ ہو گیا..

چلاس میں بہت کم لوگ رُکتے ہیں.. رُکتے ہیں تو مجبوراً رکتے ہیں۔ اس میں جہاں اس کے گرم ویران اور چٹیل ہونے کا عمل دخل ہے، وہاں اس کے باشندوں کے کھردرے پن اور باہر سے آنے والوں کے لیے ایک ناپسندیدگی کا عنصر بھی شامل ہے.. یوں بھی چلاس شہر شاہراہ سے اوپر کہیں واقع ہے اور اس بستی کی کوئی ایک عمارت بھی شاہراہ سے نظر نہیں آتی.. سوائے ایک بورڈ کے جو آپ کو اطلاع کرتا ہے کہ چلاس کہیں اوپر چٹانوں کی آغوش میں ہے..

چنانچہ جو کوئی بھی رکتا ہے، مجبوراً رکتا ہے.. کھانے کے لیے.. چائے کے لیے یا پٹرول یا ڈیزل حاصل کرنے کے لیے..

ہم بھی اپنی ویگن کا پیٹ بھرنے کے لیے سب سے پہلے.. ایک پولیس چوکی کے سامنے واقع پٹرول پمپ میں ڈیزل حاصل کرنے کے لیے رکے..

پٹرول پمپ کا انچارج ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر لیٹا ہوا ہمیں پمپ کے اندر آتے ہوئے ناپسندیدگی سے دیکھتا تھا کہ میں آرام کرنے کے موڈ میں ہوں اور یہ کہاں سے آ گئے ہیں۔ اس نے ایک چھوٹے کو آواز دی اور وہ چھوٹا جو بہت ہی چھوٹا تھا، نہایت بُری بُری شکلیں بناتا آیا۔ ہینڈل کو ٹنک سے اٹھایا اور ویگن کی ٹینکی میں فٹ کر کے اسے دبا دیا.. ہم سب نے فوراً نوٹ کیا کہ میٹر زیرو پر نہیں تھا بلکہ 17 کے ہندسے پر تھا.. ہم نے احتجاج کیا کہ بھائی آپ میٹر کو زیرو پر نہیں لائے تو وہ چھوٹا خفا ہو گیا اور کہنے لگا.. زیرو کیا۔ زیرو کیا.. اور ہم نے بھی خفا ہو کر کہا، نہیں کیا نہیں کیا.. اتنی دیر میں انچارج صاحب اپنے بدن کے مختلف حصوں میں خارش کرتے آ گئے اور انہوں نے بھی چھوٹے کا ساتھ دیا.. ہم نے چپکے سے ادائیگی کر دی۔ تقریباً تین سو روپے زائد ادائیگی

صرف اس لیے کردی کہ ہم بحث نہیں کرنا چاہتے تھے.. یہاں چلاس ایسی جگہ پر لڑائی جھگڑا نہیں کرنا چاہتے تھے.. اپنا سفر کھوٹا نہیں کرنا چاہتے تھے.. لیکن یہ صریحاً بے ایمانی تھی اور ہمیں بہت دکھ ہوا.. اور جلتی پر انچارج صاحب نے تیل یہ چھڑکا کہ ہمیں بے ایمان کہتے ہو.. جاؤ جا کر پولیس کو رپٹ دے دو.. ہم نے سوچا یہاں کے پولیس والے بھی انہی کے بھائی بند ہیں۔ ہوسکتا ہے ہمیں الٹا اندر کردیں لیکن ہم بھی تاؤ کھا گئے اور سامنے پولیس کی چوکی میں جا کر فریاد کر دی.. ڈیوٹی پر موجود پولیس والے نے حیرت انگیز طور پر ہماری بات تحمل سے سنی اور پھر ایک سادہ کاغذ پر اس وقوعے کی تفصیل لکھنے کو کہا جو ہم نے لکھ دی...

''آپ جاؤ ہم کارروائی کرے گا اور تم کو اطلاع کر دے گا..''

کونسی کارروائی اور کونسی اطلاع.. ہمارے لبوں پر ایک حقارت انگیز تبسم تھا.. اس سفر سے واپسی پر.. ایک ہفتے کے بعد لاہور میں مجھے تین سو روپے کا ایک منی آرڈر وصول ہوتا ہے جس کی سلپ پر لکھا ہے۔ ''آپ کی رپورٹ پر استغاثہ مرتب ہو کر عدالت میں پیش کیا گیا تھا جہاں سے ملزم کو مبلغ ایک ہزار روپے جرمانہ کے علاوہ آپ کی زائد رقم کی وصولگی بھی ہوئی تھی جس کو آپ کی خدمت میں بھیجا جا رہا ہے.. از طرف.. عبدالسعید۔ ایس ایچ او تھانہ چلاس۔ ضلع دیامر..''

میرا خیال ہے میری شدید شرمندگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے..

ہمیں انصاف وہاں سے ملا تھا اور فوری ملا تھا جہاں سے ہمیں اس کی امید نہ تھی.. کم از کم پنجاب پولیس میں تو یہ معجزہ کم کم ہی ہوتا ہوگا..

میں چلاس پولیس کا گرویدہ ہو گیا ہوں اور آئندہ جب کبھی اُدھر سے گزروں گا تو ایک عدد ''تھینک یو چلاس پولیس'' کا سلیوٹ کر کے گزروں گا۔

''رائے کوٹ جہاں دل رُکتا ہے.. شکور سے ملاقات''

چلاس کے بعد ویگن نے بہر طور رائے کوٹ پل پر رُکنا تھا اور اس کے ساتھ میرے دل نے بھی رُکنا تھا کہ اوپر فیئری میڈو تھا..

اور نیچے شنگریلا کے متروک شدہ ہوٹل کے آس پاس اوپر جانے والی جیپیں تھیں۔ پورٹر اور گائیڈ تھے.. اور شکور تھا.. رزق روزگار کی آس میں بیٹھا سرخ بالوں والا شکور تھا جو آج سے کتنے برس پیشتر.. اٹھارہ برس.. بیس برس.. جانے کتنے برس پیشتر مجھے فیئری میڈو میں ملا تھا.. پھر جب میں اپنے خاندان سمیت اوپر گیا تھا تو وہ مجھے سلجوق اور ثمیر کو ننگا پربت کے بیس کیمپ تک لے کر گیا تھا اور واپسی پر بیمار سلجوق کو کندھوں پر اٹھا کر لایا تھا.. اور پچھلے برس رحمت نبی کی کیمپنگ سائٹ میں وہ پھر مجھے خاص طور پر ملنے آیا تھا اور فیئری میڈو کی فلم کا ایک اہم کردار رہا تھا..

وہ بوڑھا ہو چکا تھا اور اس کا سرخ بالوں والا سر لرزش میں تھا.. چہرے کی جھریاں گہری ہو گئی تھیں.. وہ ایک آئینہ تھا اور میں اس میں اپنے آپ کو دیکھ سکتا تھا.. مجھے وہ شام یاد آئی جب کئی برس پہلے وہ اپنی رائے کوٹ گلیشیر کی برفوں میں گمشدہ گائے کو پکارتا تھا اور وہ جواب دیتی تھی..

''والدہ کیسی ہیں؟''

والدہ وہ میری بیوی میمونہ کو کہتا تھا.. اور ان دنوں میمونہ نے والدہ کہے جانے پر بے حد مائنڈ کیا تھا کہ یہ بوڑھا کس سلسلے میں مجھے والدہ کہتا ہے تو اس نے کہا تھا.. بیگم صاحب میں تو آپ کے پیارے بچوں کے حوالے سے ان کی والدہ کہتا ہوں.. ماں ہونے کی حیثیت سے ماں کہتا ہوں..

''بچہ لوگ کیسا ہے صاحب؟''

میرے رک سیک میں صرف ایک تصویر تھی.. بیٹی کی شادی کی.. اس کے برابر میں ظاہر ہے اس کا دولہا بلال براجمان تھا اور دائیں بائیں سلجوق اور سمیر کھڑے تھے..

''اچھا..'' شکور کا منہ حیرت سے کھل گیا ''بیٹی تو بہت چھوٹا تھا، ابھی سے اس کا شادی بنا دیا..''

''تب چھوٹا تھا شکور.. پھر ڈاکٹر ہو گیا تو شادی بنا دیا..''

شکور نے بیٹی کو بے شمار دعائیں دیں جو سب کی سب میں نے سنبھال لیں اور پھر لاہور واپسی پر انٹرنیٹ پر وائس چیٹ کرتے ہوئے.. اسے آئرلینڈ وامریکہ میں پہنچا دیں کہ فیری میڈو کا انکل شکور رائے کوٹ پل پر بیٹھا تمہارے لیے یہ دعائیں کر رہا تھا...

''چنار اِن میں رحمت نبی کا نزول اور.. محبت کے شگوفے''

گئی شام ہم گلگت میں تھے..

حسب روایت اور یہ روایت ٹوٹتی نہ تھی ہم چنار ان میں تھے.. اور وہاں کرم الٰہی ویٹر ایک بھائی کی مانند میری خدمت کرتا تھا اور افسوس کرتا تھا کہ صاحب آڑو کا موسم ختم ہو گیا ہے ورنہ ضرور پیش کرتا.. مجھے معلوم ہے آپ کو گلگت کے آڑو نمک کے ساتھ بہت پسند ہیں.. ندیم تھا.. شیرستان کا جھریوں بھرا سرخ وسفید چہرہ تھا اور میری آمد کی خبر گلگت کی شب میں یوں پھیلی کہ اکرام بیگ اور فضل صاحب اپنی تمام تر مصروفیتیں ترک کر کے میرے پاس آ گئے.. اور چنار ان میں دوستی اور خلوص کے شگوفے پھوٹنے لگے.. اور پھر میں ایک عجیب سے احساس سے دوچار ہوا.. میں جس کمرے میں تھا، وہ کہیں میری یادداشت کی دھند میں سے باہر آ کر کچھ شناسا سا لگتا تھا.. یہ چنار ان کے اولین.. اور بجنل اور قدیم کمروں میں سے تھا.. جب یہ موٹل تعمیر ہوا تھا تو یہ کمرہ تب سے تھا.. یہ وہی کمرہ تھا جس میں پتہ نہیں کتنے برس پیشتر ''ہنزہ داستان'' کے زمانوں میں رات کے ایک بجے شاہراہ قراقرم پر اپنے پہلے سفر کے بعد تھکن اور ڈر سے شکستہ.. داخل ہوا تھا.. سلجوق کے ہمراہ اترا تھا.. اور سلجوق جو آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا اور ذرا الم ڈھینگ ہو رہا تھا، کمرے میں داخل ہوتے ہی باتھ روم میں گھس گیا تھا نہانے کے لیے.. اور اندر سے آواز دیتا تھا کہ ابو اس کا نلکا تو لیک کرتا ہے.. اور وہ نلکا اب بھی لیک کرتا تھا.. اسی کو روایت کا تسلسل کہتے ہیں..

گئی رات جب ہم سب.. حسن، برمانی اور میں نیند میں مدہوش تھے..

ایک دستک ہوئی..

''کون ہے؟'' میں نے نیم غنودگی اور بیزاری کی ملی جلی کیفیت میں کہا۔

دروازہ کھلا اور ایک مشتبہ سا سایہ اندر داخل ہوا.. اس نے اندر داخل ہوتے ہی برمانی کے پاؤں پکڑ لیے۔ "تارڑ صاحب.."

برمانی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ "سائیں کون ہو تم.."

"سوری.." سائے نے کہا اور آگے بڑھ کر حسن صاحب کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر بولا۔ "مرشد.." حسن صاحب بھی گھبرا گئے۔ "بھائی جان کس کو ملنا ہے؟" اور بجلی لیمپ روشن کر دیا..

"سوری" سائے نے پھر معذرت کی اور پھر میرے قریب آ کر پہلے جھجک کر اطمینان کیا کہ یہ میں ہوں اور پھر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ "مرشد میں سلام کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں.. سوری ٹو ڈسٹرب یو.."

یہ فیری میڈ کا رحمت نبی تھا.. جو صبح کے دو بجے نازل ہو گیا تھا..

"اب میں جاتا ہوں تارڑ صاحب.. صرف سلام کرنے کے لیے حاضر ہوا تھا.."

"ہمیں جگا کر اب کہاں جاتے ہو.. بیٹھو.."

"میں بھی بیٹھنے ہی آیا تھا.." وہ ہنسنے لگا..

تمام روشنیاں آن کر دی گئیں.. برمانی اور حسن اپنے اپنے بستروں پر چوکڑیاں مار کر بیٹھ گئے۔ ویٹر کرم الٰہی کو جگا کر اس سے درخواست کی گئی کہ تازہ سلاد کی ایک طشتری اور مشروبات لے آئے اور محفل جم گئی..

اور ایسی جمی کہ کھڑکی کے پردوں میں سے صبح کے آثار روشن ہونے لگے.. اور کھڑکی کے باہر جو سیب کا ایک درخت تھا اس کی شاخوں میں پنہاں ہر سیب سورج کی پہلی کرنوں سے زرد ہونے لگا..

"کوہِ ہراموش کی سفید سستی"

جیسے شاہراہ قراقرم پر درجنوں بار سفر کرنے سے واقفیت تو ہو جاتی ہے لیکن.. اس کی عادت نہیں ہوتی..

اس شاہراہ کی بلند خطرناکی کی عادت نہیں ہوتی، بے شک یہ آپ کا چالیسواں پھیرا ہو.. ہندو بھائی اور ہندو بہن جی اگر ایک آگ کے گرد صرف سات پھیرے لگا لیں تو ان کی شادی ہو جاتی ہے.. یہاں عمر بھر پھیرے لگاتے رہیں تو کچھ نہیں ہوتا.. ہوتا ہے تو پھر کوئی حادثہ ہی ہوتا ہے..

تو جیسے شاہراہ قراقرم کی عادت نہیں ہوتی..

ایسے سکردو روڈ کی بھی عادت نہیں ہوتی...

چاہے آپ ادھر درجنوں بار ہی کیوں نہ آئے ہوں.. اس کے پھیرے پہ پھیرے کیوں نہ لگاتے ہوں.. اور یقین کیجیے سکردو روڈ میں پھیرے بھی بہت ہیں.. آپ کی ویگن دریائے سندھ کے اوپر ایک تنگ درّے میں.. جس کی چٹانیں بس اب گری کہ اب گری کی دھمکی کے انداز میں جھکی ہوتی ہیں.. پھیرے لگاتی رہتی ہے.. ایک دو تین اور گھوم جاؤ.. ایک دو تین اور.. یعنی والٹز رقص کے تمام تر سٹیپس یہاں موجود ہیں.. لیکن رقص آپ نہیں کرتے آپ کی ویگن کرتی ہے اور اگر ایک بھی سٹیپ غلط پڑا تو آپ سیدھے نیچے سندھ میں پڑے اور ایسے پڑے کہ بحیرہ عرب تک آپ کو کوئی نہیں پوچھے گا کہ یہاں کیوں پڑے.. یہاں تک کہ اندھی ڈولفن بھی نہیں پوچھے گی کہ وہ آپ کو قریب سے بہتا ہوا دیکھ بھی نہیں سکتی.. گھومتے گھومتے آپ بھی گھوم جاتے ہیں اور پھر لاپروا اور مست ہو جاتے ہیں کہ جو ہو گا دیکھا جائے گا..

سکردو گورج کی چٹانوں میں پہلی ہریاول سستی میں نظر آتی ہے..

یہ سسّی.. ایک بے آب و گیاہ چٹانی صحرا میں جانے کہاں سے بھٹکتی ہوئی آ نکلتی ہے..
اور یہ سسّی بھی بے خبر ہے..
کیونکہ میں یہاں سے جتنی بار بھی گزرا ہوں میں نے سوائے ایک چھوٹی سی آبشار کے.. مٹی کے چند سر راہ کھیتوں اور کچھ درختوں کے سوا کبھی کسی ذی روح کو نہیں دیکھا۔
صرف ایک ذی روح ہے اس سسّی کے عین اوپر سانس لیتا برف سے سفید ہوتا.. آسمان کی نیلاہٹ میں بلند ہوتا.. اور وہ ہے کوہ ہراموش!
بادلوں اور برفوں کا ایک ڈھیر جو سکردو درّے میں سسّی کے مقام پر جھانکتا نظر آتا ہے..
ہراموش تک میں جانا چاہتا ہوں..
یہ میرے مستقبل کے کوہ نوردی کے منصوبوں میں ترجیح اوّل ہے..
بڑھتی عمر اور گھٹتی ہمت پر تو میرا اختیار نہیں.. منصوبے بنانے پر تو میرا اختیار ہے.. سکردو روڈ پر سینکڑوں ایسے یکدم موڑ آتے ہیں جن پر مڑتے ہوئے اگر غیر متوقع طور پر سامنے سے ایک اور ویگن یا بس آ جائے تو.. اگر آپ اس لمحے محض سگریٹ کا ایک کش لگانے کے لیے سگریٹ منہ تک لے جا رہے ہیں تو بس اتنی دیر میں یا تو آپ اور یا سامنے سے آنے والی ویگن نیچے سندھ میں ہوں گے.. اور پھر باقی رہے نام اللہ کا.. یا کچھ عرصے کے لیے دریائے سندھ کا..
ایک مقام بانچھ نامی بھی راستے میں پڑتا ہے..
اور کیا باغ و بہار قسم کا مقام ہے جہاں اکثر کم کم باد و باراں بھی ہے.. ہرا بھرا ہے اور سرخ اور زرد رنگ کے پھول کھلا ہے... یہ وہ باز بچہ.. یعنی بانچھِ اطفال ہے جس میں سکردو روڈ کے سہمے ہوئے بنجر خوف کے مارے ہوئے بنجر مسافر داخل ہوتے ہیں تو ہرے بھرے ہو جاتے ہیں..
دریا کے پار بھی کوئی پکچر پوسٹ کارڈ گاؤں نظر آتا ہے۔ چٹانوں سے گرتے کسی سفید ریشمی آبشار کے دامن میں.. چند گھر.. کچھ کھیت.. پہلو میں کوہ کے ایک جھونپڑا اور یہ آبشار ایک نالے کی صورت اختیار کرتا نیچے سندھ میں گرتا ہوا.. گاؤں تک ایک پُل سے سندھ کے آر پار.. کبھی تو سکردو روڈ ترک کر کے نیچے اُتر کر اس پل کے پار اس گاؤں میں جانا چاہیے.. اس آبشار کی پھوار سے ہٹ کر کسی ہرے بھرے کھیت میں خیمہ لگانا چاہیے اور وہاں سے یہ دیکھنا چاہیے کہ سکردو روڈ پر رینگتی کوئی ایک ویگن.. بلکہ ہماری ویگن کتنی بیوقوف ڈولتی ہوئی اور بے مقصد لگتی ہے۔
درّہ کھلتا ہے۔ سر شام کھلتا ہے.. منظر وسیع ہوتا ہے اور سکردو کھلتا ہے..

سندھ جو اکثر شاخوں میں بٹا.. ریتلے ٹیلوں اور جزیروں میں خاموشی سے بہتا ہے۔ اس برس پورے جوبن پر ہے.. ٹیلوں اور جزیروں کو نابود کرتا رواں ہے.. بھرا ہوا ہے.. ہم از حد تھکے ہوئے ہیں..
کم از کم میں تو سب سے زیادہ تھکا ہوا تھا.. کہ مجھے لاہور میں اگلی صبح کے آغاز سفر کی فکرمندی نے سونے نہ دیا.. بشام میں شیر دریا کی لہریں میری نیند میں بہتی رہیں اور پچھلی شب رحمت نبی نے مجھے جگائے رکھا.. رات بھر طالع بیدار نے مجھے سونے نہ دیا۔ اس لیے میں سب سے زیادہ تھکا ہوا تھا۔
اور میں کے ٹو موٹل پہنچ کر اپنے اس سفر کو بھول کر ایک آرام دہ بستر پر ڈھیر ہو جانا چاہتا تھا..

''کوہ مشابرم کی بجائے گندوگورو بیس کیمپ جائیں گے''

کچورا جھیل اس جانب..

ایئرپورٹ اس جانب..

گمبہ چھاؤنی میں سے گذرتے..

اور پھر سکردو کے مین بازار کا آغاز..دائیں جانب پٹرول پمپ کے برابر میں'' ہمالین ٹورز'' کا بورڈ آویزاں ہے..محمد علی چنگیزی کا سیاحتی ادارہ اور یہاں سے ہمیں آئندہ سفر کے بارے میں نہایت قیمتی معلومات مل سکتی تھیں..چنانچہ تھکاوٹ اپنی جگہ لیکن معلومات اپنی جگہ..

''رُک جاؤ..''میں بہ حیثیت لیڈر حکیم کو حکم دیتا ہوں..

عجیب افیونی سا حکیم ہے..نہ بات کرتا ہے نہ مسکراتا ہے بس ویگن چلاتا جاتا ہے اور وہ بھی جیسی تیسی..نہ اسے کھانے میں دلچسپی ہے نہ اسے ہم میں دلچسپی ہے اور نہ ہی وہ اپنے آپ میں دلچسپی لیتا ہے..ایک مجنونی انداز میں..ویگن چلاتا جاتا ہے اور ہاں کبھی کبھار ذرا اونگھ بھی جاتا ہے اور ہمیں ایک پل کے لیے محسوس ہوتا ہے کہ ویگن ابھی کچھ فری سی ہو گئی تھی اور وہ پھر سنبھل جاتا ہے..ایسے موقعوں پر ہم ویگن رکوا کر اسے زبردستی چائے پلاتے ہیں، اور پھر اسے اونگھنے سے بچانے کے لیے لطیفے سناتے ہیں۔اس کی زندگی میں خواہ مخواہ دلچسپی لیتے ہیں۔اس کی بند بند آنکھوں کی تعریف کرتے ہیں کہ یہ لگتی تو اچھی ہیں لیکن انہیں ذرا کھولے رکھو تو تمہاری بڑی مہربانی..سکردو روڈ پر وہ پہلی بار آیا تھا اور صرف پاپی پیٹ کے لیے آیا تھا..اور اگر اس حکیم کا کوئی دماغ ہے تو وہ یقیناً سوچتا ہوگا کہ لاہور کے کسی پرائیویٹ پاگل خانے کے مریض ہیں جو فرار ہو گئے ہیں..ورنہ یہ نتھیا گلی یا سوات جاتے..ادھر کیوں آ گئے ہیں..آ گئے ہیں تو مجھے ساتھ کیوں لے

آئے ہیں۔اگرچہ میں ایک حکیم ہوں لیکن ان کی حکمت مجھے سمجھ نہیں آتی..

تو میں نے جب ''رُک جاؤ'' کہا تو حکیم نے اس کے پورے ایک منٹ بعد ویگن روکی کیونکہ وہ یہی سوچ رہا تھا جو میں نے اوپر بیان کیا ہے..ویسے ہم جان چکے تھے کہ ہم جو کچھ بھی کہتے تھے، وہ کچھ سمجھنے میں اسے کم از کم ایک منٹ لگتا تھا..چنانچہ ہم آگے نکل چکے تھے اور جب وہ ''رُک جاؤ'' سمجھا تو پھر ویگن بیک کی اور ہم'' ہمالین ٹورز'' کے دفتر میں داخل ہو گئے..

چنگیزی موجود نہیں تھا..عقل مند تھا..اسلام آباد میں تھا..

اس دفتر میں ہم نے ''کے ٹو کہانی'' اور'' سنولیک'' کی منصوبہ بندی کی تھی اور چنگیزی نے ہمیں گائیڈ کیا تھا..ساز و سامان عطا کیا تھا..بغیر کسی معاوضے کے..شائد اسے خبر ہو گئی تھی کہ لاہوری منت بر پھر آ رہے ہیں۔اسی لیے وہ اسلام آباد رو گیا تھا..چنگیزی کی افواج قاہرہ میں سے دو صاحب دفتر میں موجود تھے..ایک صاحب منیجر تھے اور اتنے منیجر تھے کہ کچھ بولے نہیں، منیجر کی کرسی پر بیٹھے سر ہلاتے رہے۔دوسرے صاحب شمال کے چپے چپے کو جانتے تھے اور انہوں نے مناسب انداز میں ہمارا سواگت کرنے کے بعد پوچھا'' تارڑ صاحب اس برس کہاں جائیں گے؟''

''ہوشے..اور وہاں سے مشابرم بیس کیمپ..''

''اب مشابرم بیس کیمپ کون جاتا ہے..''

''ہم جاتے ہیں..''

''کیوں جاتے ہیں؟''

ہم سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے کہ کیوں جاتے ہیں..

''جناب عالی سنا ہے کہ خوبصورت پہاڑ ہے..''میاں صاحب نے کھنگورا مار کر کہا..

''کیا ہے؟''

''خوبصورت پہاڑ..''

''آپ کو کس نے بتایا ہے؟''

''تارڑ صاحب نے..''

''کیوں تارڑ صاحب؟''

''مجھے بھی کسی نے بتایا ہے..''

''نہ جانیے۔''

''کیوں؟''

''آپ ہوشے سے مشابرم کے بیس کیمپ میں ڈیڑھ دن میں پہنچ جائیں گے.. اور وہ ایک تنگ جگہ ہے.. مشابرم کی چوٹی راستہ روکے کھڑی ہے اور بس.. ایک دن میں واپس ہوشے آ جائیں گے تو کل ڈھائی دن کی ٹریکنگ کیا ٹریکنگ ہوئی.''

میں کہنا تو یہ چاہتا تھا کہ وہ کیا پنجابی گیت ہے جگجیت سنگھ کا کہ..' ڈھائی دن نہ جوانی چلدی.. تے کُڑتی ململ دی.' تو ڈھائی دن کی کوہ نوردی بھی بہت ہوتی ہے لیکن میں نے کہا یہ کہ.. مشابرم بیس کیمپ نہ جائیں تو کہاں جائیں؟......

اس سوال کا جواب کیا آیا یہ بتانے سے پہلے میرا بہت جی چاہ رہا ہے کہ میں آپ کو اس گیت کے بارے میں ایک اور مزیدار واقعہ بتاؤں.. ایک شب.. ایک گئی شب جب میں اپنی سٹڈی ٹیبل پر جھکا جھک مار رہا تھا یعنی کوئی اس قسم کا سفرنامہ لکھ رہا تھا اور گرمی سے نڈھال اور پسینے سے شرابور تھا تو ایک ٹیلی فون آیا.. پس منظر میں خوب شور شرابہ تھا اور شور اتنا نہ تھا جتنا شرابہ تھا کیونکہ اس میں شراب کی آمیزش تھی، کوئی صاحب اس آمیزش میں ڈوبتے بولے'' تارڑ جی.. ہم تو آپ کے پجاری ہیں.. چرن چھونا چاہتے ہیں.. ادھر آپ کے لاہور میں مشرقی پنجاب سے آئے ہیں ایک کانفرنس کے سلسلے میں تو چرن چھونے آ جائیں؟ ویسے آپ آ جائیں تو بھاگ جاگ جائیں ہمارے.. ہم کسی شاہ نور سٹوڈیو کے قریب رنگ جمائے بیٹھے ہیں.. پرویز مہدی گا رہے ہیں.''

''شکریہ بہت بہت.. لیکن رات کے اس پہر ذرا مشکل ہے.. ویسے آپ اپنا تعارف تو کروا دیجیے کہ کیا کرتے ہیں.. کون ہیں؟''

''لو جی.. ہمیں تو پورا امریکہ جانتا ہے.. پورا یورپ جانتا ہے۔ پورا افریقہ جانتا ہے.. آپ نے جگجیت سنگھ کا وہ گیت نہیں سنا.. ڈھائی دن نہ جوانی چلدی.. تے کُڑتی ململ دی.. سنا ہے؟''

''بالکل سنا ہے اور متعدد بار سنا ہے۔''

''تارڑ جی.. وہ گیت آپ کے اس پجاری نے لکھا ہے.. سناؤں؟''

اس سے پیشتر کہ میں کچھ کہتا، ان صاحب نے یہ گیت الاپنا شروع کر دیا اور پس منظر میں جو شور شرابہ تھا، وہ مزید شراب ہو گیا.. اور گیت کے درمیان رُک کر وہ مجھ سے مخاطب ہوتے.. اوئے تارڑ جی ڈھائی دن نہ جوانی چلدی.. تو اڈھے کول کُڑتی ململ دی ہے کہ نہیں.. نہیں تو میں پہنچا دوں..

مجھے افسوس ہے کہ میں اس شب اس عظیم گیت نگار کے درشن نہ کر سکا اور اپنی سٹڈی میں ہی قید رہا..

بہر حال یہ قصہ ململ کی کُرتی یہاں تمام ہوتا ہے اور وہ لمحہ آتا ہے جب میں نے چنگیزی کے دفتر میں بیٹھے ہوئے پوچھا کہ.. بیس کیمپ نہ جائیں تو کہاں جائیں؟

''آپ جانتے ہیں کہ 93 تک کے ٹو بیس کیمپ اور کنکورڈیا جانے والے کوہ نورد وہاں پہنچ کر واپس الٹے قدموں اسی راستے سے لوٹ جاتے تھے.. اسی گورے، اردوکس اور پائیو اور کوروفون سے واپس اسکولے جاتے تھے.. لیکن پھر ایک نیا راستہ دریافت ہو گیا.. کے ٹو بیس کیمپ سے کوہ نورد اب مشابرم گلیشیئر کو کراس کرتے ہیں.. درہ گندہ گورو کو عبور کرتے ہیں اور ہوشے میں آ نکلتے ہیں تو آپ جائیں گندو گورو.. جسے گورا لوگ گانڈو گورو بولتے ہیں.''

''کیا گندا مندا سا نام ہے جناب عالی.'' میاں صاحب پھر بولے اور بڑی مشکل سے بولے کیونکہ سکردو روڈ کے ڈر سے ان کا جو کچھ بول رہا تھا، وہ بند ہو چکا تھا..

''آپ اسے انگریزی میں نہ بولیں.'' سلمان نے صلاح دی۔ ''اردو میں ذرا تمیز سے بولیں..''

''ہوشے سے گندو گورو بیس کیمپ تین دن کی مسافت پر ہے.... راستے میں ژل سنگ پا ہے جس کا مطلب ہے پھولوں کا کھیت.. بیس کیمپ سے آپ ہائی کیمپ جائیں گے اور پھر وہاں سے آپ اٹھارہ ہزار فٹ بلند گندو گورو کی شاندار چوٹی فتح کریں گے۔''

''یعنی میں بھی فتح کر لوں گا.. اس عمر میں؟''

''ہاں.. اسے کسی بھی عمر میں فتح کیا جا سکتا ہے.. ستر برس کے گورے بھی اس کے اوپر پہنچ جاتے ہیں۔ آپ کی عمر تو ایک دو برس کم ہی ہو گی.''

''کیسے.. جلدی سے بتاؤ کہ کیسے؟''

''آپ ہائی کیمپ سے رات بارہ بجے نکلیں گے اور اوپر چڑھنا شروع کر دیں گے۔ ٹارچوں کی روشنی میں.. برف ابھی سخت ہو گی اور آپ کے بوٹوں کے ساتھ کریمپون ہوں گے تو آسانی سے چلیں گے۔ تقریباً پانچ بجے آپ چوٹی کے دامن میں پہنچ جائیں گے اور جب آپ سر اٹھا کر اوپر دیکھیں گے تو آپ گھبرا جائیں گے کہ وہاں چوٹی تک ایک برف کی سیدھی دیوار بلند ہوتی ہے لیکن گھبرانے کی کوئی بات نہیں، وہاں ہوشے کے کچھ ہائی پورٹر مستقل طور پر قیام پذیر ہیں

اور انہیں RESCUE ٹیم کہا جاتا ہے۔ انہوں نے چوٹی تک رسے باندھ رکھے ہیں۔ وہ فی کوہ نورد تین سو روپے چارج کریں گے اور پھر آپ ان پورٹروں کی مدد سے رسوں سے لٹکتے برف کی دیوار پر چڑھتے صبح چھ بجے کے قریب چوٹی پر پہنچ جائیں گے۔"

"اور اگر رسہ ہاتھ سے چھوٹ جائے تو کیا ہوتا ہے؟"

"وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے صاحب.. لیکن اُدھر چوٹی پر پہنچتے ہیں تو صاحب وہاں سے کیا منظر ہے.."

"کیا منظر ہے؟" عامر نے پُراشتیاق ہو کر پوچھا۔

"وہاں سورج نکل رہا ہوتا ہے اور آپ کے نیچے سے کہیں برفوں میں سے طلوع ہو رہا ہوتا ہے.. اور اس لمحے چوغولیزا، مشابرم اور کے ٹو نظر کے سامنے ہوں گی.."

"یعنی نظر کے سامنے جگر کے پار" سلمان چہکنے لگا..

"ہاں جی.. آپ کچھ دیر ٹھہریے.. تصویریں اُتاریے.. لیکن زیادہ دیر نہیں کیونکہ نیچے کوہ نوردوں کی ایک لائن لگی ہوتی ہے کہ آپ اتریں تو وہ اوپر جائیں.. تو آپ انہی رسوں کو تھام کر نیچے آ جائیں گے.. دیر کریں گے تو برف نرم ہو جائے گی۔"

ایک باقاعدہ اور یورپ کی سب سے بلند چوٹی ماؤنٹ بلانک سے بھی دو ہزار فٹ مزید بلند چوٹی کو فتح کرنے کے امکان نے میری ٹیم کے تنِ مردہ میں ایک نئی تحور اور ایڈوینچر سی روح پھونک دی... وہ بے حد ایکسائٹڈ ہو کر ان مینڈکوں کی طرح ٹرانے لگے جو ایک طویل خشک سالی کے بعد بارش کی پہلی بوچھاڑ میں بھیگتے ہی پھر سے زندہ ہو جاتے ہیں اور ٹرا ٹرا کر جینا وبال کر دیتے ہیں..

"دفع کریں جی مشابرم کو.. چوٹی فتح کریں۔"

"سر یہ جو باہر کے لوگ ہیں ناں، ہمارے قبیلے سے باہر کے لوگ.. تو یہ ہم سے ہمیشہ پوچھتے ہیں کہ تم جو پہاڑوں پر جاتے ہو تو وہاں جا کر نانگا پربت اور کے ٹو پر کیوں نہیں چڑھ جاتے.. انہیں فتح کیوں نہیں کرتے.. انہیں تو معلوم نہیں کہ کوہ نوردی اور کوہ پیمائی میں فرق ہوتا ہے تو ایسے لوگوں کا منہ ہمیشہ کے لیے بند کرنے کے لیے یہ گولڈن چانس ہے.. ہم اس.. کیا نام بتایا ہے چوٹی کا.. جو کچھ بھی ہے تو ہم اس پر چڑھ ہی جائیں.. واپسی پر بیان دے دیں گے کہ کے ٹو پر چڑھ کر آئے ہیں۔"

"ویسے مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن.." میاں صاحب پھر بولے۔ "چوٹی کا نام ذرا فحش ہے.. اب یہ چنگیزی کا آدمی اسے بار بار گانڈوگورو کہہ رہا تھا.."

"میاں صاحب آپ مہربانی کر کے بھاٹی گیٹ لاہور سے نکل کر بلتستان میں آ جائیے پلیز.. ہر تہذیب اور ہر زبان کی صدائیں اور لہجے الگ الگ ہوتے ہیں.." میں نے لیڈر کی حیثیت سے انہیں ڈانٹا۔ اگرچہ میں بھی نام کے بارے میں ذرا فکرمند تھا.. چوٹی کا نام کچھ اور ہوتا تو ذرا بہتر ہوتا..

"مائی لیڈر.." اور یہ واہیات طرزِ تکلم شاہد کا ہی ہو سکتا تھا جس نے اپنا سیاہ جاسوسی چشمہ ایک مدت کے بعد آنکھوں سے الگ کیا اور چندھیائی ہوئی فلسفیانہ نظروں سے سب کو دیکھتے.. بلکہ شاید نہ دیکھتے ہوئے بولا۔ "میرے رُک سیک میں اتفاق سے ایک پاکستانی پرچم موجود ہے جو میں گندوگورو کی چوٹی پر لہرا کر پاکستان اور اسلام کا نام روشن کروں گا.. ایک مدت سے پاکستان اور اسلام کا نام روشن کرنے کی ایک خواہش دیرینہ و پارینہ میرے اندر موجیں مار رہی تھی.. مائی لیڈر... چڑھ جائیں چوٹی پر.."

یہ "چڑھ جائیں چوٹی پر" اس نے "چڑھ جائیں سولی پر" کے انداز میں کہا تھا۔

کم گو اور شدید مجبوری کے تحت بات کرنے والا برمانی بھی بولا "سائیں آپ تو جانتے ہو کہ میرے خیالات میں کج روی بہت ہے.. میں تو لیلے پیکٹ پیک کو بھی دولہن کے روپ میں خوابوں میں دیکھتا ہوں اور صبح شرمندہ ہوتا ہوں تو ایک بلند برفانی چوٹی پر چڑھنا میرا خواب ہے.. مجھے چڑھ جانے دیں۔"

میں نے پہلے اپنے آپ کو دیکھا.. اس طرح دیکھا جیسے باتھ روم کے قدِ آدم شیشے میں نہانے سے پیشتر اپنے آپ کو دیکھتا ہوں اور جو کچھ میں نے دیکھا، اسے پسند نہ کیا اور پھر سلمان کے تن و توش پر نظر کی... ہمارا مشترکہ نہ سہی الگ الگ بوجھ بھی اتنا تھا کہ اول تو وہ برف کی دیوار میں نصب رسے ہمیں سہار نہیں سکتے تھے اور اگر ہم گرتے پڑتے چوٹی پر پہنچ جاتے تھے تو پوری چوٹی ہمارے وزن سے مسمار ہو سکتی تھی۔ اس کے علاوہ بلندی کے مسائل بھی تھے کہ ہم دونوں درویش بمشکل سترہ ہزار فٹ اونچائی کو بمشکل برداشت کر سکتے تھے.. اور یہ بھی بتایا گیا تھا کہ اگر اوپر چڑھتے ہوئے پھسل جاتے ہیں.. گر جاتے ہیں تو پھر گر جاتے ہیں۔" اگرچہ وہاں رسے نصب ہیں لیکن انہیں صبح کی نیم تاریکی میں برف کی دیوار کے ساتھ تھامنا اور اوپر چڑھنا تو ہم نے ہے۔ تو کیا ہم

میں اتنی ہمت ہے..اور ہمارے پاس آئس ایکس نہیں..کریمپون نہیں جن کے بغیر ہم چوٹی تک نہیں جاسکتے..''میں نے احتیاط کا طبل آہستہ آہستہ بجایا..

''تارڑ صاحب یہ سب کچھ آپ کو ہائی کیمپ میں مل جائے گا..''چنگیزی کا اسسٹنٹ ہمیں گندوگورو کی چوٹی پر پہنچانے پر تلا ہوا تھا۔شائد کہیں شرط لگا کر آیا تھا کہ میں تارڑ کو کیفرکردار تک پہنچا کر رہوں گا..''ویسے کیا آپ نے کبھی کوئی چوٹی سر کی ہے؟''

''برفانی چوٹی تو نہیں..''

''تو پھر آپ نہیں جانتے کہ پچھلے بیس برسوں کی کوہ نوردی ایک طرف اور..کسی بلند قراقری چوٹی پر ایک قدم رکھنا..ایک طرف..''

''یہ تو مرنے کے سامان لگتے ہیں..''

''سر جی..موت کا ایک دن معین ہے....اور آپ تو عمر کے اس حصے میں ہیں جہاں اس کا آنا جانا لگا رہتا ہے..چلتے ہیں سر..دیکھا جائے گا..''یہ بیان جانے کس ناہنجار نے دیا تھا مجھے یاد نہیں..کیونکہ پوری ٹیم سرخوشی کی برفانی مسرت سے سرشار تھی۔چنانچہ آزادی جمہور کا زمانہ آ گیا تھا..مشاہرم بیس کیمپ کا سفر ترک کر دیا گیا اور گندوگورو کو منزل بنا لیا گیا...البتہ میں نے ایک شرط رکھ دی۔''ہم گندوگورو کے بیس کیمپ پہنچ کر یہ فیصلہ کریں گے کہ کیا ہم نے وہاں سے ہائی کیمپ اور پھر چوٹی تک جانا ہے یا نہیں۔''

''کیوں نہیں جانا مائی لیڈر..چوٹی وہاں سامنے موجود ہو اور ہم نہ جائیں..پاکستان اور اسلام کا پرچم اس پر نہ لہرائیں..یہ کیسے ہو سکتا ہے..''

''شاہد صاحب..برا نہ مانیے گا لیکن..''یہ سلمان تھا جو بے شک بہت فرمانبردار بچہ تھا لیکن بہت بدتمیز بچہ بھی تھا..اس کا قصور نہ تھا..انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں جس نے بھی چند برس گزارے ہوں،اس کے لیے بقیہ زندگی میں باتمیز ہونا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔''آپ اگر گندوگورو کی چوٹی پر نہ بھی پہنچے تو لاہور واپسی پر ڈیکلیئر کر دیں گے کہ پہنچ گئے تھے..جیسا کہ آپ نے کنکورڈیا سے واپسی پر اعلان فرما دیا تھا کہ ہم لوگ کے ٹو کے بیس کیمپ میں جا پہنچے اور پھر میری آنکھ سے آنسو نکلا..نکلتے ہی برف میں بدل گیا اور اس برف میں کے ٹو کی تصویر ہمیشہ کے لیے نقش ہو گئی..حالانکہ تارڑ صاحب نے ''کے ٹو کہانی''میں اقرار کیا ہے کہ آپ لوگ کے ٹو بیس کیمپ نہیں پہنچے تھے..''

''اے نادان بھالو...''شاہد صاحب نے نہایت الفت سے سلمان کو دیکھا۔''تم ابھی

بچے ہو..تمہارا تو صرف ابھی نکاح ہوا ہے..تم آٹے دال کا بھاؤ کیا جانو..ہم سے پوچھو..جتنا عرصہ ہمیں شادی شدہ ہوئے گزرا ہے،اس کے بعد ایک فینٹسی جنم لیتی ہے..آپ کو وہ کچھ بھی نظر آنے لگتا ہے جو نظر نہیں آتا..اور اس فینٹسی میں اگر کے ٹو بیس کیمپ نہیں بھی پہنچے تو پہنچ جاتے ہیں..یہ تو تخیل کی پرواز کے کرشمے ہیں..اب یہ ہمارے لیڈر صاحب ہیں۔ایسے ایسے منظر بیان کرتے ہیں جو ہمیں تو نظر نہیں آتے..صرف انہیں نظر آتے ہیں..''

''جناب مجھے شادی شدہ ہوئے آپ سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے۔اس لیے میرے تخیل کی پرواز آپ سے بھی اونچی ہے..براہ کرم اپنی لڑائی لڑیں اور مجھے معاف رکھیں..''

''اب سمجھ آئی؟''شاہد نے فاتحانہ انداز میں سر ہلایا..

''بالکل سر..''نادان بھالو نے سر جھکا لیا۔''چلیں گوندوگورو کی چوٹی پر چلیں لیکن دھیان رکھیں کہ راستے میں کہیں میں لڑھک ہی نہ جاؤں۔''

''سکردو بے وفا ہو جاتا ہے اور چلو چلو چلو چلو...''

کے ٹو موٹل نہ صرف فُل تھا بلکہ اس کے برآمدوں میں بھی اتنے ملکی اور غیر ملکی سیاح تھے کہ کھڑے ہونے کی بھی جگہ نہ تھی..

ہم نے اگرچہ گلگت سے فون پر اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی لیکن استقبالیہ صاحب نے نہایت احترام سے عرض کیا کہ جانے وہ فون کس نے اٹینڈ کیا تھا. موٹل میں ایک کمرہ بھی خالی نہیں ہے.. بلکہ یہ جو دو گورے مجھ سے الجھ رہے ہیں، ان کی بکنگ ہونے کے باوجود ان کے لیے بھی گنجائش نہیں کیونکہ کچھ مہمان جو رخصت ہونے تھے، فلائٹ نہ ہونے کی وجہ سے رخصت نہیں ہو رہے اور کمرے خالی نہیں کر رہے.. سوری سر..

باہر ہلکی بارش شروع ہو گئی تھی اور موٹل کے ڈائننگ روم سے ایک ایسا سندھ نظر آ رہا تھا جس پر بادل اُترے ہوئے تھے اور شام کو نیم تاریک کرتے تھے... یہ منظر ہمیں خوشی دیتا اگر ہمیں رہائش مل جاتی اور اسے ہم اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھتے لیکن اب یہ ہمارے لیے اداسی اور اذیت تھا کیونکہ ہم بے گھر تھے..

ہنزہ کے ریاض صاحب جن سے ایک مدت سے آشنائی تھی، ان دنوں یہاں منیجر تھے.. میرے بچوں سے اتنا لگاؤ تھا کہ گلگت میں موٹل کے لان میں واقع سیب کے درخت پر بہ نفس نفیس چڑھ کر ان کے لیے سیب اتارا کرتے تھے.. لیکن وہ سکردو سے باہر تھے.. اندر بھی ہوتے تو شائد تب بھی مجبور ہوتے کہ موٹل ٹھسا پڑا تھا..

البتہ واپسی پر ریاض صاحب نے ساری کسر نکال دی.. نجیلو سے نکل کر ہم تھوڑی دیر کے لیے سکردو رُکے تو ہم پر باقاعدہ نچھاور ہو گئے.. ہم سب کے لیے لنچ کا بندوبست کیا اور ہر پانچ

منٹ کے بعد کہتے ''تارڑ صاحب.. آج صبح نیچے سندھ کے کنارے سیر کرتے ہوئے پورے چھ بجکر چودہ منٹ پر میں نے آپ کو بہت یاد کیا.. اپنی بدنصیبی پر تاسف کیا کہ ہائے ہائے تارڑ صاحب آئے اور میں موجود نہ تھا.. پورے چھ بجکر چودہ منٹ پر...'' پھر سر ہلاتے اور کھیرے کی ایک قاش کو چٹکی میں پکڑ کر کہتے۔ ''رزق میرے ہاتھ میں ہے تارڑ صاحب.. پورے چھ بجکر چودہ منٹ پر.. آج صبح میں نے آپ کو یاد کیا.... کے ٹو موٹل میں جو اضافے ہو رہے ہیں، ہم ان حصوں کے نام ایسی شخصیات کے نام پر رکھ رہے ہیں جنہوں نے شمال کے لیے بہت کام کیا ہو.. انشاء اللہ اگلا ونگ آپ کے نام پر ہوگا.. اور تارڑ صاحب آج صبح پورے چھ بجکر چودہ منٹ پر.. موٹل کے برآمدوں میں آپ کے ٹریکس کے بارے میں جو کارڈ اور پوسٹر وغیرہ چسپاں ہیں، کئی لوگ انہیں سوونیئر کے طور پر خریدنا چاہتے ہیں لیکن یہ تو ہماری پہچان ہیں تارڑ صاحب.. ویسے آج صبح چھ بجکر چودہ منٹ پر..''

لیکن ریاض صاحب کی یہ محبت تو ہمیں واپسی پر ملی..

ابھی تو ہم بے آسرا تھے اور ہلکی بارش ہو رہی تھی..

استقبالیہ صاحب نے یہ پیشکش بھی کی کہ آپ جھیل صدپارہ چلے جائیں وہاں دو کمرے مل جائیں گے.. لیکن اس میں کچھ سخت مقام آتے ہیں۔ اب شام ڈھلنے سے پہلے تو صدپارہ جانے کے لیے جیپوں کا بندوبست کریں.. اپنی ویگن یہیں کہیں چھوڑ دیں.. کل صبح پھر واپس سکردو آئیں.. نہیں اس میں تردد بہت تھا..

''سر آپ شیر علی کا موٹل کنکورڈیا چیک کر لیں، شائد وہاں جگہ مل جائے..''

''شیر علی تو ہمارا اپنا شیر ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا اور ہم کے ٹو موٹل سے باہر آ گئے..

لیکن کنکورڈیا موٹل میں بھی یہی حالات تھے اور شیر علی یوم آزادی کے سلسلے میں کھیلے جانے والا ایک فٹ بال میچ دیکھنے گیا ہوا تھا اور موٹل میں اُس کا ایک ''چھوٹا'' انچارج تھا جو بے حد معاون ثابت ہوا۔ ''تارڑ صاحب موٹل بالکل ہی فل ہے.. لیکن فکر نہ کریں میرے پاس ایک نامکمل کمرہ ہے، وہ حاضر ہے۔ برابر میں پولیس ریسٹ ہاؤس ہے وہاں ایک کمرے کا بندوبست ہو جائے گا.. اور اگر بارش زیادہ نہ ہو تو بے شک لان میں ٹینٹ لگا لیجیے..''

شیر نے یہ موٹل کے ٹو موٹل کے سٹائل میں دریائے سندھ کے اوپر بنایا تھا..

عجیب سکردوی شام تھی جس میں بارش کی اداسی اتری تھی اور ہم بے گھر تھے.. رات سر پر تھی..

''غرناطہ کے ایک اندھے فقیر کو دیکھ کر کسی نے کہا تھا کہ اے عورت..اس فقیر کو خیرات دو کہ غرناطہ ایسے خوبصورت شہر میں ہونا اور اندھا ہونا..اس سے بڑی بدقسمتی کوئی نہیں.تو کسی شام سکردو میں ہونا اور سر پر چھت نہ ہونا..''

نامکمل کمرے کا باتھ روم بھی نامکمل تھا..اور کچھ بُو بھی تھی..

پولیس ریسٹ ہاؤس کا کمرہ تھا تو اطمینان بخش لیکن مجھے بے آرامی سی ہو رہی تھی..بارش کا کچھ پتہ نہ تھا کہ تیز ہو جائے،اس لیے خیمے نصب کرنا بھی دانش مندی نہ تھی..اور ہم میں ہمت بھی نہیں تھی خیمے نصب کرنے کی..

''ویسے سر...''کنکورڈیا کا چھوٹا واقعی میرے لیے فکرمند تھا۔''ایک بات بتاتا ہوں..ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ تو اپنی ویگن لے کر آئے ہو تو آپ خپلو کیوں نہیں چلے جاتے۔ اُدھر تو نیا موٹل بنا ہے اور زبردست ہے..اور خالی ہے..''

میں نے اس نئے موٹل کی تعریف سن رکھی تھی..لیکن خپلو؟.....

''آٹھ بج رہے ہیں اور رات ہو چکی ہے تو..لیکن کیا ہماری ویگن خپلو جا سکتی ہے؟رات کو اس روڈ پر ٹریفک چلتا ہے؟''

''اُدھر تو اب ٹریلر اور فوجی ٹرک بھی جاتا ہے سر..اُدھر نہیں جائے گا تو اور کدھر جائے گا..سیاچن کا راستہ ہے ناں..اُدھر تو دنیا کا ٹریفک چلتا ہے۔''

''کیوں حکیم؟''میں نے باہر آ کر حکیم سے رجوع کیا جو بار بار اپنا ازار بند اُڑستا پہلی بار سکردو کی رات میں بہتے سندھ کو حیرت سے تکتا تھا۔''خپلو چلیں۔''

''ہیں؟''وہ چونک گیا۔''کدھر چلیں؟''

''خپلو..''

''یہ کوئی اور ہوٹل ہے؟''

''نہیں۔یہاں سے ڈھائی گھنٹے کی مسافت پر ایک وادی ہے..راستہ تقریباً میدانی ہے اور روڈ پر ٹرک بھی چلتے ہیں..یہاں تو رات گزارنے کے لیے کوئی بندوبست نہیں ہو رہا تو وہاں چلیں؟تم تھک تو نہیں گئے؟''

''تھک گیا ہوں..''اس نے فوراً ڈکلیئر کر دیا۔''سکردو روڈ بہت کُتا روڈ ہے سر...بہت تھک گیا ہوں۔''

''حکیم تھک گیا ہے؟''عامر کے اندر خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔''تارڑ صاحب تھکے ہوئے ڈرائیور کو کبھی مزید ڈرائیونگ کے لیے مجبور نہیں کرنا چاہیے..ٹھیک ہے حکیم تم تھک گئے ہو تو نہیں جاتے،آرام کرو..''

''یہ تو آرام کرے عامر لیکن ہم کہاں آرام کریں..''

''ہاں یہ مسئلہ بھی قابلِ غور ہے۔''

''حکیم..''میں نے لاہور سے چلنے کے بعد پہلی بار ویگن کے لیے ادا کیے جانے والے مبلغ ڈھائی ہزار روپے روزانہ..چاہے وہ ایک ہی مقام پر ہفتہ بھر کھڑی رہے،پھر بھی ڈھائی ہزار روپے روزانہ..پلس ڈیزل کا خرچہ،پلس ڈرائیور کے روٹی،پانی اور رہائش کا خرچہ..ان سب خرچوں کے خرچ کرنے والے کو جتنا حق ملنا چاہیے،اس کا مطالبہ کر دیا اور آرڈر دے دیا کہ..حکیم راستہ آسان ہے..خپلو چلنا ہے..چلو!

حکیم نے جس ڈھکی چھپی بدتمیزی اور بیزاری کا مظاہرہ کیا،وہ قابلِ دید تھا۔''یہ جو خپلو ہے..اور سیاچن کی طرف ہے تو راستے میں برف ہی برف ہے؟''

''نہیں..سیدھا اور سوکھا راستہ ہے..صراطِ مستقیم ہے..بچے بچے چلے چلو..چلو۔''

میں اس سے پیشتر دو مرتبہ خپلو..یعنی خپلو جا چکا تھا..پہلی بار نظامی اور مطیع نجومی کے ہمراہ اور دوسری مرتبہ اپنے خاندان کے ساتھ..اور راستے میں کیسے کیسے سنہری گاؤں آتے تھے جہاں دو منزلہ چوبی گھر اور گندم کے پکے ہوئے گولڈن فیلڈز تھے..وہ مقام تھا جہاں تبت سے آنے والا شیر دریا..اس سے بڑے دریا شیوک کو اپنی آغوش میں لے کر مدغم کر لیتا تھا..

''بھگت کبیرا اور میرا بائی خپلو کے موٹل میں''

ہم گئی رات خپلو پہنچے..

راستے میں حکیم کو محظوظ کرتے رہے.. سکھوں کے لطیفے سناتے رہے۔ اس کی خوشامد اس طرح کرتے رہے جیسے وہ کوئی فوجی حکمران ہو.. اس کی بے مثل ڈرائیونگ اور نشیلی آنکھوں کی تعریف کرتے رہے تاکہ.. وہ اونگھ نہ جائے.. ہمیں انڈس کے حوالے نہ کردے..

خپلو پہنچے اور پی ٹی ڈی سی کے نئے موٹل میں داخل ہوئے.. تو ششدر رہ گئے.. سناٹے میں آگئے..

خپلو جہاں کچھ عرصہ پہلے تک باہر سے آنے والوں کے لیے ایک دو کمروں کا پرانا ریسٹ ہاؤس تھا، اوپر بازار میں بوسیدہ اور حشرات الارض سے رینگتے چند گندے کمبل اور کچے فرشوں کے ایک دو ہوٹل تھے، وہاں اُسی خپلو میں ایک تاج محل تھا.. جدید فن تعمیر مگر مقامی روایت سے جڑا ہوا ایک ایسا عجوبہ تھا کہ ہم ششدر رہ گئے..

لیکن انعام صاحب.. جو اس موٹل کے منیجر تھے اور میرے قدیمی دوستوں میں سے تھے اور میں انہیں ان کی سادگی اور ہمدرد خصلت کی وجہ سے قدرت کا انعام کہا کرتا تھا.. وہ وہاں نہیں تھے.. مجھے بشام میں ہی اطلاع مل گئی تھی کہ انعام کے بال بچے گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کے لیے ان کے پاس خپلو آئے تھے.. وہ اسلام آباد واپس جانے کے لیے سکردو سے ایک نئی اور قابلِ اعتماد ایئر کنڈیشنڈ بس میں سوار ہوئے اور مانسہرہ کے قریب اس بس کا ڈرائیور اونگھ گیا.. حادثے میں انعام کی اہلیہ ہلاک ہو گئیں اور بیٹے شدید زخمی ہو گئے.. انعام اپنی اہلیہ کو دفن کرنے کے لیے اور ہسپتال میں پڑے اپنے بیٹوں کی دیکھ بھال کے لیے وطن جا چکے تھے.. خپلو میں نہیں

تھے.. بشام سے یہاں خپلو تک میں سوچتا رہا تھا کہ انعام ایسے نفیس شخص کو یہ کیا انعام ملا.. لیکن اس کی رضا کے آگے سر جھکانے کے علاوہ کیا کیا جا سکتا ہے..

انعام کے اسسٹنٹ ارشاد موٹل کے معاملات کی نگہبانی کر رہے تھے..

ریسپشن ہال میں خپلو میں تعینات ایک کرنل صاحب کے شہری بچے.. غالباً اسلام آبادی بچے بوریت کے شدید عالم میں.. بیزاری کی ایک لاجواب کیفیت میں.. کہ ایک شہری بچے کو اگر زبردستی پدرانہ شفقت کے زور پر خپلو ایسی دور افتادہ وادی میں امپورٹ کر لیا جائے تو اس کا یہی حال ہوگا.. یہ بچے صوفوں پر نیم دراز ریموٹ ہاتھ میں لیے ٹیلی ویژن کے چینلز بدلتے تھے اور والد صاحب کو ناراض نظروں سے دیکھتے تھے.. کرنل صاحب ہمیں دیکھ کر نہایت خوش ہوئے، بے شک کرنل تھے لیکن بچے تھے اور باہر کی دنیا سے آنے والوں سے مل کر خوش ہوئے..

موٹل دریائے شیوک کے کناروں پر ایک شالیمار کی مانند تختہ بہ تختہ اٹھتا تھا اور سب سے اوپر والے تختے پر ہمارے کمرے تھے.. ہم ان شاندار کمروں کی بلند چھتوں اور لکڑی کے بھاری شہتیروں اور آہنی گرفت والی چھتوں کے نئے نویلے کنوارپن کی مہک والے کمروں میں داخل ہوئے تو سکردو روڈ کے خوف اور سکردو شہر کے ایک چھت سے انکار اور پھر وہاں سے رات کی سیاہی میں جو ایک طویل تھکاوٹ کا سفر تھا، اسے بھول بھال گئے..

جیسے کے ٹو کی چوٹی پر پہنچ جانے والا کوہ پیما... برس ہا برس کی ٹریننگ کی مشقت.. اپنے ملک سے اسلام آباد، پھر سکردو.. پھر اشکولے.. پائیو.. اردوکس، گورے، کنکورڈیا.. بیس کیمپ سے اوپر جو برفانی موتیں ہیں اور بلندی پر جو سانس اکھڑتا ہے اور کبھی اپاہج کر دیتا ہے اور کبھی کسی دراڑ میں دھکیل دیتا ہے اور اس کا نام ''گلگی میموریل'' کی چٹان پر کسی سلور کی تھالی پر کھود کر اس کا کتبہ لگا دیا جاتا ہے تو وہ اگر کے ٹو کے چوٹی پر پہنچ جاتا ہے تو یہ سب کچھ بھول بھال جاتا ہے..

ایسے ہم بھی بھول بھال گئے..

جیسے برفوں میں منجمد کسی پرندے کو آگ کے سامنے رکھنے سے اس میں جان پڑنی شروع ہو جاتی ہے۔ ایسے ہم بھی زندہ ہونے لگے اور چہکنے لگے..

''یہاں تو جشن ہونا چاہیے تارڑ صاحب'' حسن صاحب شرماتے ہوئے بولے کہ وہ برمانی کے ہمراہ میرے ہم کمرہ تھے..

''حسن جی.. ہم آج سویرے گلگت سے چلے تھے.. یقین تو نہیں آتا کہ گلگت سے چلے

تھے.. تقریباً چندرہ گھنٹے ہو گئے ہیں مسلسل سفر کرتے.. تو آپ تھکے نہیں.. سونہ جائیں؟"

"سر جی.. سو گئے تو گئے.. ذرا تھکاوٹ اتارتے ہیں.. کچن سے روسٹ چکن اور چپس منگواتے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ میرا معدہ کمزور ہے.. میں مقامی پانی نہیں پی سکتا تو لاہور سے لایا ہوا منرل واٹر پیتے ہیں اور باتیں کرتے ہیں.."

"تارڑ صاحب اس بلوچ کی بھی کوئی گزارش سن لیں۔" برمانی جیسے ایک ریچھ کی مانند اپنی سرمائی نیند سے بیدار ہوا.. حسب عادت سرگوشیوں میں گویا ہوا۔ "مشورہ نہیں.. محض گزارش ہے.. یہ جو ہوشے ہے اور گندو گورو وغیرہ ہے سائیں تو اس کو فراموش کر دیں.. ہمیں اسی موٹل میں چند روز قیام کرتے ہیں.. اس کے شالیمار تختوں میں آپ کے پسندیدہ زرد پھول کھلے ہیں اور سائیں سرد ہوا میں جھومتے جاتے ہیں.. اور ذرا کمرے کی بالکونی میں جا کر دریائے شیوک کے نظارے دیکھئے اور اس کے پار پہاڑوں کی برفوں میں دھیرے دھیرے حرکت کرتے بادل دیکھئے.. ہمیں اور کیا چاہیے.."

"برمانی۔ تمہیں رات کے اس پہر.. بلکہ آدھی رات کے سمے دریا پار برفوں میں دھیرے دھیرے حرکت کرتے بادل کیسے نظر آ گئے.."

"سائیں میں پہلی بار آپ کی ٹیم میں شامل ہوا ہوں.. اور میں نے نوٹ کیا ہے کہ آپ وہ کچھ بھی دیکھتے ہیں جو ہوتا نہیں.. تو سائیں آپ کا شاگرد ہوں، مجھے بھی اس بالکونی کے پار وہ کچھ نظر آ رہا ہے جو پتہ نہیں ہے کہ نہیں.. ہم بلوچ یوں بھی ویرانوں اور صحراؤں کے باسی ہونے کے ناطے سے بادلوں اور برفوں کے خواب دیکھتے رہتے ہیں۔"

"برمانی میں تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں.... کسی بھی مقام پر پہنچ کر ہم وہی کچھ دیکھتے ہیں جو ہم دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ وہاں ہے یا نہیں، اس سے ہمیں کوئی غرض نہیں ہوتی کہ ہم خود غرض لوگ ہوتے ہیں.. ساری آبشاریں، فیری میڈو، جھیلیں، جھرنے اور بلندیاں ہمارے اندر ہوتے ہیں.. ہم گھر سے نکل کر اگر بے گھر ہوتے ہیں تو محض ان کے فوٹو سٹیٹ تلاش کرنے کے لیے.."

"بھگت کبیر کے دوہے بھی یہی کہتے ہیں اور میرا بائی کے بھجن بھی یہی سرگوشی کرتے ہیں کہ جو کچھ ہے، وہ تمہارے اندر ہے.."

"یہ بھگت کبیر اور میرا بائی خپلو میں کہاں سے آ گئے برمانی.."

"یہ تو ہمیشہ سے یہاں ہیں سائیں.. مرشد آپ نے خود ہی تو ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ

ایک آوارہ گرد یہ جان جاتا ہے.. اس کو اس بات کا عرفان ہو جاتا ہے کہ اس کا سچ ہی آخری سچ نہیں ہے.. اس کا عقیدہ اور تاریخ ہی واحد سچائی نہیں.. اور بھی سچ ہیں.. تو بھگت کبیر اور میرا بائی بھی سچ ہیں اور خپلو میں ہیں.." برمانی اپنی سیاہ آنکھوں کے ساتھ ہنسنے لگا اور اس کی ہنسی میں ایک ہتھیار رکھوا لینے والی معصومیت تھی..

ایک اور معصومیت حسن کے چہرے پر تھی...

اگرچہ ہمارے وحشی، بے مہار جذبے تبھی تسکین پاتے تھے جب ہم راستوں اور آبادیوں کو چھوڑ کر پہاڑوں کے اندر اپنے قدموں پر سفر کرتے تھے لیکن.. وہاں تک پہنچنے میں جو منزلیں آتی تھیں.. بشام، گلگت اور آج خپلو ان میں بسر کی ہوئی شامیں بھی ایک انتخاب تھیں.. ایسی شامیں بھی نصیب والوں کے نصیب میں ہوتی ہیں۔ خپلو کی رات میں کمرے کی بالکونی کے پار... ایک چپ تاریک بہاؤ میں گم شیوک کے پار.. مگر برمانی کو برفپوش بلندیوں کے گرد بادل نظر آ رہے تھے تو یہ اس کا استحقاق تھا کہ وہ.. وہ کچھ دیکھ سکتا تھا جو وہاں نہ تھا..

اور میں.. وہاں وہ کچھ بھی نہیں دیکھ رہا تھا جو.. وہاں تھا..

ہاں یہ ہوا کہ دریائے شیوک کے بہاؤ کی آواز رات گزرنے سے بلند ہوتی گئی..

ہمارے کمرے پر دستک دینے لگی..

کہ اب تو سو جاؤ..

ہم شیوک کو کیسے انکار کرتے..

ہم سو گئے۔

"وہ ڈاکخانہ جہاں سے میرے لیے ایک خط پوسٹ ہوا تھا"

سلمان نے خپلو کے بازار سے ہوشے جانے کے لیے ایک جیپ ہائر کر لی تھی..

لیکن ہوشے تک کے لیے نہیں، کاندے کے گاؤں تک.. اس لیے کہ اس سے آگے کاندے نالے کا پل سیلاب سے بہہ چکا تھا.. ہوشے تک براہ راست جیپ نہیں جا سکتی تھی.. اور شنید تھی کہ اس نالے کے اوپر مقامی لوگوں نے چند شہتیر رکھ دیے ہیں جنہیں پار کرنے پر دوسرے کنارے پر ہوشے کے لیے جیپیں میسر ہو سکتی تھیں..

ہم آج چقچن مسجد کی زیارت کر چکے تھے..

اس بلتستان کی سب سے قدیم تقریباً چھ سو برس پرانی چٹانوں پر ایک گھونسلے کی مانند براجمان مسجد میں گیان دھیان کے لیے ایک ایسی کوٹھڑی تھی جس میں کئی برس پیشتر میں نے دنیا کو ترک کر دینے کی آرزو کی تھی.. محض رومانوی ہو کر کہ ہم دنیا دار لوگوں کی آرزو میں بھی کھوٹ ہوتا ہے۔

ہمیں کاندے سے جانے والی جیپ سے دو بجے موٹل کے صحن میں پہنچنا تھا.. ابھی کچھ وقت تھا..

اتنا وقت تھا کہ میں اوپر خپلو کے بازار میں چند لمحے گزار سکتا..

خپلو کی طرح خپلو کا بازار بھی بدل چکا تھا..

میرے ذہن میں جو تصویر تھی، اس میں ایک بلند کوہستانی بستی کی ڈھلوان پر چند کچی پکی دکانیں تھیں اور ان پر بادل اترے ہوئے تھے.. وہاں کے باسی ایک اجنبی کو دیکھ کر ٹھہر جاتے تھے.. ہوا بے حد سرد تھی.. چونکہ اوپر بازار تک کوئی باقاعدہ سڑک نہیں تھی اس لیے بہت کم لوگ اوپر

جاتے۔ کبھی کوئی جیپ نیچے شیوک کے کناروں سے اوپر آ جاتی.... بلکہ ایک بڑا نالہ جو شیوک میں گرتا تھا، رات کے وقت جب تیز ہو جاتا تو اس کے پانی سڑک پر اتنی تندی سے بہتے کہ ریسٹ ہاؤس اور اوپر خپلو کے بازار کے درمیان رابطہ منقطع ہو جاتا..

خپلو کا وہ بازار پرانے قصے کہانیوں میں گمشدہ ایک خواب سا بازار تھا.. اور یہ بازار جس میں میں آ نکلا تھا.. اسے میں قطعی طور پر نہیں پہچانتا تھا.. کوئی ایک دکان کوئی ایک عمارت ایسی نہ تھی جو شناسا لگتی ہو.. یہاں تک کہ جو پس منظر میرے ذہن میں تھا، وہاں اس سے الگ ہی کوئی منظر تھا.. دکانوں کی لمبی قطاریں تھیں۔ جیپیں دندناتی پھرتی تھیں... بے شمار لوگ تھے.. یہاں تک کہ ٹریفک پولیس بھی تھی..

مجھے صرف اپنے ڈاکخانے کی فکر تھی..

یہ ڈاکخانہ میں نے بہت دنوں سے اپنے اندر کھول رکھا تھا.. جوانی میں انسان اداسی اور رومان کی ایک غیر حقیقی فضا میں تنہا ہونا چاہتا ہے۔ یونہی اپنے آپ پر ترس کھانے کے لیے کہ کوئی مجھ سے پیار نہیں کرتا۔ سب لوگ میرے خلاف ہیں اور کڑھتا رہتا ہے.. عمر ڈھلتی ہے تو وہ بہت سے احساسات اور رشتوں سے الگ ہوتا جاتا ہے.. بیزار اور چڑچڑا ہو جاتا ہے اور یوں تنہا ہونا چاہتا ہے.. اس دوسری قسم کی تنہائی کے لیے ایک ذاتی ڈاکخانہ بے حد کارآمد ثابت ہوتا ہے.. آپ سب سے کٹ کر اس میں ایک پرانے بنچ پر بیٹھ جاتے ہیں اور پوسٹ کارڈوں اور لفافوں پر مہریں لگانے لگتے ہیں.. ان پوسٹ کارڈوں اور لفافوں میں آپ کی حسرتوں اور محبتوں کی تحریریں ہوتی ہیں..

اس لیے مجھے اپنے ڈاکخانے کی بہت فکر تھی۔

میں نے اس ڈاکخانے کو خپلو سے پہلی ملاقات کے دوران دریافت کیا تھا.. شیوک سے بلند وادی کی ڈھلوان پر بازار کی جو چند کچی دکانیں تھیں، وہاں ایک نیچی چھت کی بوسیدہ شہتیروں والی ایک کوٹھڑی تھی جس کے باہر سردہوا میں ہاتھ سے لکھا ہوا ایک بورڈ جھولتا تھا جس پر "ڈاکخانہ خپلو" کی عبارت تھی۔ اس کی چوکھٹ کے اندر جاتے ہوئے ذرا جھکنا پڑتا تھا اور اندر نیم تاریک سردی میں ایک ٹوٹا ہوا بنچ تھا ایک چھوٹا سا کاؤنٹر تھا.. ایک سالخوردہ آہنی جنگلے کے عقب میں ایک بجھتی بوڑھا نہایت دھیرج اور اطمینان سے چند پوسٹ کارڈوں پر مہریں لگا رہا تھا.. وہ ایک پوسٹ کارڈ پر مہر لگاتا اور پھر اسے بہت غور سے دیکھ کر اطمینان کر لیتا کہ مہر پر

تاریخ اور ڈاکخانہ خپلو کے الفاظ واضح ہیں یا نہیں.. اگر اس کی تسلی نہ ہوتی تو وہ ایک اور مہر نہایت احتیاط سے اس پر ثبت کر دیتا..

اس پوسٹ ماسٹر کے چہرے پر جو اطمینان تھا.. وہ ایک ایسے شخص کا تھا جو زندگی سے بے حد مطمئن ہو..

شاید وہ یہیں پیدا ہوا تھا.. یہیں رہتا تھا.. آج تک اس چوکھٹ سے باہر نہیں گیا۔ ایسا لگتا تھا..

''دن میں کتنے خط آتے ہیں؟''

''صاحب کبھی کبھار تو بیس پچیس آ جاتے ہیں.. ایک دو منی آرڈر بھی آتے ہیں۔''

''آپ ٹکٹیں بھی فروخت کرتے ہیں؟''

''ہاں صاحب.. لفافے۔ پوسٹ کارڈ اور رجسٹری کے لفافے بھی.. ڈاکخانہ ہے۔''

''کوئی ڈاکیہ بھی ہے؟''

''ہاں ناں.. میں خود ہی ڈاکیہ ہوں.. یہاں سے فارغ ہو کر ڈاک بانٹتا ہوں لیکن جانے سے پہلے ڈاکخانے کو تالہ ضرور لگاتا ہوں.. لوگ ہنستے ہیں کہ ایسا کیوں کرتے ہو بلتستان میں تو چوری چکاری کا رواج نہیں.. اس لیے تالے بھی کم فروخت ہوتے ہیں تو میں کہتا ہوں، تم نہیں سمجھ سکتے یہ گورنمنٹ کا مال ہے، اس کی حفاظت ضروری ہے۔''

اس کچی کوٹھڑی سے باہر جانے کو جی نہیں چاہتا تھا.. اس لمحے چقچن مسجد کی بلندیوں سے اُترنے والے بادل بازار میں سفید ہونے لگے اور ان کی ہلکی دھند ڈاکخانے میں دھیرے دھیرے داخل ہونے لگی.. کچے فرش پر پھیلنے لگی اور پوسٹ کارڈوں اور لفافوں پر درج پتوں کو گیلا کرنے لگی..

یہ ڈاکخانہ میرے اندر رہ گیا.. اسی حالت میں.. کچے فرش اور اس پر پھیلتی دھند اور تنہائی اور سکون کے ساتھ.. میرے اندر منتقل ہو گیا.. اور اگلے کتنے برس تک میں اس بجتی بوڑھے کی جگہ بیٹھ کر مہریں لگاتا رہا.. اس لیے مجھے اپنے اس ڈاکخانے کی فکر تھی..

''ادھر ڈاکخانہ کدھر ہے؟'' میں نے ایک خپلوی کو روک کر پوچھا..

''اُدھر اوپر ہے۔''

''لیکن وہ تو یہاں تھا.. اس بازار میں..''

''وہ تو پرانا ڈاکخانہ ہوا کرتا تھا صاحب.. اب تو ترقی ہو گیا ہے سیاچن کی وجہ سے.. اس کی جگہ تو نیا مارکیٹ بن گیا ہے.. اور ورکشاپ بن گیا ہے.. اوپر نیا ڈاکخانہ بنا ہے.. بالکل سکردو کے موافق... اس میں پی سی او بھی کھلا ہے.. بے شک امریکہ فون کرو.. آپ نے کہیں فون کرنا ہے؟''

''نہیں۔''

''ڈاک کا لفافہ وغیرہ بھی ادھر ملتا ہے لیکن اب خط کون لکھتا ہے صاحب.. یا فون کر لیتا ہے یا ادھر سائبر کیفے بھی ہے کمپیوٹر پر بات کر لیتا ہے.. ترقی ہو گیا ہے۔''

ہر شخص کی زندگی میں خپلو کے پرانے ڈاکخانے کے ماحول ایسا کوئی ایک گوشہ ہونا چاہیے جس میں وہ الگ ہو کر پوسٹ کارڈوں اور لفافوں پر مہریں لگا سکے.. ایک مہر میرے بدن پر یوں ثبت ہوئی جیسے گھوڑے کی پشت پر سرخ جلتے ہوئے لوہے کے ساتھ ملکیت کا نشان لگاتے ہیں اور گوشت کے جلنے کی بُو آتی ہے....

اور ہم تو پچھلے بیس برس سے لگاتار جانے کتنے برگدوں کے سائے میں بیٹھے تھے.. ان گیان دھیان میں گم رہے.. لیکن کچھ بھی نہ ملا.. کے ٹو.. پاک سرائے۔ نانگا پربت اور سنولیک ایسے عظیم برگدوں تلے دھونی رمائی.. ایسے برگد جن کی شاخیں برف کی تھیں جن کے پتوں میں جھیلیں سرد ہوتی تھیں اور جن کی شاخوں میں سرد ہوائیں شوکتی تھیں اور موت زندگی کی پہریدار تھی.. کچھ بھی نہ ملا..

راوی روڈ کی ایک ورکشاپ کے قریب میاں صاحب اپنی نشست سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ”مجھے یہاں اُتار دیں.. میرے ایک عزیز کی ورکشاپ ہے.. یہاں سے میں اپنے بیٹے کو فون کروں گا، وہ مجھے لینے آ جائے گا.. پتہ نہیں بیگم کی طبیعت کیسی ہے.. شوگر لیول کا کیا حال ہے۔“

میاں صاحب اپنا رک سیک گھسیٹتے۔ گلگت کی شاپنگ کا چینی ٹیلی ویژن اٹھاتے.. کچھ کیتلیاں اور برتن سنبھالتے اُتر گئے..

باقی رہ گئے چھ!

لاہور کی گھنی ٹریفک میں ایک ویگن پہاڑوں سے واپس آئی ہے اور اس میں ابھی کچھ موسم ٹھہرے ہوئے ہیں.. اور چھ کوہ نورد پہلو بدلتے ہیں.. گرمی ناقابلِ برداشت ہے..

”باقی رہ گئے چھ...واپسی“

ویگن راوی کے پرانے پُل پر تھی..

سب سے پرانے تو نہیں کہ وہ پل مخدوش قرار دیا جا چکا تھا اور اس پر سے صرف تانگے اور ریڑھے گزر سکتے تھے..

اس پل کے پار تختِ لاہور تھا.

ہم اس تختِ لاہور سے بیس کیمپ تک جانے کے لیے نکلے تھے اور ہو کہاں آئے؟

کیا پتہ کہاں سے ہوئے..

شہر کا شور چنگھاڑتا تھا..

ہم سہمے ہوئے بیٹھے تھے.. یقین نہ کر سکتے تھے کہ صرف دو ہفتے پیشتر اس شہر پُرشور کے باسی تھے اور یہیں سے نکلے تھے..

ایسے اذیت ناک شور میں ہم کیسے رہتے تھے.. اور اب کیسے رہیں گے۔

ہم تختِ لاہور سے نکل کر پہاڑوں کے تخت کی جانب گئے تھے اور ان کے چرنوں میں بیٹھے تھے کیونکہ بیس کیمپ پہاڑوں کے چرن ہی تو ہوتے ہیں.. ہم نے ان کو مرشد مانا تھا، ان کی مریدی اختیار کی تھی.. ان کی بیعت کی تھی..

تو کیا ہمیں نروان ملا.. کوئی انعام ملا..

نہیں نروان کبھی نہیں ملتا.. یہ تو ایک مسلسل عمل ہے.. ہر برس چرنوں تک جانا پڑتا ہے.. قدموں میں بیٹھنا پڑتا ہے.. ہر برس نئی بیعت ہوتی ہے.. بدھ بابا تو نصیب والے تھے کہ ایک بار برگد کے سائے میں ٹک کر بیٹھے رہے.. تپسیا کی اور فارغ ہو گئے..

"مچلو میں دل مچلو مچلو.. چھیڑ خوبانیوں سے چلی جائے اسد.."

ہم بہ قائمیٔ ہوشے حواس..

نہیں..

ہم بہ قائمی ہوش وحواس.. ہوشے کو جاتے تھے..

خپلو سے.. خپلو کے تاج محل موٹل سے ایک کھٹارا جیپ میں بمشکل سوار.. بلکہ میں اور حسن تو بہ آسانی سوار کہ ہم دونوں اگلی نشست پر قابض تھے اور بقیہ ممبران پچھلے حصے میں کوہ نوردی کے سامان اور رک سیکوں میں پھنسے ہوئے.. پیک ہوئے بمشکل سوار.. ہوشے کو جاتے تھے..

دریائے شیوک کے کنارے کنارے..

اس کے رواں پانیوں کی خاموشی دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ یہ ازل سے یونہی بہتے آئے ہیں.. اور یونہی بہتے چلے جائیں گے..

وادیٔ خپلو کے دامن میں بہتے اس دریا میں ایک عجیب لاپرواشاہانہ بہاؤ ہے..

یہ اس ندیا کی مانند ہے جس سے مخاطب ہو کر کہا جاتا ہے کہ.. میرے سیاں جی اُتریں گے پار ندیا دھیرے بہو.. یہ دھیرے بہتا ہے۔ آپ اس کی بہاؤ کو تادیر دیکھئے تو یہ آپ کو اپنے ساتھ بہا کر نہیں لے جاتا بلکہ آپ کے موڈ کے مطابق اپنا بہاؤ دھیما یا تیز کر لیتا ہے..

شیوک، سندھ کی مانند نہ تو آپ کو ڈراتا ہے اور نہ ہی ایک عظیم تہذیب کے دھارے کے طور پر پُرتکبر ہوتا ہے.. بس بہتا چلا جاتا ہے..

مجھے راستہ یاد آ رہا تھا.. کیونکہ میں خپلو سے ہوشے جا چکا تھا۔ اس لیے مجھے راستہ یاد آ رہا تھا کہ اب اس مختصر آبی جزیرے اور جھاڑیوں کے دوسری جانب شیوک کے پار جانے والے

مسافروں کے لیے ایک ایسی کشتی ہوگی جو ہزاروں برس پیشتر ایجاد ہوئی تھی.. ذوہ کی کھال کو.. ایک مشکیزے کی طرح.. اُس میں تو پانی بھرتے ہیں لیکن اس میں اپنے پھیپھڑوں پر زور لگا کر منہ سے ہوا بھر کر پھلا کر.. متعدد کھالوں میں ہوا بھر کر ان کھالوں کو باندھ کر ایک کشتی تیار کی جاتی ہے جس کے ڈوبنے کا کوئی امکان نہیں ہوتا.. جسے "انڈس رافٹ" کہا جاتا ہے، ایک ایسی کشتی ہوگی..

پچھلی بار میں نے اس کے ملاح سے باتیں کی تھیں جو مسافروں کا انتظار کرتا تھا.. لیکن جب ہم اس مختصر آبی جزیرے اور جھاڑیوں کے دوسری جانب گئے تو وہاں جہاں میں نے دس برس پیشتر انڈس رافٹ کو تیرتے دیکھا تھا، وہاں کچھ بھی نہ تھا.. کیا اب لوگ شیوک کے پار نہیں جاتے؟

"حسین.." میں جیپ ڈرائیور سے مخاطب ہوا جو ایک بلتی چھوکرا تھا.. وہ چپ رہا..

"حسین.." میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر ذرا بلند آواز سے کہا..

"صاحب... میں حسین نہیں ہوں، یوسف ہوں.. حسین میرا بھرا ہے اور وہ پیچھے بیٹھا ہے۔"

"سوری.. ہمیں سب بلتی ایک جیسے لگتے ہیں.. تو یوسف یہاں ہمیشہ مشکیزوں والی ایک کشتی ہوا کرتی تھی، شیوک کے پار جانے کے لیے.."

"ہاں صاحب ہمارے بچپن میں ہوتی تھی.. پھر ترقی ہو گیا۔ سیاچین کا ٹریک شروع ہو گیا تو اب ادھر پار جانے کے لیے پُل بن گیا ہے تو اس کا ضرورت نہیں ہے.."

"تو وہ ملاح اب کیا کرتے ہیں جو مشکیزوں کی کشتیاں کھے کر روزی کماتے تھے، ہزاروں برسوں سے کماتے تھے.."

"کیا پتہ صاحب.. اوپر بازار میں مزدوری کرتا ہوگا.. یا مر کھپ گیا ہوگا.."

وادیٔ خپلو کی مشکیزوں کی اس کشتی کا تذکرہ قدیم ترین سفرناموں میں بھی ملتا ہے.. یہ ہزاروں برسوں تک جب سے شیوک تھا، تب سے یہ اس کے پانیوں پر راج کرتی چلی آتی تھی.. لداخ سے آنے والے بدھ بھکشو بھی اس پر سوار ہو کر پار اترتے ہوں گے.. شاہ ہمدان نے بھی اسی پر سفر کیا ہوگا.. پار اترے ہوں گے.. یہاں تک کہ میں نے بھی دس برس پیشتر اس کے ملاح سے گفتگو کی تھی اور اب وہ کشتی وہاں نہیں تھی.. ایک قصہ پارینہ ہو گئی تھی کیونکہ.. ترقی ہو گئی تھی.. سیاچن کی جنگ کی وجہ سے..

اور تقریباً وہیں جہاں اس "انڈس رافٹ" کا گھاٹ ہوا کرتا تھا وہاں پر ایک شاندار پُل تعمیر ہو چکا تھا اور ہم اس کے پار چلے گئے۔

پار تو چلے گئے لیکن ایک ڈاکخانہ اور ایک مشکیزوں والی کشتی پیچھے رہ گئی۔۔

شیوک کے پار ہوئے، سالنگ کے گاؤں میں سے گزرے تو ہمیں کاندے کے نالے کا جو پل سیلاب میں بہہ گیا تھا، اُس کی چنتا شروع ہو گئی۔۔ کیا ہم نالے پر ایستادہ چند شہتیروں کے پل پر سے گزر جائیں گے، اگر گزر جائیں گے اور پار جائیں گے تو کیا وہاں سے ہمیں ہوشے کے لیے جیپ مل جائے گی۔۔

اس لمحے مشابرم کی برف پوشی نے ایک جھلک دکھا دی اور ہم اس کے دیدار میں محو ہو گئے کہ ہم نے اس چوٹی کے بیس کیمپ تک جانا تھا۔۔ اور پھر فوراً ہی خیال آیا کہ نہیں جانا۔ ہم نے تو سکردو میں اپنا پروگرام تبدیل کر دیا تھا اور اب ہم گندوگورو کی چوٹی پر بقول شاہد پاکستان اور اسلام کو سربلند کرنے کے لیے اُسے فتح کرنے کو جاتے تھے۔۔

سالنگ کے بعد ایک ویرانہ آیا۔ کچھ چڑھائی آئی اور پھر مچلو نظر آنے لگا۔۔

مچلو ایک عجیب وادی تھی۔ پچھلے پہر کی دھوپ میں اُٹھتی۔۔ جرمنی کے عظیم گوتھک فن تعمیر کے کلیساؤں کی مانند۔ زرد دھوپ میں اٹھتی چٹانوں کے دامن میں۔۔ شیوک سے بلندی پر ایک ہرا بھرا۔ گندم سے بھرا ایک عجیب گاؤں تھا۔ جس کی خانقاہ کا تنگ مینار اور اُس پر اٹکا ایک ستارہ دنیا کی بلند ترین چٹانوں کے پس منظر کے ساتھ ڈھلتی دھوپ کی زرد نگاہوں میں آیا ہوا ایک ایسی خوابناک تصویر تھا جو عہد موجود میں نہ تھی۔ تبت اور لداخ کے گئے زمانوں میں تھی۔۔

اسے زیادہ دیر تک دیکھنا ممکن نہ تھا۔۔

یہ خانقاہ بھی ترقی کا شکار ہو چکی تھی۔۔ اسی مقام پر ایک سینکڑوں برس پرانی خانقاہ کی عمارت تھی جسے ڈھا کر موجودہ خانقاہ کو نئی بنیادوں سے اٹھایا گیا لیکن کرم یہ کیا گیا کہ اس کا طرز تعمیر جوں کا توں رکھا گیا۔۔ اس کے باوجود مجھے اس کا نیا پن کھلتا تھا۔۔

"یوسف۔۔"

"میں حسین ہوں سر۔۔ یوسف پیچھے چلا گیا ہے آرام کرنے کے لیے۔۔"

"تو حسین۔ تم ظاہر ہے تمام بلتیوں کی مانند شیعہ ہو۔۔"

"نہیں جناب۔" اس نے احتجاج کیا۔ "میں نوربخشی ہوں۔"

"کچھ فرق ہوتا ہے؟"

"بہت فرق ہوتا ہے سر۔۔"

"مثلاً۔"

"مثلاً یہ کہ سر ہم سفر میں بھی روزے رکھتے ہیں۔۔ نمازیں ملا ملا کر نہیں پڑھتے، الگ الگ پڑھتے ہیں۔ اور ہم عبادت بہت کرتے ہیں۔۔ درویش لوگ ہوتے ہیں سر۔"

"تو کیا ایسا ممکن نہیں تھا کہ آپ لوگ مچلو کی خانقاہ کو جوں کا توں رہنے دیتے۔ ایک تاریخی یادگار کے طور پر اور نئی خانقاہ کسی اور مقام پر تعمیر کر لیتے۔۔"

"نہیں صاحب۔۔ ہمارا مذہبی لوگ۔ ملا لوگ کہتا ہے کہ خانقاہ کا مقام نہیں بدل سکتا۔۔"

مچلو کے بارے میں میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اسے دیکھ کر دل مچل مچل جاتا ہے، اس لیے اس وادی کو مچلو کہا جاتا ہے۔۔ کیونکہ مچلنے کے عمل میں ایک شور ہے۔ ایک اتھل پتھل ہے جب کہ اس وادی کو دیکھ کر انسان شانت ہو جاتا ہے۔۔

ایک پہاڑوں کے زینے سے اُترتا تہہ در تہہ گاؤں۔۔ سنہری کھیت۔ خوبانیوں کے باغ۔ خوبصورت لوگ۔ بھولے لوگ۔ نہایت قدیم تبتی بابے جیسے وادیٔ شگر میں بھی ملتے ہیں اور اسکولے میں بھی۔۔ کچھ بھٹکی ہوئی دیوانی روحیں۔۔ خوبرو لڑکیاں جن کے رخسار خوبانیوں سے بنے ہوئے تھے اور جن کی آنکھوں میں نیلے شیوک بہتے تھے۔۔ گڑیوں ایسے کھلونے بچے۔۔

ایک میری عمر کے بابا جی اپنی کمر پر گندم کا تقریباً آدھا کھیت اٹھائے۔ جھکے ہوئے مگر پھر بھی ہمیں دیکھ کر مسکرانے سے باز نہ آئے۔۔ مشقت میں جتے ہونے کے باوجود ایک مسکراہٹ اور ایک سلام عطا کر کے گزرے۔۔ خوش باش اور اپنے حال میں مست سادہ اور پیارے پیارے لوگ۔۔ شمال میں کئی وادیاں ایسی ہیں جن کے باشندوں کے چہروں پر جو خوشی اور مسرت مسلسل چھلکتی ہے، ہم تہذیب یافتہ روحوں کو اس کی سمجھ نہیں آتی۔۔ ایک انسان کے پاس ٹیوٹا یا ہونڈا نہیں ہے۔ ڈیفنس یا گلبرگ میں گھر نہیں ہے۔ گھر میں السیشن کتا نہیں ہے تو وہ انسان کیسے خوش رہ سکتا ہے۔۔ کمر پر گندم کا آدھا کھیت اٹھائے چلتا ہے۔۔ رات کے کھانے میں شاید اسے چند خوبانیاں اور ایک روٹی ملے۔۔ ایک کچی سرد کوٹھڑی میں ملے۔۔ پھر بھی وہ خوش ہو تو یقیناً فاتر العقل ہوگا۔۔ مجھے وادی کلاش کے کافروں کی بے مہار خوشی بھی سمجھ میں نہ آئی تھی۔۔

اور مجھے وادی مچلو کے مسلمانوں کی بے پایاں مسرت بھی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔۔ ہونڈا، ڈیفنس اور السیشن کے مالکوں کے چہروں پر بھی ایسی خوشی نہ ہوتی تھی۔ ایک منظم اور قبض شدہ خوشی ہوتی تھی۔۔

مچلو کے ساتھ یہ بے حد زیادتی تھی کہ ہم اس میں سے سرسری گزرتے جاتے تھے اور ایک نسبتاً خشک اور بے روح گاؤں ہوشے کی جانب صرف اس لیے جا رہے تھے کہ وہ مشابرم کے دامن میں تھا.. گندوگورو کے راستے میں تھا..

بس یہی وہ کھیل ہے جسے نصیب کہا جاتا ہے..

ایک سوہنے لوگوں کے ماتھوں پر بھاگ نہیں ہوتے اور کرموں والیاں چناب میں ڈوب جاتی ہیں اور جو شکل والی نہیں ہوتیں، وہ پار اتر جاتی ہیں.. یہی وہ کھیل ہے جسے نصیب کہا جاتا ہے۔

اگر آپ نانگا پربت کے رُوپل چہرے کے راستے میں ترشنگ کا گاؤں ہیں. فیری میڈو کے چہرے کے آغاز میں تاتو ایسی خشک اور واہیات بستی ہیں تو ہر کوئی آپ کو جانتا ہے۔ کے ٹو کی پہلی منزل ہیں تو دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ مشابرم کے سائے میں ہیں تو ہوش ربا ہوشے ہیں.. راکاپوشی کے راستے میں مناپن ہیں تو آپ کی دھوم ہے۔

لیکن.. اگر آپ پر کسی بلند اور مشہور چوٹی کا سایہ نہیں تو بے شک آپ مچلو ہی کیوں نہ ہوں، تلس، کیرس، یا چپلو بھی ہوں تو آپ کو کوئی نہیں جانتا. لوگ آپ میں سے سرسری گزر جاتے ہیں۔

ہم بھی اگرچہ سرسری گزرنے کے لیے گزرنے کو تھے لیکن ہمیں مجبوراً مچلو میں رکنا پڑا کیونکہ مخالف سمت سے آنے والی ایک جیپ کی کلچ پلیٹیں مچلو میں سے گزرنے والی کچی جیپ روڈ کے درمیان میں آ کر جواب دے گئیں اور وہ جیپ ہمارے سامنے ایک بے بس مردہ حالت میں تھمی کھڑی تھی اور ہمارا راستہ بلاک کیے ہوئے کھڑی تھی.. چنانچہ ہمیں بھی مجبوراً رکنا پڑا۔

یہ ہمارا ڈرائیور حسین تھا.. یا شاید اس کا بھائی یوسف تھا جو چپلو کے بازار میں جیپوں کا شہرۂ آفاق مکینک تھا، فوری طور پر اپنی جیپ سے اترا اور خراب شدہ جیپ کے نیچے سرک کر اس کے پیٹ کا تفصیلی معائنہ کرنے لگا..

ہم کیا کرتے.. جیپ سے اتر کر ادھر ادھر بکھر گئے..

مچلو کے کھیتوں میں کام کرتے کسان.. چھوٹے چھوٹے بچے اور بچیاں اور خواتین ہمارے اردگرد ہو گئے اور ہمیں اپنی مسکراہٹوں اور مسرتوں سے جگمگانے لگے.. یہ سب کے سب.. جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں یونہی بے وجہ خوش تھے، چہرے گلنار کیے خوش تھے.. میں نے

ایک نہایت غیر جانب دار تجزیہ نگار کی حیثیت سے درجنوں چہروں کا بغور مطالعہ کیا اور ان میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جس کا منہ لٹکا ہوا ہو.. ہماری طرح اس کی بوتھی بنی ہوئی ہو..

ایک دوشیزہ کمر پر شہتوت کی ٹہنیوں سے بنی ہوئی مخروطی ٹوکری بوجھ کئے.. جھکی ہوئی کہ ٹوکری تازہ کچی پکی خوبانیوں سے لبریز تھی، حیرت بھری اور بچوں کی معصومیت ایسی کھلی کھلی آنکھوں کے ساتھ ہماری جیپ کے قریب ذرا رکی تو حسین صاحب خواہ مخواہ شرمانے لگے..

"تارڑ صاحب میں کچھ خوبانیاں خرید لوں.. یہ لوگ مائنڈ تو نہیں کریں گے؟"

"یہ لوگ تو مائنڈ نہیں کریں گے کہ ہماری طرح بنیاد پرست نہیں ہیں اور ان کے دلوں میں بھی ہماری طرح کھوٹ نہیں ہے لیکن آپ کی بیگم نہ مائنڈ کر جائیں.."

"نہیں جی.. میں تو صرف خوبانیاں خریدنا چاہتا ہوں۔"

"پلیز گو اہیڈ.. بلکہ میں آپ کی تصویر اتارتا ہوں تا کہ سند رہے اور بھابھی کو بدگمان کیا جا سکے.."

اب صورت حال کچھ یوں ہوئی کہ حسن صاحب شرماتے ہوئے اس دوشیزہ کی جانب بڑھے.. ادھر دوشیزہ نے بھی جواباً شرمانا شروع کر دیا. مبصرین کا خیال ہے کہ اس شرماہٹ کے مقابلے میں حسن صاحب کہیں آگے نکل گئے تھے..

"حسن صاحب.." میں کیمرے کے لینز میں دیکھتا دیکھتا تھک چکا تھا. "خدا کے لیے اب خوبانیاں خرید بھی لیجیے.."

حسن صاحب نے اشاروں میں اس دوشیزہ کو بتایا اور ایک دو خوبانیاں اٹھا کر اسے سمجھایا کہ میں یہ.. خریدنا چاہتا ہوں۔

دوشیزہ کی آنکھوں کی چیریاں حیرت اور بھولپن سے بڑی ہو گئیں.. وہ ایک اتنی معصوم روح تھی.. آلودگی اور بری نظروں سے یکسر ناواقف کہ وہ ڈرتی.. اپنے رخسار مزید سرخ کرتی.. مسکراتی ہوئی کبھی سر کو جھکاتی کبھی حسن صاحب کو دیکھتی، ایک ناسمجھی کی کیفیت میں کھڑی رہی.. حسن نے اس کی جھکی کمر پر بوجھ ٹوکری میں سے خوبانیوں کی مٹھیاں بھر بھر کر اپنی پی کیپ کو بھرا اور پھر دس روپے کا ایک نوٹ قیمت کے طور پر اس کی جانب بڑھا دیا۔

وہ دوشیزہ اس نوٹ کو دیکھ کر ایسے خوفزدہ ہوئی جیسے وہ ایک زہریلا بچھو ہو جو اسے ڈس لے گا اور سہم کر پیچھے ہو گئی..

اور یاد رہے کہ مچلو کے بہت سے لوگ.. ہماری جیپ کے ارد گرد کھڑے ہوئے لوگ... بچے.. بوڑھے اور جوان اور خواتین اس خوبانی تماشے کو دیکھ رہے تھے اور خوب انجائے کر رہے تھے..

دوشیزہ سہم کر پیچھے ہو رہی تھی..

ہم سب نے مشترکہ طور پر ایک باباجی سے درخواست کی.. یہ باباجی گندم کا ایک گٹھا اٹھائے اُدھر آئے تھے اور اب ایک پیڑ تلے سستا رہے تھے.. کہ بزرگوار اس بچی سے کہو کہ خوبانیوں کی قیمت وصول کر لے..

باباجی بھی باغی نکلے اور سر ہلاتے ہوئے.. نہیں نہیں.. کہنے لگے.. اور ان کی مسکراہٹ میں کوئی کمی نہ آئی۔

"یوسف.."

"جی میں حسین ہوں.. یوسف تو خراب شدہ جیپ کے نیچے ہے۔"

"تو حسین پلیز اس لڑکی سے کہو کہ ہم ان خوبانیوں کی قیمت ادا کرنا چاہتے ہیں۔"

"اُدھر رواج نہیں ہے سر.. آپ مہمان ہیں۔"

"نہیں یوسف.. میرا مطلب ہے حسین.. پلیز سفارش کرو۔"

حسین نے اس دوشیزہ اور مقامی لوگوں سے طویل مذاکرات کئے اور تب جا کر نہایت جھجکتے ہوئے دوشیزہ نے وہ دس روپے کا نوٹ قبول کیا.. اور یوں قبول کیا کہ اس کی مسکراہٹ رکتی نہ تھی اور اس کے پیغمبری معصومیت والے سپید چہرے پر خوبانیوں، چیریوں اور مشابرم کی سفیدی یک جا ہوتی تھی.. چیز خوبانیوں سے چلی جائے اسد.. شنید تھی کہ نیچے میدانوں سے لوگ آتے ہیں اور ایسے چیری چہروں اور خوبانی رخساروں کو بیاہ کر لے جاتے ہیں.. میرے بیٹے بھی اگر شادی بیاہ کے معاملے میں میرے بس میں ہوتے تو میں انہیں یہیں لے کر آتا..

ہماری جیپ کے پیچھے ایک اور جیپ آ رکی..

اس جیپ کی پچھلی نشست پر دو نہایت بنے سنورے صاف ستھرے ڈینڈی نوجوان براجمان تھے.. سیاہ چشموں میں۔ نیلی جینوں اور شوخ ٹی شرٹوں اور مہنگے جوگرز میں.. انہوں نے ہم دیسی کوہ نوردوں سے راہ و رسم بڑھانے کو اپنے لیے مناسب نہ جانا.. اور وہ یقیناً اپنے سیاہ چشموں کے عقب سے ہم پر ایک چشم حقارت ڈالتے تھے.. وہ اپنی جیپ سے باہر آئے۔ آپس میں

انگریزی میں تبادلۂ خیال کرتے ہوئے اور ہمارے ڈرائیور سے نہایت رعب سے پوچھا کہ.. اوئے تم نے ہمارا راستہ کیوں روک رکھا ہے.. جیپ آگے کیوں نہیں لے جاتے.. یوسف جو ابھی ابھی خراب شدہ جیپ کے نیچے سے بے حد خراب شدہ حالت میں برآمد ہوا تھا، ان کی اونچی ہواؤں میں قیام کرنے کو بالکل خاطر میں نہ لایا اور نہایت بدتمیزی سے کہنے لگا۔ "سامنے کا جیپ کا کلچ پلیٹ فری ہو گیا ہے.. جب تک وہ نہیں چلے گا تو ہم کیسے چلے گا.. آپ کو جلدی ہے تو اپنا جیپ آگے لے جاؤ.."

ڈینڈی خوش لباس ستھرے نوجوان نے اپنی جیپ کے ڈرائیور کو حکم دیا کہ آگے لے جاؤ..

اُن کے ڈرائیور نے جواب میں جانے کیا کہا اور مقامی زبان میں کہا کہ وہ دونوں نوجوان ٹھنڈے ہو گئے..

یہ دونوں اپنے تئیں فیشن ماڈل نوجوان ہنزہ کے باشندے تھے اور گائیڈ تھے.. اور دیگر وادیوں.. نگر.. دیامیر.. بروغل یا بلتستان کے باشندوں کو اُسی چشم حقارت سے دیکھتے تھے جو انہوں نے ہمارے لیے وقف کر رکھی تھی..

ان میں سے ایک نوجوان خاصا چھیلا اور نسوانی تھا.. اگر امریکہ میں ہوتا تو کسی "گے" تحریک کا بدنی کشش کا حامل ایک نمائندہ ہوتا.. وہ بولتا تو ایک آہ بھر کر عمدہ انگریزی بولتا۔

بالآخر خراب شدہ جیپ جس کے سٹارٹ ہونے کے امکان معدوم ہو گئے تھے، اسے دھکیل کر ایک کھیت میں اُتار دیا گیا.. راستہ صاف ہو گیا.. ہم نکلے اور مچلو سے نکلے..

سفر پھر شروع ہو گیا..

"وادیٔ تلس جو مچلو کی چھوٹی بہن تھی"

"مچلو... بہت ہرا بھرا اور زرخیز ہے۔" میں نے حسین سے یا یوسف سے کہا۔

"ہاں صاحب.. ادھر پانی بہت ہے ناں.. اوپر تلس اس سے زیادہ خوبصورت وادی ہے لیکن اُدھر پانی کم ہے.. فصل کم ہے.. گندم کم ہے۔"

تلس آیا تو وہ بھی مچلو کی ایک مچلتی ہوئی بہن تھی۔

ویسے ہی سوہنے اور خوش و خرم باشندے.. وہی معصومیت اور وہی مسکراہٹ آمیز موسم..

گھروں کی کچی دیواروں پر دھرے گملے تھے.. گھی کے خالی ٹین تھے جن میں بنفشی پھول کھلتے تھے اور بالکونیوں میں مٹی ڈال کر وہاں پیلے پھولوں کی کیاریاں بہار دیتی تھیں..

بلتستان میں پھول ایک کمزوری ہیں.. بلتیوں کو جیسے بھوک لگتی ہے، پیاس محسوس ہوتی ہے، ایسے پھولوں کی بھی طلب ہوتی ہے۔ انہیں بلتی لوگوں کو.. اگر کسی خطرناک ڈھلوان کے دامن میں کوئی ایک خوش رنگ پھول نظر آ جائے تو وہ اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر اس تک پہنچتے ہیں اور اسے اپنی ٹوپی میں سجا لیتے ہیں۔ غریب ترین کچے گھروں میں بھی ایک آدھ بوٹا ایسا ہوگا جس پر پھول لگتے ہیں.. صرف ادھر بلتستان میں ہی نہیں پورے پاکستانی شمال میں یہ دیوانگی عام ہے.. رُوپل میں.. جھیل کرومبر کے کناروں پر.. درکوت کے قصبے میں.. ہسپر اور اسکولے میں.. ہر جگہ گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلتی ہے.. ہمارے کراچی، لاہور یا اسلام آباد کے گھروں میں.. نہایت مہنگے اور شاندار گھروں میں بھی آرٹی فشل فلاورز کے گلدان تو ہوں گے لیکن تازہ پھول صرف اسی صورت میں سجائے جاتے ہیں جب کوئی مہمان ان کو لے کر آ جائے..

یہ شائد تہذیب کا فرق ہے..

ہم سمجھتے ہیں کہ اگر نقل بہ مطابق اصل ہے.. اور نقل بہت برس چلتی ہے نہ مرجھاتی ہے اور نہ اس کی شکل میں فرق پڑتا ہے تو پھر اصل کو اپنے گلدانوں میں سجانے سے فائدہ.. جو ایک دو روز میں مرجھا جاتی ہے اور اس کی مہک تمام ہو جاتی ہے.. ہم لوگ گھاٹے کا سودا کرنے والوں میں سے نہیں ہیں..

میں نے کچھ گھروں میں ہر صبح نقلی پھولوں پر اُن کی اصل کے مطابق جو آرٹی فشل مہک ہوتی ہے، اس کا چھڑکاؤ ہوتا دیکھا ہے..

بس یہی.. تہذیب کا فرق ہوتا ہے..

تلس کے بعد.. جہاں پانی کم تھا اور بقول حسین یہ وادی مچلو سے بھی زیادہ پُرکشش تھی، چڑھائی شروع ہوگئی.. دریا کے پار جو اب ہوشے دریا کہلاتا تھا، ہوش ربا بلند چٹانوں کی ایک مسلسل دنیا تھی جو آسمان کی قربت میں تھی.. ان چٹانوں میں پوشیدہ وادیوں اور برفانی تودوں سے اُترنے والے نالے تھے جو دریا میں شامل ہو رہے تھے..

یکدم یہ لینڈ سکیپ آشنا ہوگئی.. اپنی ہوگئی.. دیکھی ہوئی ہوگئی..

دس برس پہلے قلب علی کی عنایت کردہ پجارو جیپ میں ہوشے کو جاتے ہوئے.. اپنے خاندان کے ہمراہ سفر کرتے ہوئے میں اسی لینڈ سکیپ میں سے گزرا تھا.. ادھر ڈھلوان کی گھاس پر بیٹھ کر سمیر نے تصویر اتروائی تھی.. سلجوق نے ایک پھول دریافت کیا تھا.. عینی نے ایک ٹیونا سینڈوچ کھایا تھا..

ویسے میرا سفر ابھی شروع نہیں ہوا تھا..

میں تو ہوشے تک جا چکا تھا.. جب اس کے آگے ایک قدم اٹھے گا تب میرا سفر شروع ہوگا..

سورج ڈھل رہا تھا.. دریا پار کی چٹانیں اپنے رنگ بدل رہی تھیں..

ہوا میں بلندی کی خنکی اور اُن جھاڑیوں کی مہک تھی جو ایک خاص بلندی کے بعد جنم لیتی ہیں..

"کاندے گاؤں.. جسے سیلاب بہا لے گیا.. ٹوٹا ہوا پل..."

اور پھر یکدم کاندے آ گیا..

ایک مختصر سا گاؤں.. چند گھر.. ایک ہوٹل کا سائن بورڈ اور جیپ کھڑی ہو گئی..

آگے پتھروں کی دنیا کا ایک انبار تھا اور اس میں کہیں وہ نالہ وہ دریا بہتا تھا جس پر کوئی شہتیر تھا.. شائد دو شہتیر تھے جو پل تھے.. جن پر سے گزر کر پار جاتے تھے.. لیکن یہاں سے جہاں ہماری جیپ رُکی تھی، نہ کسی دریا کی آواز آتی تھی اور نہ کوئی شہتیری پل دکھائی دیتا تھا..

جیپ کھڑی ہوئی تو اہلِ کاندے ہمارے گرد ہجوم ہو گئے.. اتنے زیادہ ہو گئے کہ میرے ساتھی ان میں گم ہو گئے.. نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز.. کاندے کی آبادی.. وہ جتنی بھی تھی ہم پر یلغار کرتی تھی.. ہمیں ملاحظہ کرتی تھی اور قدرے حیران ہوتی تھی کہ یہ کالا لوگ ادھر کیسے آ گیا ہے.. ادھر تو گورا لوگ آتا تھا.. سبھی لوگ تقریباً یک آواز ہو کر ہمیں طرح طرح کے مشورے دے رہے تھے، سوال کر رہے تھے.. دوائیاں مانگ رہے تھے یا پورٹر کے طور پر ساتھ چلنے کو کہہ رہے تھے.. رات گزارنے کے لیے دو عدد ہوٹلوں کی موجودگی کی اطلاع بھی فراہم کر دی گئی..

ڈینڈی ہنزہ برادران ہم سے پہلے پہنچ چکے تھے اور پتھروں کے انبار کے آگے جا کر نالے اور پل کا جائزہ لے کر واپس آ رہے تھے..

انہوں نے مجھ سے کچھ کلام نہ کیا لیکن میں نے آگے بڑھ کر ان سے کلام کیا۔ "یہ فرمائیے کہ آگے نالے پر جو پل ہے، اس پر سے گزرا جا سکتا ہے؟"

لچکیلی کمر والے گائیڈ نے ذرا مزید لچک کر نہایت غیر ملکی لہجے میں انگریزی میں جواب دیا۔ "پل تو نہیں ہے۔ دو شہتیر رکھے ہوئے ہیں نالے کے اوپر اور وہ اس بوچھاڑ سے گیلے اور

پھسلن والے ہو گئے ہیں.. نیچے نہ دیکھئے کہ کیا گزر رہا ہے اور نہ پھسلئے تو آپ بھی پار جا سکتے ہیں.. لیکن اگر گرتے ہیں تارڑ صاحب.. تو پھر بس گر جاتے ہیں.. نیچے پانی بہت تیز ہے۔"

اس نے "تارڑ صاحب" کہا تو میں چونکا۔ "آپ مجھے جانتے ہیں؟"

"جی.."

"لیکن آپ نے پہلے تو ہمیں لفٹ نہیں کروائی.. بہرحال آپ تجربہ کار ہیں۔ آپ کا کیا مشورہ ہے؟"

"مشکل تو نہیں.. لیکن پھسلتے ہیں تو جاتے ہیں.. ویسے نالے کے پار دو تین جیپیں کھڑی ہیں ہوشے جانے کے لیے.."

اس دوران اقبال آ گیا..

وہ ذرا دیر سے آیا تھا کیونکہ اقبال تھا.. ایک سکول ٹیچر تھا..

"تارڑ صاحب آپ نے آگے جا کر کیا کرنا ہے.. یہاں رات کریں۔ کل میں آپ کو دریا کے پار پانامہ اور تنگ ماً کی وادیوں میں لے کر چلتا ہوں.. وہ جو نالہ دریا میں گرتا ہے اس کے ساتھ ساتھ اوپر.. دو دن کا سفر ہے اور اس سفر کے دوران آپ کے اوپر جو چٹانیں ہوں گی وہ اتنی قریب ہوں گی کہ آپس میں ملتی ہوئی دکھائی دیں گی۔ پھر ایک چراگاہ آئے گی جو گندو گورو اور مشابرم کے بیس کیمپ سے ہزار گنا زیادہ خوبصورت ہے۔ چراگاہ کے اوپر ایک چوٹی ہے جہاں سے کے ٹو اور مشابرم دکھائی دیتی ہیں اور میں نے بقلم خود اس چوٹی کو اپنے نام پر "اقبال ٹاپ" کا نام دیا ہے.. چلیں گے؟"

"نہیں.. میں نے اس سے پیشتر مشابرم کو ترک کر کے گندو گورو کا ارادہ کیا ہے، اب میرے پروگرام میں مزید تبدیلی نہیں ہو سکتی.."

"تو پھر میرا یہ کارڈ رکھ لیجیے، اگر کبھی موڈ بنے تو میں آپ کو لے کر جاؤں گا۔"

کارڈ پر لکھا تھا "اقبال قادری۔ ماؤنٹین گائیڈ اور باورچی.. وائس چیئرمین یونین کونسل مچلو.. گاؤں کاندے۔ ڈاکخانہ تھاگس۔ تحصیل مشابرم۔ ضلع گھانچے۔ سکردو، بلتستان۔ پاکستان.."

"اور صاحب آپ نے اگر ہوشے سے گندو گورو جانا ہے تو آپ کو پورٹر درکار ہوں گے، وہ کہاں سے لیں گے؟"

"ہوشے سے.."

"ہوشے میں تو گندم اور جو کی کٹائی ہو رہی ہے۔ لوگ گھاس جمع کر رہے ہیں وہاں سے تو آپ کو ایک پورٹر بھی نہیں ملے گا۔ یہاں کاندے سے لے کر جائیں۔ یوں بھی ہوشے والے اچھے لوگ نہیں تنگ کرتے ہیں۔ ہم اچھے لوگ ہیں بالکل تنگ نہیں کرتے۔"

اقبال نے اتنا کہا اور ہمارے گرد جو ہجوم تھا، وہ اقبال کے اسی اتنا کہنے کا منتظر تھا کہ پورٹر یہاں کاندے سے لے کر جائیں۔ جوانوں، بچوں، بوڑھوں نے مجھے زبردستی اپنے شناختی کارڈوں کی فوٹو سٹیٹ کاپیاں تھمانی شروع کر دیں۔ شمال میں شناختی کارڈ کی کاپی ایک گارنٹی ہے کہ یہ شخص جینوئن ہے اور مقامی ہے۔

"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں لیکن یہاں سے پورٹر لے جاؤں تو کہیں ہوشے والے فساد نہ کر دیں کہ کاندے سے پورٹر کیوں لائے ہو۔ یہاں سے کیوں نہیں لیے۔"

شمال میں یہ تماشا بھی اکثر ہوتا رہتا ہے۔

ناتجربہ کار کوہ پیما۔ کنکورڈیا جانے کے لیے سکردو سے پورٹر لے لیتے ہیں تو راستے میں شگر والے دنگا کر دیتے ہیں کہ پورٹر ہمارے ہوں گے۔ شگر سے پورٹر لیں تو اسکولے میں ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے۔

"نہیں صاحب میں گارنٹی دیتا ہوں کہ ہوشے والے اعتراض نہیں کریں گے۔"

"تو پھر میں یہاں سے چار پورٹر لیتا ہوں۔ اگر ہوشے میں پرابلم ہوا تو واپس کر دیں گے۔"

"پرابلم نہیں ہوگا۔ یہ میرا چاچا ہے اسے ضرور لے کر جاؤ۔ بہت اچھا چاچا ہے۔"

یہ چاچا بے دانت کا بوڑھا چاچا۔ میں ساتھ لے گیا۔

کاندے گاؤں میں ایک سو تیس گھرانے ہیں اور آبادی صرف آٹھ سو تیس افراد پر مشتمل ہے۔ 1997ء اور پھر 2000ء میں ایک تباہ کن سیلاب نے تقریباً پورے گاؤں کو برباد کر دیا۔ نالے کا پل بہہ گیا اور لوگوں نے یہاں سے دور کیندا اس تھنگ میں ایک بستی آباد کر لی۔ وہی بستی جہاں پانی نہیں ہے۔ پانی حاصل کرنے کے لیے گاؤں کی خواتین ایک گھنٹہ سفر کر کے نیچے دریا تک پہنچتی ہیں جس کا پانی بے حد گدلا ہے اور مختلف بیماریوں کا باعث بنتا ہے۔ ٹورسٹ ان لوگوں کی آمدنی کا ایک ذریعہ تھے لیکن اب وہ نئے گھر بنانے اور پانی کے حصول میں اتنے مصروف ہو گئے ہیں کہ سیاحوں کے ہمراہ پہاڑوں میں نہیں جا سکتے اور اسی لیے مقروض ہو چکے ہیں۔ یہ

معلومات ایک اور سکول ٹیچر سخاوت حسین جہانگیری کی فراہم کردہ ہیں۔

ہم نے اقبال کی معرفت اپنا سامان پُل کے پار لے جانے کا ڈیل تین سو روپے میں کیا۔

یہاں سے جہاں ہم نے حسین یا یوسف کی جیپ چھوڑی تھی یہاں سے کاندے کا نالہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ آگے پتھروں کی ایک دنیا تھی۔ اور اس کے اندر سے ایک آبی شور ابھرتا تھا اور ہم آہستہ آہستہ چلتے اس کے قریب ہو رہے تھے۔ سامان پار لے جانے والے پورٹر اُچھل اُچھل کر پتھروں کو ناپتے ہمارے آس پاس ٹڈوں کی طرح اُچھلتے جا رہے تھے۔

اوپر کہیں بلند پہاڑوں سے کاندے کے سیلاب کے دوران جو ہزاروں بڑے بڑے پتھر آئے تھے، ہم ان میں راستہ بناتے نالے کے قریب ہوئے۔

اور اس نالے پر دو پل تھا۔

اور کیا پل تھا۔

دو شہتیروں والا ایک پاکھنڈی پل۔ اور واقعی شہتیر پانی کی بوچھاڑ سے اتنے بھیگ چکے تھے کہ ان پر بوٹوں کا ٹھہرنا محال لگتا تھا۔ اور شہتیروں کے نیچے جو نالہ تھا بلکہ پرنالہ تھا اس میں بھی پتھر لڑھکتے تھے اور اس میں جو گر گیا، وہ گیا۔ نیچے دریائے شیوک میں یا دریائے ہوشے میں اور پتھروں کے پاٹوں میں پستا گیا۔ گیا ہی گیا۔

میں نے فوری طور پر بہادری اور جرأت کے جو چند ذرّے مجھ میں تھے، انہیں سات سلام کیے اور بنا سہارے اس پر قدم رکھنے سے انکار کر دیا۔

ایک نوجوان پورٹر جو ان دو شہتیروں پر سرکس کے بازی گروں کی طرح کرتب دکھا رہا تھا، وہ آیا اور ہاتھ آگے کر دیا۔

اُس کے سہارے کے باوجود یہ ایک ٹانگوں کے ٹھوے میں کھلبلی مچا دینے والی کراسنگ تھی۔ اگلا قدم اٹھانے کے لیے شہتیروں کو دیکھتے تھے تو نظر ان کے نیچے باؤلے کتّے کے منہ سے نکلنے والی جھاگ پر چلی جاتی تھی جو کاندے نالے کے پانی تھے۔ سامنے دیکھتے تو پھسلنے کا خدشہ ہوتا تھا۔

اس "پل" کے پار ہو کر پھر پتھروں کی ایک دنیا تھی جس میں راہ بناتے ہم آگے ہوئے تو آگے درختوں کے ایک جھنڈ میں چند جیپیں کھڑی تھیں۔

"مولا جٹ کی جیپ میں.. کنیداس کا چٹانی گاؤں"

ایک ریٹائرڈ حوالدار کی نہایت ہی ریٹائرڈ جیپ تھی جو ہمیں ہوشے تک لے جا رہی تھی.. جیپ میں ہمارا سامان اور کاندے کے وہ پورٹرز جنہیں ہم نے ہائر کیا تھا، لوڈ ہو رہے تھے تو عامر میرے پاس آیا" تارڑ صاحب وہ دونوں ہنزہ گائیڈ..درخواست کر رہے ہیں کہ ہمیں اپنی جیپ میں ہوشے تک لے جائیں۔ اُن میں سے ایک اکرام بیگ کا کزن ہے.."

یہ کیسا حسین اتفاق تھا کہ وہ دونوں نوجوان اب تک سر پھرے اور متکبر رہے تھے..ہم سے بات کرنا بھی مناسب نہ سمجھتے تھے اور اب اکرام بیگ کے عزیز ہوئے جاتے تھے..ویسے تو آدھا ہنزہ بیگ کا کزن ہے لیکن میں جانتا تھا کہ وہ اپنی ذاتی جیپ کاندے میں چھوڑنے کے بعد یہاں سے ہوشے تک ایک جیپ ہائر کر کے اپنی جیب ہلکی نہیں کرنا چاہتے تھے اور ایک فری رائیڈ کے متمنی تھے..

شمال کی جیپ کی ایک باکمال خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک چھوٹے موٹے گاؤں کا کل سامان اور بیشتر باشندے آسانی سے سما جاتے ہیں۔ اگر ڈرائیور کی مرضی ہو تو..

"دے آر ویلکم.."

کاندے سے ہوشے تک ایک گھنٹے کی مسافت بتائی جاتی تھی..

جیپ سٹارٹ ہوئی تو میں پُرسکون ہو گیا.. مجھے شدید خدشہ تھا کہ شائد ہمیں کاندے میں ہی رکنا پڑے..لیکن اب ہم ہوشے کو جاتے تھے، اس لیے میں پُرسکون ہو گیا..

حوالدار اِدھر کا نہیں نیچے سیلنگ کا رہنے والا تھا..اِدھر ایک خیمے میں فروکش تھا..کاندے اور ہوشے کے درمیان اپنی شخصیت کے زور پر جیپ چلاتا تھا ورنہ اس کی جیپ میں اتنا دم خم نہ تھا کہ اپنے زور پر چلتی۔ فی پھیرا بارہ سو روپے چارج کرتا تھا..اتنے پھیرے لگاتا تھا کہ اس کی روزانہ آمدنی کا حساب اگر ڈالروں میں بھی لگایا جائے تو بھی قابل رشک تھی..البتہ جیپ کے پچھلے حصوں میں سے احتجاج کی دبی دبی آوازیں آ رہی تھیں..اس لیے کہ وہاں متعدد پورٹروں کے علاوہ وہ ہنزہ گائیڈ ڈینڈی بچہ لوگ بھی فِٹ ہونے کی کوشش کر رہے تھے..ہمارے سامان کے علاوہ وہاں پانچ کنستر ایسے تھے جن کی موجودگی بہت جگہ گھیرے میرے ساتھیوں کی ٹانگوں کو اجیرن کر رہی تھی کہ وہ ان میں پھنسے ہوئے تھے..

"حوالدار صاحب..ان کنستروں کو تو اتار دیجیے..میرے ساتھی نہ بیٹھ سکتے ہیں نہ کھڑے ہو سکتے ہیں.."

"صاحب انہیں بولو کہ تھوڑا گزارہ کر لو۔ آگے کنیداس کے علاقے میں کاندے کے سیلاب میں تباہ ہونے والے لوگ گھر بنائے بیٹھے ہیں اور اُدھر پانی نہیں ہے..میں یہاں سے ہر پھیرے میں اُن کے لیے پانی کے کنستر لے جاتا ہوں۔ تھوڑا تکلیف ہو گا لیکن ان کے پاس پینے کو بھی پانی نہیں ہوتا.."

یہ علاقے امداد باہمی کی بے مثال مثال ہیں۔

ایک جیپ ڈرائیور اپنا فرض سمجھتا ہے کہ اگر چند کلو میٹر دور لوگ پیاسے بیٹھے ہیں تو وہ ان کے لیے پانی لے کر جائے..اس طرح راستے میں کھیتوں میں کام کرنے والے لوگ جیپ دیکھ کر روڈ پر آتے اور حوالدار کی جانب پلاسٹک کی بوتلیں اُچھالتے جو وہ ایک ہاتھ سے کیچ کرتا جاتا..

"صاحب یہ کاندے کے لوگ ہیں..گھروں سے دور کھیتوں میں کٹائی کرتے ہیں تو مجھے اپنا بوتل دیتے ہیں.. میں اُدھر آگے جا کر ان کے گھروں میں سے چائے بنوا کر لاتا ہوں اور واپسی پر اسی طرح ان کی بوتلیں کھیتوں میں پھینک دیتا ہوں.."

درخت اور جھاڑیاں کم ہو گئیں..راستہ بے حد گرد آلود ہو گیا..یہاں ایک مدت سے بارش نہیں ہوئی تھی..

پھر بائیں جانب بڑی بڑی چٹانوں کے ایک نہایت ہی خشک اور صحرائی سلسلے میں کچھ پتھریلے گھر نظر آئے..وہ نئے تھے کہ جن پتھروں سے وہ تعمیر ہوئے تھے، ان پر تیشے کی تازگی کی سفیدی تھی..کچھ تو چٹانوں کی کوکھ میں سے جنم لے رہے تھے اور باقی ویرانے میں بکھرے ہوئے تھے، انہی چٹانوں کو توڑ کر ان کے پتھروں سے یہ آماجگاہیں تعمیر کی گئی تھیں۔ چنانچہ کئی چٹانیں

ایسی تھیں جو کئی پھٹی اور بدن دریدہ تھیں.. ایک نیا سکول بھی اس ویرانے میں نمایاں تھا.. یہی کینداس تھنگ تھا جو ایک دشت تھا جہاں پانی کی ایک بوند نہ تھی.. نہ کوئی چشمہ تھا اور نہ کوئی ندی نالہ.. ہوشے دریا نیچے ایک گھنٹے کی مسافت پر واقع تھا اور اس کے پانی بھی پینے کے لائق نہ تھے..

''ان لوگوں نے اس ویرانے میں گھر کیوں بنائے.. راستے میں کئی ہرے بھرے میدان تھے جہاں پانی تھا..''

''صاحب ادھر کاشت کا زمین کم ہے.. اگر کھیتوں میں گھر بنا لیتے تو زمین کم ہو جاتا.. کھاتے کہاں سے..''

حوالدار نے کنید اس کے گاؤں کے قریب جیپ روکی.. پچھلے حصے میں پڑے پانی کے کنستر اٹھا کر روڈ کے کنارے رکھے اور پھر جیپ سٹارٹ کر دی..

ان گھروں میں سے چند افراد نکلے.. کچھ بچے روڈ کی جانب بھاگنے لگے.. ایک بوڑھی عورت جو پتھر توڑ رہی تھی، اپنی سنگ پاشی کو ترک کر کے ہتھوڑی پھینک کر چادر سنبھالتی ادھر کو آنے لگی..

ہماری جیپ بہت آگے نکل چکی تھی جب میں نے عقبی آئینے میں دیکھا کہ وہ لوگ.. بچے اور وہ بوڑھی عورت خوشی خوشی کنستر اٹھاتے ہیں اور اپنے پیاسے گاؤں کو لے جاتے ہیں.. اور ہاں اس لمحے میں نے کاندے کے بے گھر لوگوں کی اس نئی چٹانی بستی میں بلند ہوتی اس چٹان کو نہ دیکھا جو نئے گھروں میں سے نکل کر آسمانوں سے ہم کلام ہوتی تھی.. آسمان کے رخساروں پر بوسہ دینے کے لیے بلند ہوتی تھی اور جس پر ایک سرخ جوڑے میں ملبوس لڑکی ایک جل پری کی مانند ٹانگیں سمیٹے براجمان تھی.. جو میرے ذہن پر.. میری یادداشت پر ایک مہر کی طرح.. ایک سادہ دھات پر ثبت ہو جانے والی مہر کی طرح جو اسے عام دھات سے بلند کرتی اسے بدل کر ایک سکہ بنا دیتی ہے.. ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوام بخش دیتی ہے۔ بھوری آنکھوں کا سلسلہ بے شک خاک در خاک ہو جائے لیکن وہ مہر قائم رہتی ہے.. لیکن میں نے نہ اس چٹان کو دیکھا اور نہ اس جل پری کو.. کہ میں نے یہ منظر اپنی واپسی پر اسی حوالدار کی جیپ کی کھڑکی میں سے دیکھا تھا۔

شائد ابھی وہ چٹان یہاں موجود ہی نہ تھی.. اس کا ظہور نہ ہوا تھا.. جتنی مدت میں نے ہوشے سے آگے کہیں بلند پہاڑیوں میں بسر کی اس دوران یہ چٹان زمین میں سے ایک بوٹے کی مانند پھوٹی.. ابھرتی گئی.. اور اپنی زیبائش کے لیے ایک سرخ لباس والی لڑکی کو اپنی چوٹی پر

بٹھایا تا کہ واپسی پر میں اسے دیکھوں اور زندگی بھر بھول نہ پاؤں.. اس کا نقش ہمیشہ کے لیے ثبت ہو جائے..

''حوالدار صاحب.. ادھر ہوشے کے راستے میں ہمارے دوست چنگیزی کی جیپ ایک حادثے کا شکار ہوئی تھی.. کسی گہری کھڈ میں گر گئی تھی.. چنگیزی کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اور اس کے ہمراہ جو جاپانی کوہ نورد تھی، وہ ہلاک ہو گئی تھی تو آپ جانتے ہو کہ ان کی جیپ کہاں گری تھی..''

''یہ کس برس کی بات کرتے ہو صاحب؟''

''تقریباً تین برس پہلے کی..''

''تب تو میں ادھر نہیں تھا..''

''کدھر تھا؟''

''آپ کے پنجاب میں تعینات تھا.. آہو.. میں تو آدھا پنجابی ہو چکا ہوں.. کی حال اے سوہنیو.. جوان آیاں ایں سوہنیاں!''

اگر یہ بلتی حوالدار مصطفیٰ قریشی کے ''مولا جٹ'' کے ڈائیلاگ اتنے ٹھیٹھ لہجے میں بول سکتا تھا تو پنجابی میں اس کی قادر الکلامی میں کوئی شک نہ تھا.. مجھے کچھ خفت سی ہوئی کیونکہ دوران سفر میں نے اس کے تن و توش کے بارے میں اپنے ساتھیوں کو محظوظ کرنے کی خاطر پنجابی میں کچھ فقرے کہے تھے.. جو ظاہر ہے اس تک پہنچے تھے لیکن وہ چپ رہا تھا..

''بڑا چنگا حال اے سوہنیو..'' میں نے ہنس کر شرمندگی میں ہنس کر جواب دیا۔

''آپ ادھر پہلی بار آئے ہو؟''

''نہیں.. میں دس برس پیشتر اپنے بال بچوں کے ہمراہ ایک ڈے ٹرپ پر ہوشے آیا تھا''

''تو ہوشے تب کیسا تھا؟''

''چند ایک گھر تھے.. کچے کوٹھڑی نما گھر تھے.. ہزاروں برس سے جو کوہستانی تنہائی اور آزردگی تھی اس میں گم شدہ چند گھر تھے.. بیشتر خواتین کے چہرے دھوئیں سے سیاہ ہو چکے تھے.. ان کی مینڈھیاں جو شائد بچپن میں گوندھی گئی تھیں، پھر نہیں کھلی تھیں.. اور جو بھاری اونی لبادے انہوں نے پہنے ہوئے تھے، وہ بھی برسوں سے پہنے ہوئے تھے، بچوں کے سر استرے سے اس طور مونڈھے گئے تھے کہ درمیان میں صرف سادھو لوگوں کی مانند ایک لٹ لٹکتی تھی جو شائد ان زمانوں کا فیشن تھا.. بوڑھے اپنی سفید اونی ٹوپیوں میں ایک چرخڑی کے گرد اسے گھماتے ہوئے

اون لپیٹتے تھے.. ایک ہوٹل اور ایک مشابرم شاپ تھی.. اور ہوشے والے ہمیں دیکھ کر سراسیمہ ہو گئے تھے اور "انگریز۔ انگریز" کہتے گھروں میں گھس گئے تھے اور میری بیگم نے بے حد برا مناتے ہوئے ان کا پیچھا کر کے انہیں جا پکڑا تھا اور کہا تھا.. ہم موئے انگریز نہیں ہیں.. پاکستانی ہیں اور مسلمان ہیں.. لا الہ.. اور خبردار جو ہمیں گندے ٹائلٹ پیپر سے اپنے آپ کو پونچھنے والے انگریز کہا.. تو پھر وہ سب دوست ہو گئے اور ہمارے قریب آ گئے.. یہ ہوشے تھا۔

"اب وہ ہوشے نہیں رہا۔" حوالدار نے منہ میں رکھی اُس کے گالوں کو ابھارتی کسی شے کی جگالی کرتے ہوئے کہا۔ "اب تو کے ٹو کی جانب سے دنیا جہان کا ٹورسٹ ہوشے میں اُترتا ہے لیکن صاحب.. ہوشے والا اب بھی نہاتا نہیں.. پانی کو اپنا دشمن سمجھتا ہے، گندا رہتا ہے۔"

"ویسے تو ہماری ایک محسن میم صاحبہ ازابیل شاہ بھی یہی کہتی ہیں کہ ہوشے کے لوگ پورے شمال میں سب سے گندے ہیں لیکن.. حوالدار صاحب آپ یہ بھی تو دیکھئے کہ وہ ہزاروں برس اس بلند تنہائی میں دنیا جہان سے کٹے رہے.. سال بھر میں صرف ایک فصل ہوتی ہے اور اگر سردی شروع ہو جائے تو وہ بھی پکتی نہیں.. پھلدار درخت بھی پھلتے نہیں۔ گندم، جو، شلجم اور مٹر کے چند بوٹے اور بس.. انہوں نے شدید برفباری اور بھوک کی آفتیں جھیلیں.. ان کے پاس تو موسم سرما گزارنے کے لیے کافی لکڑی بھی نہیں تھی اور اس کے باوجود انہوں نے اپنی وادی کو نہیں چھوڑا.. اگر گندے رہتے ہیں تو اپنے گھر میں رہتے ہیں۔"

حوالدار دل کھول کر اور جبڑا کھول کر ہنسا اور اپنا پورا بوجھ سٹیئرنگ پر ڈال کر جیپ کو دائیں جانب موڑ دیا۔ "آپ تو ہوشے والوں کے طرفدار ہو گئے ہو۔"

"میں ان لوگوں کا طرفدار ہوں جو بھوک اور افلاس سہتے ہیں اور اپنے گھر نہیں چھوڑتے۔"

حوالدار میری اس گفتگو سے بور ہو گیا اور درمیان میں بیٹھے حسن سے مخاطب ہو گیا۔

"آپ اُدھر لاہور میں کیا کرتے ہو؟"

"بس جی.." حسن صاحب حسب معمول ذرا شرما گئے۔ "میں ایک بینک افسر ہوں.. چھوٹا سا۔"

"کتنا بال بچہ ہے؟"

"دو بیٹے ہیں ماشاءاللہ.."

"اوئے سوہنیو.." حوالدار پھر سے ہنسنے لگا۔ "صرف دو.. میرے پانچ بچے ہیں اور ابھی

مزید آ رہا ہے.. تو یار دو تو بہت کم ہے اور پیدا کرو۔"

"وہ جی حوالدار صاحب۔" حسن صاحب کو تو اللہ شرمانے کا موقع دے اور یہ کیا موقع تھا "وہ... بیگم نہیں مانتی۔"

"اچھا۔" حوالدار نے مخدوش نظروں سے حسن کو دیکھا۔ "تو آپ بیگم کو پوچھ کر بچہ پیدا کرتا ہے.. ہم تو نہیں پوچھتا۔"

"ہور کی حال اے حوالدار جی۔" میں نے فوری طور پر موضوع کی پٹڑی بدلنے کی کوشش کی۔ "ہوشے کتاں دور اے؟"

"زیادہ دور نہیں سوہنیو.."

شام.. رات کی تاریکی کی دہلیز پر کھڑی پل دو پل کی مہمان تھی.. ابھی ہیڈ لائٹس جلانے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ جب ہم ذرا نیچے ہوئے.. چٹانوں کی اوٹ میں چلے گئے اور نیچے ایک گہرائی میں ایک پُل تھا..

اور پھر مجھے بھی یاد آ گیا.. یادداشت کی سکرین پر ایک فلم چل گئی.. ہوشے کے عین نیچے ایک پُل تھا جسے پار کر کے ایک زبردست چڑھائی آتی تھی اور پھر ہوشے آ جاتا تھا..

"اس پُل کے اوپر ہوشے ہے صاحب.. یہاں تک کاندے والوں کا زمین ہے اور اس پُل کے پار ہوشے والوں کا علاقہ ہے۔" اس نے پُل کے دوسری جانب جا کر سپیشل گیئر لگایا اور جیپ زبردست احتجاج کرتی.. ہچکی رُکتی پھر سے دھچکے کھاتی چڑھائی پر چڑھنے لگی..

اور اوپر جب جیپ کی ناک سیدھی ہوئی.. ہم جو چڑھائی کی وجہ سے پیچھے گرے تھے، ہموار ہوئے تو ہوشے آ گیا..

''ہوشے کی گلیوں میں اُندلس کے اجنبی''

شام کے بعد..رات کی قربت میں ہم ہوشے میں داخل ہوئے..

یہ تو اب باقاعدہ ایک گاؤں تھا..

چند گھر نہیں..گلیاں تھیں اور کچے نہیں پکے گھر تھے..اور رونق تھی..

ہمیں بتایا گیا تھا کہ ہوشے میں اب تین خیمہ گاہیں تھیں اور ان میں کوئی حمزہ کیمپنگ یا لیلے پیک کیمپنگ بہترین تھی..

ہم اس کیمپنگ کے پھاٹک کے باہر رُکے تو اس کے اندر غیر ملکی سیاحوں کے اتنے خیمے تھے..کہ وہ اُبل کر ہوشے کی گلیوں میں آرہے تھے..

اور یہ کیمپنگ سائٹ اگرچہ بہت مختصر تھی لیکن یہ سوئٹزرلینڈ کی جھیل لوگانو کے کناروں پر ایک کیمپنگ سائٹ ہو سکتی تھی کہ اس کے اندر تمام تر خیمے اور چہرے اجنبی سرزمینوں کے تھے اور میں جب لوگانو کی اس وسیع خیمہ گاہ کے گیٹ میں سے داخل ہو کر اندر گیا تھا تو استقبالیہ کلرک نے میرے پوچھنے سے پہلے بیزاری سے کہہ دیا تھا۔ ''کوئی جگہ نہیں..سائٹ فل ہے۔''

''میں تنہا ہوں اور میرا خیمہ بھی بہت چھوٹا سا ہے..''

''ایک چھوٹے سے خیمے کے لیے بھی جگہ تو چاہیے..جو نہیں ہے..سوری۔''

اور یہاں ہوشے میں بھی بالکل یہی صورت حال تھی..اور آج صرف میرا چھوٹا سا خیمہ ہی نہیں تھا بلکہ میرے چھ ساتھیوں کے بھی خیمے تھے..اور جگہ نہیں تھی..

ویسے ہم نے بہت ہی ندیدے پن سے اس کیمپنگ کے اندر جھانکا کیونکہ اندر ماحول سراسر مغربی تھا اور کوہ نورد خواتین پہاڑوں سے اترنے کے باوجود ابھی تک اپنے لباس کے بارے

میں لاپرواتھیں..

ذرا سامنے ایک اور پھاٹک تھا..جہاں کیمپنگ نمبر دو تھی اور یہ اشرف کیمپ تھی اور وہاں گھاس نہ تھی اور کچھ گھٹی گھٹی سی بھی تھی لیکن سوائے ایک چھوٹے سے خیمے کے بالکل خالی تھی..

دیوار کے ساتھ ساتھ جو پاپلر کے درخت اونچے ہوتے تھے، ان کے نیچے سورج مکھی کے چند پھول تھے..

ہوشے کی رات میں ہمارے خیمے سر اُٹھانے لگے..

اشرف کی خیمہ گاہ کے کچن میں پکوان پکنے لگے..

خیموں اور خوراک کے بندوبست میں کاندے سے آئے ہوئے پورٹر نہایت پھرتیلے ہو رہے تھے کیونکہ وہ چار کی بجائے شاید چھ سات آ گئے تھے اور اگلی صبح کو جب پورٹروں کا چناؤ ہونا تھا اس میں سے چنے جانے کے لیے پھرتیلے ہو رہے تھے۔ ان میں کچھ ہوشے کے بھی پورٹر تھے جو ہم میں گھل مل گئے تھے..ان میں ایک حسین نامی شخص بھی تھا جو پورٹر ہونے کے علاوہ ماہر باورچی ہونے کا بھی دعویٰ کرتا تھا اور لاہور کے کچھ ریستورانوں میں کام کرنے کا حوالہ بار بار دیتا تھا..اور بہت فرمانبردار اور مسکین شکل کا تھا اور ہم نے فیصلہ کر لیا کہ اس بے چارے کو تو ضرور ساتھ لے کر جائیں گے..چاہے ہم افورڈ کر سکیں یا نہیں..اور پھر جب ہم اسے ساتھ لے گئے تو ٹریک کے دوران ایسا ظالم اور طوطا چشم ہوا کہ ہم سب بے چارے اور مسکین ہو گئے..

میں اس بار اپنا جونگ نما خیمہ ساتھ نہیں لایا تھا اور سلمان کے آسٹریلوی خیمے کے ایک گوشے میں حسن صاحب کی رفاقت میں اپنے سلیپنگ بیگ میں نہایت پُرسکون استراحت فرما رہا تھا..

بقیہ ساتھی بھی اپنے اپنے خیموں میں کچھ نہ کچھ فرما رہے تھے..

اور باہر ہوشے کی رات تھی..مشابرم سے اُترتی رات تھی..

کچھ دیر استراحت فرمانے کے بعد میں اس خیمہ گاہ کے کچے اور کوہستانی ماحول والے ڈائننگ روم میں جا بیٹھا۔ گیس کی دودھیا روشنی اور کچھ انجانے چہروں میں جا بیٹھا..کچی دیواروں پر بطور آرائش کوہ پیماؤں کی تصویریں اور کارڈ چسپاں تھے اور کسی کیلنڈر سے مستعار لیے ہوئے جاپانی دوشیزاؤں کے تقریباً ہوشربا پوز تھے..تقریباً اس لیے کہ جاپانی اور چینی دوشیزائیں کوشش بسیار کے باوجود اپنی بدنی حالتوں کو برانگیختگی کے اس مقام پر نہیں لے جا سکتیں جسے مکمل طور پر ہوش رُبا کہا

جاسکے..یہ رتبہ بلند صرف امریکی، ہندوستانی اور پاکستانی دوشیزاؤں کو ہی مل سکتا تھا..

یہاں..اس ہوشے کے کچے گیس کی روشنی میں دودھیا ہوتے ایک ہسپانوی جوڑے سے ملاقات ہوئی جو نہایت صاف ستھرے اور بے حد اہتمام سے ملبوس شدہ تھے..وہ بھی اب تازہ ترین فیشن کے مطابق اسکولے سے کنکورڈیا پہنچ کر..درہ گندوگورو عبور کر کے ہوشے پہنچے تھے..نہ صرف ان کا لباس ستھرا تھا بلکہ وہ خود بھی متاثر کن حد تک خوش شکل تھے..

عامر انہیں دیکھ کر کہنے لگا۔ ''تارڑ صاحب نہ ان کے چہروں پر کے ٹو بیس کیمپ کی ہائٹ کا اثر نظر آتا ہے..نہ ان کی جلد اکھڑی ہوئی ہے اور نہ ہی ہونٹ اور ناک سوجے ہوئے ہیں..نہ ہی ایک طویل کوہ پیمائی اور خطرناک سفر کی کچھ تھکاوٹ ہے..اور ڈریس اپ بھی ایسے ہوئے ہیں جیسے پیرس کی نائٹ کلب ''مولن روژ'' میں ڈنر کرنے کے لیے جاتے ہوں تو انہیں پوچھئے کہ کیا واقعی یہ کے ٹو بیس کیمپ سے ہو کر ادھر پہنچے ہیں۔''

اور یہ حقیقت ہے کہ وہ ہسپانوی جوڑا ایک تروتازہ کھیرے کی مانند سرسبز اور ستھرا تھا..

سورج مکھی کی مانند کھلا ہوا تھا..

انہوں نے ڈائننگ روم کی کچی چھت پر..جہاں وہ ایک مخدوش سے زینے کی مدد سے پہنچے تھے..وہاں اپنا خیمہ نصب کر رکھا تھا تا کہ وہ ہوشے کے ''منظر'' کو انجائے کر سکیں اور ہم گہرائی میں..پاتال میں سفیدے کے درختوں تلے خیمہ زن تھے..

میں نے انہیں متاثر کرنے کی خاطر اپنی کتاب ''اُندلس میں اجنبی'' کا ذکر کیا تو وہ ضرورت سے زیادہ متاثر ہو گئے۔

''ہم تو پاکستان کو بھی نہیں جانتے تھے..صرف کے ٹو کو جانتے تھے اور یہ تو بالکل نہیں جانتے تھے کہ یہاں کوئی ایسا شخص ملے گا جس نے سپین کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہو۔''

انہیں کیا پتہ کہ ہسپانیہ ہم پاکستانیوں کے دلوں پر کہاں کہاں اثر کرتا ہے..بے شک بنیادی طور پر موورش سپین اثر کرتا ہے..ہم ان کے قرطبہ، اشبیلیہ اور غرناطہ کو ان کی نسبت کہیں زیادہ عزیز رکھتے ہیں اور حرنگ چوک کو اب قرطبہ چوک کہتے ہیں..

وہ دونوں شاید میڈرڈ کے رہنے والے تھے اور بینکر تھے..شادی شدہ نہیں لگتے تھے ورنہ اتنے خوش نہ لگتے..اگلی صبح ان دونوں نے روانہ ہونے سے پیشتر میرے خیمے میں جھانکا اور اپنا کارڈ بڑھا کر مجھے میڈرڈ آنے کی دعوت دی..وہ کارڈ وہیں کہیں ہوشے میں ہی رہ گیا..

ان دونوں نے البتہ میرا کارڈ گم نہیں کیا تھا اور ایک برس بعد انہوں نے مجھے اپنے پہلے بچے کی پیدائش کی خوش خبری بھیجی..

ویسے پاکستانی شمال میں اس بار ایک عجیب تبدیلی سامنے آئی..اس کے پہاڑوں اور گلیشیئرز میں بھٹکتے جتنے کوہ نورد ملے، ان میں سے بیشتر کا تعلق ہسپانیہ سے تھا۔

کھانے میں کیا تھا یہ کچھ یاد نہیں لیکن حسین کی تیار کردہ وہ سلاد یاد ہے جو نہایت سجی ہوئی اور خوش نظر تھی۔

کھانے کے بعد ہم سب ہوشے کی گلیوں میں نکل گئے..

دیواروں کو ٹٹولتے..اندھیرے میں احتیاط سے قدم رکھتے گلیوں میں نکل گئے..تاریک رات کے سائے میں نابینائی میں ان میں گھومتے رہے..

یہ ایسی گلیاں نہ تھیں جن میں انسان گم ہو جائے..کہ وہ دو چار ہی تو تھیں..ہر گلی کے بعد ایک اترائی آتی اور کھیت شروع ہو جاتے..گندم کے بوٹوں کا سنہری پن تاریکی میں بھی دکھائی دیتا تھا..

لیکن یوں بے مقصد بھٹکنے میں بھی ایک عجیب سنسنی تھی..

اس لیے کہ ہم 7821 میٹر بلند مشابرم کی چوٹی کے دامن میں ہوشے میں تھے..اور اگر اس چوٹی کا حساب کتاب کیا جائے تو یہ دنیا میں چوبیسویں بلند ترین چوٹی تھی..یہ امریکی کوہ پیما تھے جنہوں نے پہلی بار 1960ء میں اس پر قدم رکھا.

اور ہم نے مشابرم کو آج نہیں..دس برس پہلے بھی دیکھا تھا۔

یہاں سے نہیں..اس کے پار..دوسری جانب..کنکورڈیا کی جانب چلتے ہوئے جب ہم اردوکس سے نکلے تھے تو دائیں جانب برفوں کی ایک دنیا میں سے اٹھتی ہوئی اس دانت نما چوٹی کو دیکھا تھا..اور یہ حیرت ناک حد تک سوئٹزرلینڈ کی ماؤنٹ میٹرہارن سے مشابہ تھی۔ اگرچہ اس سے بلندی میں تقریباً دو گنی تھی اور اس کے گرد بادلوں کا ایک سفید گھیرا تھا..ہم اس کے برابر میں چلتے تھے اور اس کی شکل اور بلندی سے مرعوب چلتے تھے..اس کے دامن میں جو ہیبت ناک گلیشیئر تھا، اس کے ڈر میں چلتے تھے..

ایک برفانی عجائب گھر میں چلتے اسے دیکھتے جاتے تھے..اور تب نہیں جانتے تھے کہ اس چوٹی کے اندر ایک درہ گندوگورو نام کا ہے جسے عبور کر کے ہوشے پہنچا جا سکتا ہے..کوئی بھی

نہیں.. یہاں تک کہ ہوشے والے بھی نہیں جانتے تھے اور وہ اسے ناقابلِ عبور سمجھتے تھے..

یہ درہ دریافت ہوا تو ہوشے کی قسمت بدل گئی..

اس کی قسمت بدل گئی لیکن نہ نہانے کی عادت نہیں بدلی..

گئی رات ہم اشرف خیمہ گاہ میں لوٹے.. باہر ایک دکان کے کچے تھڑے پر چند نوجوان گا رہے تھے.. باتیں کر رہے تھے..

''کیسی باتیں کر رہے ہو؟''

''نوجوانی میں کیسی باتیں کرتے ہیں.. ہم لڑکیوں کی باتیں کرتے ہیں۔''

ہم تھکاوٹ سے.. بلندی کے خمار میں یوں چور ہوئے کہ خیموں میں جاتے ہی بے سدھ نیند میں اتر گئے..

کل سویر ہم نے گندوگورو کی جانب سفر کرنا تھا..

گندوگورو.. جو بقول میاں صاحب نہایت ہی فحش نام تھا۔

''تختِ لاہور کی گلیاں اور باقی رہ گئے... پانچ''

یہ ہوشے کی گلیاں نہ تھیں جن میں ہماری ویگن ٹریفک کے شور میں.. چلتی جاتی تھی..

یہ تختِ لاہور کی گلیاں تھیں..

ساجن کی وہ گلیاں تھیں جنہیں ہم چھوڑ گئے تھے.. اور اب واپس آئے تھے تو جی چاہتا تھا کہ کاش ساجن ان گھٹی ہوئی واہیات بوسیدہ اور گندی گلیوں میں نہ ہوتا.. ہوشے کی گلیوں میں ہوتا..

ساجن پر مینارِ پاکستان ایسے.. آنفل ٹاور کی بھونڈی نقل ایسے سٹرکچر کا سایہ نہ ہوتا.. مشابرم کا سایہ ہوتا..

اور ہوشے کی گلیاں بھی ایسی تھیں کہ ان میں ساجن کے ساتھ گھومنے پر پولیس نکاح نامہ طلب نہیں کرتی تھی.. وہاں پولیس ہوتی تو طلب کرتی..

البتہ ساجن کو لاہور سے ہوشے شفٹ کرنے میں بھی تو کچھ تکنیکی مسائل تھے..

ایک تو یہ کہ شہرِ لاہور کا عادی ساجن.. گھر سے باہر قدم رکھنے سے پیشتر میک اپ کی پوری کِٹ ختم کر دینے والا اور ہونٹوں پر ڈبل شیڈ کی لپ سٹک لگانے والا ساجن.. اول تو لاہور سے ہوشے جانے کے لیے راضی ہی نہیں ہوگا.. اور اگر بفرضِ محال رومینٹک ہو کر چلا بھی جائے تو چند روز میں بیزار ہو جائے گا کہ یہ کہاں آ گئے ہم چمن سے نکل کر.. اور ایسی محبت سے ہم باز آئے.... وہ موسمِ سرما کی شدید برفباریوں میں ہوشے کی کسی کوٹھڑی میں آگ پر اپنا گورا چٹا چہرہ سینکتا ساجن بہار کی آمد تک دھوئیں سے کالا شاہ ہو چکا ہوگا.. اس کا حلیہ بگڑ چکا ہوگا.. وہ گورا رنگ جس کی وجہ سے پورا پنڈورا ہو جاتا ہے، وہ دھوئیں کی کالک میں ایسے غائب ہوگا کہ ساجن کی صرف آنکھیں دکھائی دے رہی ہوں گی جن کے کونٹیکٹ لینز وہ لاہور میں بھول آیا ہوگا اور اب

چندھیائی آنکھوں سے ہر سُو دیکھتا ہوگا کہ.. کہاں آ گئے ہم چمن سے نکل کر..

چنانچہ ساجن کو لاہور کی گلیوں میں ہی رہنے دینا مناسب ہے..

میاں صاحب کو ڈراپ کرنے کے بعد ویگن اپنے سامنے ونڈ شیلڈ میں بادشاہی مسجد کے بے مثال گنبد و مینار اُتارتی.. شہر کے شور و غوغا میں بھیڑ کو چیرتی بھاٹی گیٹ سے مڑ کر سول سیکرٹریٹ سے دائیں جانب ہو کر کرشن نگر کی گلیوں میں آ گئی.. وہ کرشن نگر جسے اب زبردستی اسلام پورہ کہا جاتا تھا..

زبردستی اس لیے کہ نام بدلنے سے بستی کا مزاج اور اخلاق نہیں بدلتا..

یہ محض ایک پلاسٹک سرجری ہوتی ہے جس کے نیچے چہرہ وہی رہتا ہے..

اس حساب سے تو فوری طور پر شہر لاہور کا بھی نام بدل دینا چاہیے کہ یہ رام کے بیٹے لہو کے نام سے آباد ہوا تھا۔

اس کا نام بھی لائل پور کے بجائے فیصل آباد میں بدلنے کی پاکیزہ روایت کی پیروی کرتے ہوئے کسی سعودی شہزادے کے نام پر... بے شک پرنس فہد آباد رکھ دیا جائے تو کیا مضائقہ ہے.. ایک ایسا شہزادہ جو ایک سروے کے مطابق دنیا کے عیاش ترین لوگوں میں نہایت معتبر مقام پر ہے۔ قصور بھی.. جو میرا سوہنا شہر قصور ہے.. رام کے بیٹے کا ہم نام ہے۔ اسے بھی کسی اور شہزادے کے نام سے پکارا جائے تو کیا حرج ہے.. سعودی شہزادے تعداد میں اتنے کثیر ہیں کہ ہمارے شہر اور گاؤں ختم ہو جائیں گے، ان کی تعداد پھر بھی کم نہ ہوگی... بے شک آپ مان سنگھ کے مانسہرہ.. ہری سنگھ نلوہ کے ہری پور.. ٹیک سنگھ کے ٹوبہ اور رشی گودھا کے سرگودھا کے نام بھی بدل دیں.. شہزادے پھر بھی سرپلس رہیں گے۔

تو اس کرشن نگر.. اسلام پورہ کی ایک نہایت پُرسکون اور زندگی بھری گلی میں.. جہاں ایک گھوڑا بندھا تھا اور کچھ گائیں آوارہ ہوتی تھیں.. وہاں حسن صاحب اُتر گئے۔

اور کیسی بے تابی میں اُترے.. اپنے بچوں کے لیے اُداس.. بیگم کے لیے مرجھائے ہوئے.. اتنی بیتابی میں اُترے کہ ہمیں بھی بھول گئے یہاں تک کہ گجو کی خوبانیوں والی لڑکی کو بھی بھول گئے.. اتنی بے تابی سے جیسے لنکا سے واپسی پر سیتا کو رام ملتا ہے..

ویگن خالی ہوتی جاتی تھی..

اس کے اندر جو موسم ٹھہرے ہوئے تھے، وہ بھی رخصت ہوتے جاتے تھے.. اور شہر کی

کثافت آمیز دھواں بھری ہوا اس کے اندر ٹھہرے ہوئے موسموں پر غالب آتی جاتی تھی۔

ہر ساتھی کے اُترنے کے ساتھ کچھ موسم بھی ویگن سے اتر جاتے تھے..

ہم کہاں سے آئے تھے؟

تو کرشن نگر کی اس گلی میں جہاں ایک گھوڑا بندھا تھا اور کچھ گائیں آوارہ ہوتی تھیں اور حسن اُترے تھے یہ یقین نہ آتا تھا کہ ہم کہاں سے آئے تھے۔

"وادی ہوشے.. پھنگر پیک اور ٹریک کا پہلا دن"

ہر ٹریک کا پہلا قدم ہمیشہ ہیجان خیز ہوتا ہے۔

پورٹر اپنے کاندھوں پر آپ کے بوجھ اٹھائے.. آپ کے چولہے.. پریشر کُکر.. دیسی گھی.. دالیں۔ خوراک کے ٹین۔ پکوڑے تلنے کے لیے بیسن اور ٹونا مچھلی وغیرہ اُٹھائے نکلتے ہیں اور جب آخری پورٹر آپ کے قریب سے گزر جاتا ہے تب آپ سب سفر کی دعا پڑھتے ہیں.. اور بسم اللہ کہہ کر وہ پہلا قدم اٹھاتے ہیں..

دراصل پہلا قدم ہی پوری کوہ نوردی ہوتا ہے..

جیسے کہا جاتا ہے کہ ناول کا پہلا فقرہ لکھنا سب سے مشکل ہوتا ہے.. وہ لکھ لیجیے تو گویا ناول مکمل ہو گیا..

جیسے چاند پر پہلا قدم.. نسل انسانی کے لیے ایک عظیم جست ہوتا ہے..

جیسے سڑک پار کرتے ہوئے کسی کے ساتھ آپ کا ہاتھ چھو جائے تو گویا ایک عشق خاص کا آغاز ہو جاتا ہے..

جیسے موت کے پہلے لمحے میں ہی قیامت آ جاتی ہے.. کہ آپ کی آنکھیں بند ہونے کے بعد بے شک اربوں سال گزر جائیں، جب آپ کی آنکھ کھلے گی اور قیامت ہو گی اور آپ کہیں گے کہ میں تو ابھی ابھی مرا تھا..

کچھ ایسے ہی ٹریک کا پہلا قدم.. اور آپ منزل تک پہنچ جاتے ہیں..

بس یہی پہلا قدم ہم نے ہوشے میں اٹھایا تو گویا گوندوگورو کے بیس کیمپ پہنچ گئے..

ہوشے کی گلیاں کہاں تک ساتھ دیتیں۔ ایک ڈھلوان پر پہنچ کر جھجک گئیں، پیچھے رہ

گئیں اور ہم نیچے کھیتوں میں اُترنے لگے..

ہمارے پورٹر جو خاصے دور چلے گئے تھے یہاں سے کھیتوں میں بھٹکتے ہوئے لگتے تھے..

ہر سُو سنہری راج تھا..

اس کھلے سنہری پن میں کہیں کہیں ہریاول ٹھہری ہوئی تھی..

گندم پکنے کو تھی.. اتنی نہیں پکی تھی کہ کاٹی جا سکے.. اور کچھ کھیت ایسے تھے جن میں اس کے خوشے ابھی تک ہرے تھے..

ہم کھیتوں کے درمیان میں ایک پگڈنڈی پر چلتے جاتے تھے.. تازہ دم تھے اور چہلیں کر رہے تھے.. بدنوں میں چلبلاہٹ تھی کہ وہ ابھی پسینے اور تھکاوٹ سے آشنا نہیں ہوئے تھے.. خوش تھے کہ اس ویگن سے جان چھوٹی جو جیلو میں کھڑی تھی.. جیپوں کی محتاجی کا اختتام ہوا.. سب بیساکھیاں پیچھے رہ گئی تھیں اور اب ہم کسی بھی سہارے کے بغیر خود چلتے تھے، ایک پگڈنڈی پر جس پر ہم آج تک نہیں چلے تھے اور ایک پندرہ ہزار فٹ بلند درے کی جانب چلتے تھے.. جو ہمارے لیے اتنا اجنبی تھا کہ ہم نے آج تک اس کی کوئی تصویر بھی نہیں دیکھی تھی..

مخالف سمت سے کچھ پورٹر چلے آ رہے تھے..

وہ تھکے ہوئے تھے.. بوجھ تلے دبے ہوئے تھے.. یکدم انہوں نے اپنے بوجھ اُتارے اور پگڈنڈی کے برابر میں کھیتوں میں گھس گئے..

کھیتوں میں کام کرنے والی خواتین نے بالکل مائنڈ نہ کیا کہ وہ گندم کو روند رہے ہیں اور اُودھم مچا رہے ہیں بلکہ ان کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگیں کیونکہ وہ ہوشے کے تھے اور ان کے دور پار کے رشتے دار تھے..

یہ پورٹر کھیتوں میں گھس کر گندم کے سنہری بوٹوں کے بیچ کہیں کہیں نمودار ہونے والی مٹر کی بیلوں کو تلاش کر رہے تھے.. وہ اُن کی پھلیاں توڑتے اور انہیں کھول کر ان میں سے سبز دانے نکال کر منہ میں رکھتے اور خوش ہوتے تھے..

وہ بس اتنی ذرا سی بات پر خوش ہوتے تھے..

بلندی سے نیچے آنے والے یہ پورٹر.. جانے کتنی طویل مسافتوں اور کتنے دنوں کے بعد نیچے آنے والے یہ پورٹر باسی روٹیاں، خشک پنیر اور ٹین بند خوراکیں کھا کھا کر بیزار ہو چکے تھے اور ان کے تالو کسی تازگی کو ترستے تھے.. تازہ کھیروں، ٹماٹروں اور پیاز کے لیے ترستے تھے اور یہاں

صرف مٹر کی پھلیاں تھیں اور تازہ تھیں تو وہ اُن کے ہرے ذائقے کو منہ میں رکھنے کے لیے بے چین ہوتے تھے اور خوش ہوتے تھے..

ہم انہیں یہ عیاشی کرتے ہوئے چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔

دائیں ہاتھ پر تہہ در تہہ کھیتوں کی اوپر خشک چٹانوں کی ایک دیوار چلتی تھی اور بائیں جانب بھی کھیت تھے اور ان کے آخر میں ایک گہرائی تھی جس میں ہوشے دریا بہتا تھا اور یہاں سے دکھائی نہیں دیتا تھا.. اگر ہم نے اپنے اولین منصوبے کے تحت مشابرم بیس کیمپ میں جانا ہوتا تو ہم یہیں کہیں سے نیچے اتر کر ہوشے دریا کے پار جاتے اور اس کے ساتھ ساتھ سفر کرتے.. دریا پار ایک اور بہت بڑا نالہ بلندی سے اُترتا آ رہا تھا اور اس کے آس پاس اس کے پانیوں میں سیراب ہونے والے ہرے بھرے کھیت تھے.. اسی جانب ایک ویران پہاڑ دکھائی دے رہا تھا جس پر ہوشے کی تین خواتین اور ایک مرد بکریوں کی مانند اوپر چڑھتے جاتے تھے.. وہاں نہ کوئی راستہ تھا اور نہ کوئی پگڈنڈی.. اور پھر بھی چڑھتے جاتے تھے کہ وہ اسی دنیا میں پلے بڑھے تھے.. وہ مجھ سے اتنی دور تھے کہ یہاں سے محض نقطے لگتے تھے جو کبھی کبھار حرکت کرتے تھے اور کبھی یوں ہوتا کہ میں کچھ دیر کے بعد اُدھر دیکھتا تو وہ جھاڑیوں اور گھاس میں گم ہو چکے ہوتے پھر غور کرنے سے دوبارہ نظر آتے.. وہ ایک خاص بلندی پر پہنچ کر رُک گئے اور جھاڑیوں کو کاٹنے لگے.. گھاس جمع کرنے لگے.. اور پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے اسے کمر پر بوجھ کر کے نیچے نالے کی جانب اُترنے لگے.. شائد آپ سوچ رہے ہوں کہ اتنی دوری سے جہاں سے وہ محض نقطے لگتے تھے، میں نے کیسے جان لیا کہ ان چاروں میں سے تین عورتیں ہیں اور ایک مرد.. خواتین کے پیراہن سرخ رنگ کے تھے اور وہ زیادہ آسانی سے پہاڑ پر چڑھتی تھیں..

ہم ابھی تک ہوشے کی دنیا میں تھے..

کھیتوں میں کہیں کہیں پتھریلی آماجگاہیں تھیں جن کے باسی ہماری نگاہوں سے چھپتے تھے البتہ بچے لوگ ہاتھ ہلاتے تھے..

یہ تو درست کہ پہلا قدم سب سے مشکل ہوتا ہے لیکن اس سے بڑا سچ یہ ہے اس پہلے قدم کے بعد ہی تو اصل آزمائش شروع ہوتی ہے.. سانس پھولنے لگتا ہے.. گھٹنوں میں درد ہونے لگتا ہے.. جوگرز پاؤں کو دبانے لگتے ہیں.. جرابوں میں اگر کوئی سلوٹ رہ گئی ہے تو وہ دکھ دیتی ہے اور پھر تیز دھوپ کے نیزے آپ کے بدن میں سوراخ کر کے نہ صرف پسینہ بہاتے ہیں بلکہ آپ

کو نڈھال کرتے ہیں اور آپ اپنی فلاسک کو عزیز از جان.. جانتے ہیں کہ اس میں نمکول ملا پانی ہے جس کا ایک ایک گھونٹ آب حیات ہے اور جو آپ کے بدن کو ڈی ہائیڈریشن سے بچا سکتا ہے.. پھر آپ ان ساتھیوں کو تلاش کرتے ہیں جو آگے نکل چکے ہیں جن میں برمانی بھی شامل ہے اور وہ چونکہ پہلی بار ہمارا ساتھی ہوا ہے اس لیے تازہ دم ہے اور کسی چولستانی آہوئے آوارہ کی مانند قلانچیں بھرتا نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے اور پھر ان ساتھیوں پر نظر کرتے ہیں جو آپ کے آس پاس آپ کو کوستے ہوئے پھٹ پھٹ بھاری قدموں کو بمشکل اٹھا رہے ہیں۔ پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو کوئی ایک آدھ ساتھی ایسا ہے جو یہ منصوبہ بندی کر رہا ہے کہ گندہ گورو پر لعنت بھیجو، یہیں سے واپس ہوشے لوٹ جاتے ہیں..

ہوشے سے ہماری اگلی قیام گاہ تک کا راستہ آسان ہونا چاہیے تھا کیونکہ گائیڈ بکس نے یہی اطلاع فراہم کی تھی اور اس قیام گاہ کا نام متعدد بار سننے اور دوہرانے کے باوجود مجھے یاد نہ ہوتا تھا.. صرف اتنا یاد رہتا تھا کہ اس کا نام کچھ چینی سا ہے اور چین کے ایک پرانے.. ایک وسیع جھیل کے کنارے چائے کے باغوں والے شہر ہانگ چو سے ملتا جلتا تھا..

لیکن میں اس لیے ہانگ چو کو قطعی طور پر یاد نہیں کرنا چاہتا تھا..

کہ وہاں پیکنگ کی تتلی رہتی تھی..

ہوشے کے کھیتوں کا اختتام ہوا تو پتھر شروع ہو گئے.. خدا خدا کر کے وہ ختم ہوئے تو ایک دو نالے راستے میں آئے.. وا جبی سی چڑھائی سے سابقہ پڑا..

ہمیں یہی اطلاع دی گئی تھی کہ آج کل چار سے چھ گھنٹے کا سفر در پیش تھا اور ہمیں چلتے ہوئے چھ گھنٹے تو بیت چکے تھے اور ابھی تک لنچ کے لیے بھی قیام نہ ہوا تھا۔ پھر صنوبر کے کچھ درخت.. گھنے اور چھدرے نظر آئے.. اور ان کے سائے میں کچھ بھاری اور سیاہ وجود ڈھیر نظر آئے..

میں نے جب پہلی ان ڈھیر وجودوں کو دیکھا تو ڈر گیا کہ یہ کیا ہولناک چیزیں ہیں.. پھر کھلا کہ یہ تو بھولے بھالے یاک ہیں جو دھوپ سے بچنے کی خاطر صنوبر کے سایوں تلے استراحت فرماتے ہیں..

یہاں سے ہوشے دریا کہیں مشابرم کی جانب چلا گیا تھا یا وہاں سے اُتر کر ہوشے کی جانب بہہ چکا تھا اور اب ہم چراکسا دریا کو دیکھتے چلتے تھے..

ایک آبادی.. بلکہ متروک شدہ جھونپڑے آئے جو اوڈونگستان تھا.. کچھ باڑے تھے اور

ایک کوٹھڑی مسجد تھی جس کے باہر وارننگ درج تھی کہ غیر مسلم یہاں داخل نہیں ہو سکتے.. ہم سب اگرچہ اس کے اندر جانے کے تمنائی تھے لیکن جھجک گئے کہ کیا ہم اپنے آپ کو مسلمان کہہ سکتے ہیں.. البتہ حسن صاحب بے دھڑک اندر چلے گئے کہ سرجی ہم اہلِ سادات میں سے ہیں..

"اندر کیا ہے؟" ہم نے پوچھا جب وہ باہر آئے..

"ایک چٹائی ہے اور ایک لوٹا ہے۔"

ہم پھر سے چلنے لگے.. اس ٹریک میں آسانی یہ تھی کہ ہمیں راستہ تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آتی تھی.. ایک چوڑی پگڈنڈی تھی جس پر بس چلتے جائیے..

ذرا آگے ہمارے پورٹر آرام کر رہے تھے..

صنوبر کے درختوں تلے پاکوں کی مانند استراحت فرما رہے تھے..

میں نے اپنا مختصر رُک سیک اتارا اور ایک گنجے ہوتے صنوبر کے سائے میں رینگتا صرف اپنے چہرے کو دھوپ سے بچا سکا اور لیٹ گیا..

گرم سوپ.. سارڈین.. کچھ پنیر اور چائے..

لنچ ٹائم..

بائیں جانب جدھر ایک وادی دور تک جہاں تک نظر جاتی تھی، کھلتی جاتی تھی.. مشابرم تھی.. مشابرم کے برابر میں دو اور چوٹیاں تھیں جو چٹانوں میں سے جھانکتی اوپر ہوتی آسمان میں سفید ہوتی تھیں..

"یہ بھنگر پیک ہے سر.." حسین نے اطلاع کی..

برمانی متجسس ہو گیا۔ "سائیں.. یہ بھنگر؟.. بلتی زبان کا کوئی لفظ ہے؟"

"نہیں سر.. انگلش میں کہتے ہیں.. بھنگر پیک.. بھنگر.." اس نے انگلی کھڑی کر کے ہمیں بتایا کہ یہ والی.. بھنگر!

معلوم ہوا کہ یہ چوٹی بھنگر.. یعنی فنگر پیک اس لیے کہلاتی ہے کہ اس کی ساخت اور شکل دور سے ایک انگلی کی مانند اٹھی ہوئی دکھائی دیتی ہے بلکہ دو انگلیوں کی مانند کہ وہ دو چوٹیاں تھیں جو آسمان کو انگلی دیتے ہوئے کہتی تھی کہ خبردار ہم بھنگر پیک ہیں..

اس بھنگر سے یاد آیا کہ ہوشے سے نکلتے ہی، ہم متعدد پروفیشنل قسم کے بچہ لوگ کی یلغار میں آ گئے جو ہم سے بزبان انگریزی چاکلیٹ، سویٹ، ٹافی وغیرہ کی ڈیمانڈ کرنے لگے..

پروفیشنل اس لیے کہ شمال میں ہر وہ قصبہ یا آبادی جہاں سے بلند پہاڑوں کو راستے جاتے ہیں وہاں کے بچے جانتے ہیں کہ صبح سویرے غیر ملکی کوہ نورد اوپر جانے کے لیے نکلیں گے اور ان کے پاس چاکلیٹ اور ٹافیاں ہوتی ہیں جو ہمارے لیے ہوتی ہیں۔ چنانچہ وہ ایک طے شدہ شیڈیول کے مطابق اپنا حق وصول کرنے کے لیے آپ پر حملہ آور ہو جاتے ہیں..

ہم نے ہوشے میں ایک بورڈ پر یہ عبارت پڑھی تھی کہ براہِ کرم ہمارے بچوں کو ٹافیاں اور سویٹس دے کر نہ ٹرخائیے بلکہ انہیں کاپیاں اور پنسلیں تحفے کے طور پر پیش کیجیے تاکہ وہ تعلیم حاصل کر سکیں..

ہمارے پاس ان بچوں کو ٹرخانے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ ہم اپنے ساتھ کاپیاں اور پنسلیں لانا بھول گئے تھے.. چنانچہ انہیں ٹافیاں اور سویٹس تاوان کے طور پر ادا کر دی گئیں.. ان میں سے ایک بچے نے اپنا نام عمران خان بتایا اور دوسرے نے سینہ پھُلا کر ایڑیوں پر ذرا بلند ہو کر کہا کہ میں.. مشابرم خان ہوں..

یہ مشابرم خان ابھی ایک میٹر کا بھی نہ تھا لیکن.. 7821 میٹر بلند چوٹی کی ہمسری کرنے میں کیا برائی ہے..

چنانچہ ہم آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ مشابرم کو تو ہم نے ٹافیاں کھلائی تھیں اپنے ہاتھ سے.. لنچ بریک کے دوران میں ایک تو ہم نے بھنگر پیک کو دریافت کیا اور اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس پیک کے برابر میں کوئی ایسا راستہ نکلتا ہے جو کھوبرے میں جا اترتا ہے..

"کے ٹو کہانی" کے دوران.. پائیو اور للی گو کے بعد بالتورو گلیشیر کے کناروں پر جو ایک خیمہ گاہ تھی.. جہاں ہم نے ایک اُمڈتے ہوئے گلیشیر کے سامنے رات کی تھی تو وہ خیمہ گاہ کھوبرے تھی.. اور یہ اُمڈتا ہوا گلیشیر کھوبرے کا تھا جو ہمارے قیام کے ایک دو برس بعد یوں اُمڈا کہ اس خیمہ گاہ کو روندتا بالتورو میں اُتر گیا.. اس سفر کے دوران بہر طور کے ٹو ٹریک کے حوالے اتنے تھے.. کیونکہ.. یہاں واقعی اُدھر تم اِدھر ہم.. والا معاملہ تھا.. کنکورڈیا کو جانے والے بالتورو گلیشیر کا وجود ان چوٹیوں کے دوسری جانب چلتا تھا..

صنوبر کے چھدرے سائے ہمیں آسودگی نہ دے سکے اور ہم لنچ نگل کر پھر سے رواں ہو گئے.. چراکسا دریا.. صنوبر کے درختوں اور جھاڑیوں سے پرے بہتا تھا.. اور پھر ہم اس کے کناروں پر آ گئے.. کناروں پر دُور دُور تک پتھر تھے اور نرم ریت تھی..

دوپہر خاصی ڈھل چکی تھی۔ لیکن ہماری منزل کا کچھ پتہ نہ تھا۔ کوئی نشان نہ تھا.. جس منزل کا نام بھی یاد نہ رہے وہ بھلا کیسے آ سکتی ہے..

تھک سب چکے تھے لیکن اقرار کوئی نہ کرتا تھا..

بے بس سب ہو چکے تھے لیکن شکایت کوئی نہیں کرتا تھا..

کہ ٹریک کے پہلے روز ہی اگر اس قسم کے شکوے شروع ہو جائیں اور یہ بھی بتایا گیا ہو کہ یہ تو دو چار گھنٹے کا آسان راستہ ہے تو پھر کوئی بھی شکوہ کر کے اپنی مردانگی مجروح نہیں کرتا.. دریا کے ہموار کناروں کے بعد اس کے پانی قریب آ گئے اور ہم موسیٰ نہیں تھے جو اس میں اپنی واکنگ سٹک پھینک کر اسے دولخت ہو جانے کا حکم دیتے اور درمیان میں سے گزر جاتے۔ اس لیے ہم دریا پر معلق چٹانوں کے اوپر چڑھنے لگے..

پہلی بار ایک قدرے مشکل راستہ قدموں تلے آیا.. جس میں اگرچہ بلندی کم کم تھی لیکن خطرناکی تھی.. یعنی اگر پاؤں پھسلتا تھا تو ہم لڑھکتے ہوئے نیچے پانیوں میں جاتے تھے.... اگرچہ یہ پانی بھی کم کم تھے نہ ہمیں بہا کر لے جا سکتے تھے نہ ڈبو دینے کی صلاحیت رکھتے تھے.. جان تو نہیں جا سکتی تھی ایک آدھ ہڈی چٹخ سکتی تھی لیکن یہ بھی غنیمت تھا۔ اسی لیے یہاں پہنچ کر میاں صاحب پہلی بار چہکے بلکہ خوشی سے نڈھال ہو گئے۔ ''شکر ہے کہ ایسا نامہ نہم راستہ بھی آیا ہے.. واہ جی واہ..''

''کیوں واہ جی واہ..'' میں نے اس راستے پر اپنے آپ کو قائم رکھنے اور نیچے نہ گرنے کی سعی میں جھلاتا کواری سے پوچھا..

''سر جی.. ہوشے سے یہاں تک تو بس مشقت اور مزدوری تھی.. طبیعت آوازار ہو گئی تھی بے مقصد چلتے چلتے.. اب کچھ کچھ خطرناکی کے آثار پیدا ہوئے ہیں تو بادشاہو سواد آ گیا ہے..''

میاں صاحب کی کوہ نوردی کی منطق یہ تھی کہ جب تک کہیں بلندی سے گر کر ہلاک ہو جانے یا دریا برد ہو کر موت کے سپرد ہو جانے کے امکانات پیدا نہیں ہوتے تھے، انہیں سواد نہیں آتا تھا.. یہ نیم ہلاکت خیز راستہ بدقسمتی سے فوراً ہی تمام ہو گیا اور پھر سے صنوبر کے درختوں اور جھاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا..

ہم ایک مدت تک ان میں چلتے رہے.. ہمارے برابر میں دریا چنگھاڑتا تھا اور ہمیں مزید بہرا کرتا تھا..

''تارڑ صاحب..'' عامر میرے برابر میں چلتا تھا.. کے ٹو کے بعد پہلی بار کسی ٹریک میں

چلتا تھا اور ابھی تک اس کی سختی سے مفاہمت نہیں کر پایا تھا۔ ''ہمیں اس دریا کے پار جانا ہے؟''

''پتہ نہیں..''

''دریا کے پار ایک بہت بڑا گلیشیئر دکھائی دے رہا ہے جو گندوگورو ہی ہو سکتا ہے تو کیا ہم نے وہاں تک جانا ہے اور کل صبح اس کے اندر جانا ہے؟''

''پتہ نہیں۔''

''ویسے آپ کو پتہ کیا ہے؟''

''پتہ نہیں..''

اور یہ حقیقت ہے کہ مجھے کچھ پتہ نہ تھا کہ ہم نے آج کہاں جانا ہے.. صرف یہ پتہ تھا کہ کہیں نہ کہیں جانا ہے..

''کچھ تو پتہ ہوگا..''

''صرف یہ پتہ ہے کہ کسی ایسی جگہ جانا ہے جس کا نام چین کے شہر ہانگ چو سے ملتا جلتا ہے۔''

ہم جھاڑیوں اور بلند گھاس میں چل رہے تھے..

''اگر تو ہم نے اس دریا کے کناروں پر سفر کرنا ہے تو مجھے آگے کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا اور اگر ہم نے اس کے پار جانا ہے تو یہ اس مقام پر براللدو جیسا ہے اور ہم درجن بھر پورٹروں کے کندھوں پر سوار ہو کر بھی اس کے پار نہیں اتر سکتے جب تک کہ اس پر ایک پل نہ ہو... جو نہیں ہے۔''

''ہاں پل تو نہیں ہے.. اگر ہوتا تو نظر آ جاتا..''

اور عین اس لمحے جب عامر نے یہ کہا کہ.. جب تک اس پر ایک پل نہ ہو... جو نہیں ہے.. اور میں نے جواب میں ابھی یہی کہا تھا کہ ہاں پل تو نہیں ہے.. اگر ہوتا تو نظر آ جاتا.. ایک پل نظر آ گیا.. جھاڑیوں کی اوٹ میں سے ایک نہایت ٹیکنی کلر قسم کا پل دکھائی دینے لگا..

''یار تم پہلے ہی کہہ دیتے کہ اس دریا کو ایک پل کے بغیر پار نہیں کیا جا سکتا تو یہ پل پہلے ہی نمودار ہو جاتا..''

چڑا کسا دریا کہیں پیچھے سے چلا آ رہا تھا اور سامنے جو گندوگورو کا عظیم اور ہیبت ناک گلیشیئر دکھائی دے رہا تھا، اس میں سے اسی نام کا دریا اتر رہا تھا اور یہاں دونوں دریاؤں کا سنگم تھا

اور اس پر ایک ٹیکنی کلر پل تھا..

یہ پل اگر کہیں اور ہوتا تو اس کے شوخ رنگ ذوق جمال کو شدید طور پر زخمی کرتے لیکن یہاں گلگت، سکردو، چپلو اور ہوشے سے بھی کہیں آگے جہاں یاکوں کے ڈھیر صنوبر کے سایوں میں پڑے تھے.. اور مشنگر پیک تھی اور چراکسا ایسے نامعلوم دریا بہتے تھے وہاں یہ پل ایک ورک آف آرٹ تھا..

اسے عجیب سائیکی ڈیلک قسم کے رنگوں سے پینٹ کیا گیا تھا. لگتا تھا کہ اسے پینٹ کرنے کا ٹھیکہ گل جی کو دیا گیا تھا جس نے اپنے سٹوڈیو میں جتنے بھی بچے کھچے رنگ تھے، وہ اس پر تھوپ دیئے تھے..

بہرحال یہ ایک باقاعدہ پل تھا.. کالدے کے نالے پر رکھے دو شہتیر نہ تھے.. اگرچہ اس کا لباس ہمارے گھر میں صفائی کرنے والی اس اماں کے لباس کے اس رنگ کا تھا جو وہ کرسمس کے موقع پر چرچ جانے کے لیے زیب تن کرتی تھی..

اور یہ عیسائی اماں.. جس کا ناک نقشہ "بہادر" کی دراوڑ پاروشنی ایسا تھا.. بے حد دانا اور ان پڑھ ہونے کے باوجود دانش رکھنے والی اماں تھی.. ایک بار میرے بچوں نے پوچھا کہ اماں آپ مسلمان کیوں نہیں ہو جاتیں تو اس نے کہا۔ "بیٹا میں مسلمان ہو جاؤں تو بھی کیا آپ مجھے اپنی چارپائی پر برابر میں بیٹھنے دیں گے.. تو جہاں مجھے برابر میں بیٹھنے دیا جاتا ہے وہیں کیوں نہ بیٹھی رہوں.."

چراکسا اور گندو گورو دریاؤں کے سنگم پر جو ٹیکنی کلر پل تھا، ذرا دیکھئے کہ وہاں لاہور میں ہمارے گھر کے فرشوں پر گھسٹتی ان پڑھ کی پھیرتی اماں کیسے آ گئی.. اس پل پر قدم رکھا تو نیچے سے پانیوں نے اِک ہوائے سرد ہمارے استقبال کو بھیجی جس کی خوشگوار ٹھنڈک سے لطف اندوز ہونے کے لیے ہم کچھ دیر اس کے درمیان میں کھڑے ہو کر لمبے لمبے سانس لیتے رہے..

برمانی اور سلمان کہیں آگے دفع ہو چکے تھے..

لیکن پیچھے میاں صاحب، شاہد اور حسن تھے..

اور ہم.. میں اور عامر پل پر کھڑے لمبے لمبے سانس لیتے تھے..

پل کے پار ایک معمولی سی چڑھائی تھی اور اس کے اوپر جھاڑیوں.. بے ترتیب پودوں کا ایک گھنا ذخیرہ تھا جہاں پر ہم رُک گئے..

ایک دوراہا آ گیا تھا..

ہم رُک گئے..

آس پاس کوئی نہ تھا جس سے یہ پوچھتے کہ بھائی صاحب ہمیں یہ تو معلوم نہیں کہ ہم نے کہاں جانا ہے.. اور جدھر بھی جانا ہے تو ان دو راستوں میں سے کونسا راستہ ہے جدھر ہم نے جانا ہے..

ہم دونوں.. وہ درویش تھے.. جو ایک دوراہے پر کھڑے ہو گئے تھے..

کونسے درویش تھے؟..

شاید "تذکرہ غوثیہ" یا "سکینۃ اولیا" میں یہ قصہ درج ہے کہ..

دو درویش ایک گھنے اور تاریک جنگل میں جا رہے تھے.. ایک بابا درویش تھا یعنی مرشد اور دوسرا بانکا درویش تھا یعنی مرید.. سامنے ایک ایسا ہی دوراہا آ گیا تو بانکا درویش رُک گیا.. بابا درویش نے پوچھا. کیا بات ہے، رُک کیوں گئے ہو؟.. اس پر بانکے نے کہا کہ بابا میں سوچ رہا ہوں کہ اب ان دو راستوں میں سے کونسا ایک راستہ اختیار کروں..

اس پر بابا درویش نے فوری طور پر بانکے درویش کے لمبے چوغے کی تلاشی لی.. اس کی اندرونی جیب میں سے ایک چونّی برآمد ہوئی جو بابا درویش نے نکال کر پھینک دی اور پھر پوچھا۔

"ہاں بانکے.. اب بتاؤ کدھر جانا ہے.. کونسا راستہ اختیار کرنا ہے؟"

بانکے نے کہا "اب تو کسی بھی راستے پر چل دیں، کیا فرق پڑتا ہے؟"

بانکا اسی لیے رُکا تھا کہ اس کی جیب میں ایک چونّی تھی اور وہ ڈرتا تھا کہ کہیں اس راستے میں.. یا اس راستے میں ڈاکو نہ ہوں اور مجھے لوٹ نہ لیں.. میری چونّی نہ چھین لیں.. جب چونّی نہ رہی تو تمام راستے ایک جیسے ہو گئے..

ہم دونوں کی جیبوں میں بھی ایک چونّی تھی اور ہم ڈرتے تھے کہ اب کونسا راستہ اختیار کریں..

یہ چونّی.. وہ منزل.. وہ خیمہ گاہ تھی جہاں ہم پہنچنا چاہتے تھے.. اور ہم اسے کھونا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ ہم دونوں اس دوراہے سے الگ الگ راستوں پر کچھ دور.. کچھ دیر چلیں اور پھر دیکھیں کہ کونسا راستہ اس چونّی کی جانب جاتا ہے..

میں دائیں ہاتھ ہو گیا اور عامر بائیں راستے پر چڑھنے لگا. تھوڑی دیر بعد ہم دونوں ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل ہو گئے.. پھر جھاڑیوں میں سے ہکلاتی عامر کی آواز آئی۔

''تارڑ صاحب آپ صراطِ مستقیم پر ہیں.. یہ والا راستہ تو آگے سے بند ہو گیا ہے۔''

میں نے بھی آواز لگائی کہ.. زندگی میں پہلی بار صراطِ مستقیم پر چلا ہوں.. اب تمہارا انتظار کرتا ہوں، واپس آ جاؤ..

میں نے انتظار کیا اور وہ آ گیا..

ہم چند قدم آگے چلے ہیں تو سامنے منظر یوں کھلا جیسے راضی بہ رضا محبوب کے بند قبا کھلتے ہیں..

''شائی مچو کا خیمہ شہر.. ندیاں اور صنوبر کے ٹھگنے درخت''

سامنے.. ایک جھاڑیوں بھرا.. ندیوں بھرا پھیلا میدان ہے جس کے پس منظر میں کچھ برفپوش بلندیاں ہیں جو بہت ناآشنا اور پُرفریب ہیں اور یہ میدان رنگ رنگ کے درجنوں خیموں سے بھرا ہے.. لگتا ہے کہ یہاں بھی ہو شے کی مانند ہمیں خیمے لگانے کے لیے جگہ نہیں ملے گی، یہ اتنا خیموں بھرا ہے.. ایک پتھریلی آماجگاہ بھی دکھائی دے رہی ہے جس میں گورا اور گوری لوگوں کا جمگھٹا پتہ نہیں کیا کر رہا ہے.. ہم دونوں نیچے ایک پُرشور نالے کی سطح پر آئے تو وہاں ایک بڑے پتھر پر ایک گورے کو گیان دھیان میں گم پایا.. وہ پانیوں کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا یعنی اپنے ہی قبیلے کا تھا، پاگل تھا.. ہم اسے دیکھتے اس کے قریب سے گزرے تو اسے خبر بھی نہ ہوئی کہ ہم گزرے ہیں.. وہ بھی گزرا ہوا لگتا تھا..

ذرا آگے ہوئے.. ایک ندی کو پھلانگ کر عبور کیا تو اس پُرہجوم خیمہ بستی میں داخل ہو گئے اور اس بستی کا نام اب کہیں مجھے یاد ہوا ہے.. یہ ہانگ چو نہیں شائی چو تھی..

ظاہر ہے ہم تو اس خیال میں مست تھے کہ وادیٔ نمپلو سے آگے.. مچلو اور تلس سے پرے یہاں تک کہ ہوشے ایسے دور افتادہ گاؤں سے بھی کہیں آگے ایک پیدل مسافت کے بعد جب ہم شب کے لیے کسی خیمہ گاہ میں پہنچیں گے تو وہاں ایک بڑی ویران گم صم تنہائی ہوگی.. بس ہم ہوں گے اور کوئی نہ ہوگا اور ہم آسمان سے باتیں کرتے پہاڑوں سے باتیں کریں گے.. عام طور پر تو یہی ہوتا تھا.. لیکن یہاں پہنچتے ہیں تو خیموں کا ایک گاؤں آباد ہے۔ نصف یورپ کے کوہ نورد یہاں خیمہ زن ہیں.. اور گورے اتنی تعداد میں گھومتے اور مسخریاں کرتے پھرتے ہیں کہ ٹریفک جیم ہو رہا ہے.. وہ جو پتھریلی آماجگاہ ہے تو دراصل کچھ ہوٹل سا ہے جس کے برآمدے میں میم لوگ

ٹانگیں پھیلائے کافی پیتا ہے اور اپنے مدت سے ان نہائے بدنوں کو کھجلی وغیرہ کرتا ہے..

ہماری آمد کو مجال ہے کسی نے بھی نوٹ کیا ہو.. ہوٹل کے قریب ندی کے اوپر ایک کھوکھا سا بنا ہوا تھا جس پر TWILIT لکھا ہوا تھا اور اس پینٹر کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا جس نے گندو گورو نالے والے پل کو پینٹ کیا تھا.. اگر آپ کی انگریزی کمزور ہے تو آپ کی اطلاع کے لیے یہ ''ٹائلٹ'' لکھا ہوا تھا... ندیوں کے بیچ کچھ ریتلے جزیرے سے ہیں جن میں مختلف گروپوں کے رہائشی ٹینٹ، ڈائننگ ٹینٹ اور کچن ٹینٹ ایستادہ ہیں.. اس جہان خیمہ جات میں ہم کھو سے گئے کہ ہم کدھر جائیں کہ نہ ہمیں کہیں اپنے خیمے نظر آ رہے تھے اور نہ پورٹرز دکھائی دیتے تھے..

یہ تمام گورا لوگ اسکولے سے کے ٹو بیس کیمپ تک جا کر پھر واپس درہ گندو گورو کے راستے یہاں شائی چو پہنچے تھے اور یہ ایک بہت ہی طویل اور سخت کوہستانی سفر کا اختتام تھا، اس لیے وہ ریلیکس کر رہے تھے.. مزے کر رہے تھے..

ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے ایک بلند قامت جرمن خاتون ٹائٹ جین اور بلاؤز میں پھنسی کھڑی ہے، سنہری بالوں والی ہے لیکن نہایت مردانہ شخصیت کی مالک ہے اور وہ اپنی آٹھ سالہ بیٹی کو... جو بالکل اپنی ماں کی آٹھ سالہ ہو بہو ہے.. ترغیب دے رہی ہے کہ یہ ندی خود چھلانگ کر پار جاؤ.. بچی اپنی پونی ٹیل لہراتی بڑے مزے سے چھلانگ لگا کر دوسری جانب چلی جاتی ہے..

''تارڑ صاحب..'' عامر پہلی بار بولا۔ ''یہ بچی بھی تو گندو گورو درہ عبور کر کے آئی ہو گی.. رسّوں کے سہارے نیچے اتری ہو گی.. تو یہ لوگ اگر اس عمر میں ہی اس قسم کی حرکتیں شروع کر دیتے ہیں تو ذرا جوان ہونے پر یہ کے ٹو یا ایورسٹ کی چوٹی پر بھی تو یونہی چھلانگیں لگاتے پہنچ جاتے ہوں گے..''

''یہ لوگ ہر قسم کی حرکتیں اسی عمر سے شروع کر دیتے ہیں اور نوجوان ہوتے ہیں تو استاد ہو جاتے ہیں.. ہم یہ حرکتیں اوّل تو کرتے ہی نہیں، اگر کرتے ہیں تو جوانی کے ڈھلنے پر شروع کرتے ہیں اور پھر ہمارا وہی حال ہوتا ہے جو... ہمارا اب ہو رہا ہے..''

ہم خیمہ بستی میں سے گزرتے.. ندیاں.. بلکہ چھوٹی چھوٹی برفانی نالیاں پار کرتے بالآخر شائی چو کے کناروں پر آ گئے جہاں ابھی سورج کی تمازت تھی اور ہمارے خیمے تھے.. کچن ٹینٹ قائم ہو چکا تھا اور اسحاق باورچی ایک بہت ہی شور کرتے سٹوو پر آلو کے قتلے فرائی کر رہا تھا.

علی موسیٰ ایک نہایت ہی غلیظ جگ میں ٹینگ کے زرد پانی گھولتا ہمارے پاس آ گیا..

یہ گندا جگ.. چند دیگچیاں.. ایک کڑاہی.. روٹیاں گرم رکھنے کے لیے ایک غلیظ پلاسٹک کا ہاٹ پاٹ۔ کچن ٹینٹ کے لیے ترپال وغیرہ سلمان نے ہوشے سے کرائے پر حاصل کیے تھے.. ہم نے تب تو ان کی مخدوش بُودار حالت کو دیکھ کر نہایت ناگواری کا اظہار کیا تھا لیکن جُوں جُوں ہم بلند ہوتے گئے، یہ آلات ہمیں عزیز تر ہوتے گئے.. کیونکہ جگ میں ٹینگ کا زرد جوس گھولا جاتا تھا.. کڑاہی میں قتلے اور بالآخر پکوڑے تلے جاتے تھے اور ہاٹ پاٹ میں ہمارے پراٹھے گرم رہتے تھے.. سلمان بھالو اور چوٹی زریں کا تازہ دم گھوڑا برسانی پہلے آ چکے تھے.. پھر میں اور عامر پہنچے.. حسن صاحب آئے اور پھر میاں صاحب اور شاہد لو برڈز کی طرح چہکتے پیار کرتے وارد ہوئے..

''واہ جی واہ..'' میاں صاحب کے کسے ہوئے کسرتی چہرے پر ایک ایسے کوہ نورد کی مسکراہٹ پھیلی جو دربدر ہوتا ایک ایسے مقام پر پہنچتا ہے جس کے سامنے انجانی چوٹیوں کی برفیں بلند ہوتی ہیں اور وہ اپنی تھکاوٹ بھول جاتا ہے۔ ''واہ جی واہ.. شاؤ چُو چُو کی کیا بات ہے..''

''یہ شاؤ چُو چُو نہیں ہے میاں صاحب۔'' سلمان نے ہنس کر کہا۔ ''شائی چُو ہے۔''

''اوئے مُسل مان.. تو پہلے کبھی ادھر آیا ہے؟''

''نہیں میاں صاحب۔''

''تو پھر تمہیں کیسے پتہ ہے کہ یہ شائی چُو چُو ہے یا شائی چُو ہے؟''

''ویسے شائی چُو ہے میاں صاحب..'' سلمان نے کھسیانے ہو کر کہا..

''ہو گا شائی چُو.. لیکن ایسی زبردست نامہ نیم جگہ ہے کہ اس کے ساتھ ایک اور ''چُو'' لگا دیں تو کیا حرج ہے۔ بزرگوں کو ٹوکا نہیں کرتے.. بھالو بچے..''

''میاں صاحب.. بھالو بن کر دکھاؤں؟''

''دکھاؤ..''

سلمان نے ہاتھ اونچے کر کے اپنی دونوں ہتھیلیاں نیچے کر لیں جیسے ریچھ ناچتے ہوئے کر لیتے ہیں..

''تم بہت اچھے بچے ہو..'' میاں صاحب نے نہایت محبت بھرے انداز میں داد دی..

''میں بہت اچھا بھالو ہوں..''

"سلمان تم مائنڈ نہیں کرتے جب تمہیں بھالو کہا جاتا ہے؟" شاہد نے نہایت سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"شاہد صاحب یہ مائنڈ کر جانے والے شعبے کے انچارج آپ ہیں.. یاد ہے جب آپ دیوسائی ٹریک کے دوران پائینچے چڑھائے جرابوں کے بغیر جوگرز پہنے میرے آگے چلتے تھے اور میں نے کہا تھا کہ شاہد صاحب آپ علاقہ.. کر کے آئے ہیں تو.."

"شٹ اَپ سلمان۔" میں نے اسے ڈانٹا۔

"سوری سر.."

سلمان ابھی ایک جنگلی سا بھالو تھا.. اور نہیں جانتا تھا کہ سینئرز کے ساتھ اس قسم کی بے تکلفی نہیں کیا کرتے.. ہم اسے سدھانے کی پوری کوشش کر رہے تھے..

ویسے کیا ہم سب میں اتنا بڑا دل تھا کہ ہم سلمان کی طرح اقرار کر لیں کہ ہم کیا کیا تھے.. کیا میاں صاحب اپنے آپ کو ایک شاطر شتر مرغ کہہ سکتے تھے.... میں اپنے آپ کو ایک مخرب الاخلاق گدھ قرار دے سکتا تھا.. شاہد ایک عیار لومڑ ہونے کا اقرار کر سکتا تھا.. بر سائی ایک سحر انگیز آنکھوں والا کوبرا ہو سکتا تھا.. عامر کہہ سکتا تھا کہ میں ایک سوچ میں گم رہنے والا واہیات اُلّو ہوں.. البتہ حسن صاحب کچھ بھی ہو سکتے تھے..

ہم سب میں کوئی نہ کوئی جانور ہوتا ہے لیکن ہم اقرار نہیں کرتے..

سلمان اقرار کر لیتا تھا..

ٹیم شائی چُو پہنچنے پر.. خوش ہو گئی تھی..

شائی چُو.. کسی حد تک کے ٹو ٹریک کے دوران اشکولے کے بعد آنے والی خیمہ گاہ کوروفون سے مشابہ تھا.. وہاں بیافو کی بُوتھی، خیمہ گاہ پر معلق بادلوں اور دُھند میں تھی اور اُس میں سے جو ندیاں نکلتی تھیں، وہ نیچے رتبلے میدانوں میں اُترتی اور پھیلتی تھیں اور یہاں جو ندیاں تھیں وہ گندو گورو گلیشیر میں سے نکل کر شائی چُو میں رواں ہوتی تھیں.. ندیاں تھیں.. جھاڑیاں اور صنوبر کے ٹھگنے درخت تھے لیکن یہاں ہجوم بہت تھا.. کوروفون میں.. کم از کم اُس شب.. صرف ہم تھے..

ہمارے خیمے شائی چُو کے کناروں پر.. ایک برفانی اور بہت ہی خاموش سی ندی کے کنارے اپنے رنگ رنگ وجودوں کے ساتھ ایستادہ ہو چکے تھے اور ہم گھر والے ہو چکے تھے.. اس ندی کے پار.. جدھر سے ہم آئے تھے اس جانب کسی ہسپانوی گروپ کے بے شمار خیمے تھے اور

انہوں نے ہماری آمد اور ہمارے خیموں کو ناپسند کیا کیونکہ ہم نے اُن کا منظر بلاک کر دیا تھا..

اور یہ منظر.. اجنبی اور نا آشنا برفیلی چوٹیوں کا دل کش اور سحر انگیز تھا اور اب ہمارے خیموں کے بالکل سامنے.. ایک بڑے گلیشیئر اور ایک بڑی ویرانی سے پرے یوں بلند ہوتا تھا جیسے وہ صرف ہمارے لیے ہی ہو..

کچن ٹینٹ میں ہمارا نیا خرید کردہ چولہا دھڑ دھڑ جلتا تھا اور اس پر رکھی کڑاہی میں سے آلو کے گرم گرم قتلے اُتر رہے تھے جو ٹماٹو ساس کے ہلکے سے چچ کے ساتھ اپنی گرمی ذرا سی بجھا کر ہمارے منہ میں اُترتے تھے اور ہم خیموں کے آگے شانت بیٹھے سامنے کے منظر کو دیکھتے جاتے تھے..

ابھی ہم سائے میں بیٹھنا چاہتے تھے اور ابھی دوپہر ڈھل گئی.. تمازت رخصت ہوئی تو اس کی جگہ ایک سرد ہوا چلنے لگی..

"کیا بات ہے شائی چُو چُوکی.." میاں صاحب نے پھر داد دی..

میاں صاحب میں... بے لگام قدرتی اور پہاڑی منظروں کو اپنے سراپے میں وصول کرنے کی ایک ایسی حس ہے کہ وہ ان میں کھو جاتے ہیں.. اور انہیں بیان کرنے کے لیے گفتگو میں موتی پرونے کی کوشش نہیں کرتے بس ایک "واہ جی واہ" یا "کیا بات ہے" کہہ کر اپنا مکمل اظہار کر دیتے ہیں۔ مجھے یاد ہے جب بڑے دیوسائی سے مرتضیٰ کیمپ میں اُترتے ہوئے جیپ کی اگلی نشست پر براجمان جب ہم دونوں کے سامنے یکدم چھوٹے دیوسائی کی سرسبز.. حیرت انگیز.. ایک وادی میں اُترتی سفید ندی اور اس پر سفید بادلوں کے پرے کے پرے.. اور قطعی طور پر ناقابلِ یقین حُسن کی دنیا دکھائی دی تو ہم دونوں نے "سبحان اللہ.. سبحان اللہ" کا ورد شروع کر دیا تھا.. اس کے سوا ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ہم کیا کریں، کیا کہیں؟ تو یہاں بھی ان کا یہی کہنا کہ.. کیا بات ہے شائی چُو چُوکی.. اس منظر کو بیان کرنے کے لیے کافی تھا..

علی موسیٰ ایک بلتی بچہ پورٹر.. میں اُس سے سوال کر رہا تھا اور وہ مجھے سامنے والے پہاڑوں کے بارے میں بتا رہا تھا.. "صاحب.. یہ جو برف والا وہ چوٹی اُدھر شائی چُو سے بہت نظر آتا ہے.. اُس پتھریلے اُبھار اور پھر ایک بڑا گلیشیئر کے آخر میں.. قریب نہیں.. لیکن قریب نظر آتا ہے تو یہ کے[1] سکس اور کے سیون کا چوٹی ہے.. بہت لوگ اُدھر شائی چُو میں اس لیے آتا ہے کہ اُدھر ان چوٹی کے بیس کیمپ میں جائے.. صاحب ہم تو اُدھر گیا ہے بہت خوبصورت جگہ ہے ناں.."

---

1 K6 'K7

"تو کیا گندوگورو درّے کے بیس کیمپ سے بھی زیادہ خوبصورت جگہ ہے؟"

"تو اور کیا صاحب.. گندوگورو کا بیس کیمپ تو کچھ بھی نہیں.. فضول ہے.. اور پھر بھی سب لوگ اُدھر جاتا ہے۔ اُدھر کے سکس اور کے سیون کا جو بیس کیمپ ہے اُدھر جھیل ہے اور میدان ہے.. اور میدان میں یہ اتنا بڑا بڑا اونچا گھاس ہے کہ اس میں بندہ چھپ جاتا ہے.. ایسا گھاس ہے۔"

"اچھا؟" ہم میں سے کسی کا منہ کھُل گیا..

"جھیل ہے اور بہت بڑا بڑا گھاس ہے علی موسیٰ.." کسی اور نے ایک آہ بھری..

"ہاں ناں.."

"تارڑ صاحب.. یہ کیسا رہے گا.. گندوگورو نہ جائیں اُدھر کے سکس اور کے سیون کے بیس کیمپ میں چلیں جدھر جھیل ہے اور لمبا لمبا گھاس ہے.." کسی نے صلاح دی..

"اُدھر لمبا لمبا گھاس کیوں ہے؟" میں نے پوچھا..

"اس لیے صاحب کہ اُدھر تک مویشی نہیں پہنچ سکتا.. راستہ مشکل ہے تو مویشی مر جاتا ہے۔ اس لیے اُدھر لمبا لمبا دنیا جہان کا گھاس ہے۔"

"اگر اُدھر مویشی نہیں پہنچ سکتا تو ہم کیسے پہنچ سکتا ہے علی موسیٰ؟"

کوہ نوردوں کا ایمان بڑا کمزور ہوتا ہے.. انہیں پہاڑوں کا کوئی اجنبی خواب دکھا دیا جائے تو وہ فوراً بے ایمان ہو جاتے ہیں.. ایسے ندیدے بچے ہوتے ہیں کہ ایک ٹافی ہاتھ میں ہے اور دوسری دیکھتے ہیں تو رال ٹپکنے لگتی ہے... ہم نے ایک بار مشابرم کو ترک کر کے گندوگورو کو چُن لیا تھا اور اب ایک مرتبہ پھر بے وفا نہیں ہونا چاہتے تھے..

ویسے اس لمحے ہمارے اردگرد شائی ٹو میں شام ہی شام تھی لیکن سامنے کے سکس اور کے سیون اسی شام کی آخری کرنوں کے سونے سے اپنے لیے برفانی جُھمکے، جھانجریں اور کنگن بنا رہی تھیں.. زرد رنگ کے ایسے برفانی گہنے بنا رہی تھیں کہ ہم میں سے کوئی بھی ان زرد شہزادیوں کے عشق میں مبتلا ہو کر گندوگورو جانے سے انکاری ہو سکتا تھا.. اور اگر کوئی ایک ہو جاتا تو ہم سب ہو جاتے.. اور پھر ان زرد شہزادیوں کے دامن میں ایک جھیل بھی تھی اور لمبا لمبا گھاس بھی تھا..

"نہیں نہیں پہنچ سکتا ہے صاحب.. گندوگورو سے آسان ہے.. دیکھیں ہمارے ٹینٹ کے آگے جو ایک میدان سا ہے جس کے ایک طرف دریا ہے تو اس میدان کے آگے وہ چھوٹا خشک

پہاڑی ہے ناں.. آدھے گھنٹے میں اُدھر پہنچے گا.. پہاڑی سے آگے ایک گلیشیر ہے اُس پر چل کر پہلی رات کرے گا اور اس سے اگلے دن کے سکس کے بیس کیمپ پہنچ جائے گا.. یہ لمبا لمبا گھاس ہے صاحب اور جھیل ہے اور.."

یہاں پر ہم نے علی موسیٰ کی زبان بندی کر دی کیونکہ ہم پھر بے ایمان ہونے کو تھے..

کہتے ہیں جس سروے کرنے والے نے ان شمالی علاقوں کو نقشے پر لانے کے لیے یہاں کی چوٹیوں کی بلندی کا حساب کتاب کیا۔ اُس نے چوٹیوں کے ایک پورے سلسلے کا نام "کے" سے شروع کیا اور پھر اپنے تئیں جو سب سے بلند چوٹی تھی، اُسے کے وَن کا نام دیا.. اس کے بعد جو کم بلندی کی چوٹی تھی اُسے کے ٹو کہا.. اور پھر تھری فور فائیو کے بعد کے سکس اور کے سیون کو شناخت ملی..

بہت بعد میں جب ذرا تفصیل سے بہتر آلات کی مدد سے بلندیاں ناپی گئیں تو معلوم ہوا کہ بلند ترین بلکہ دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے ٹو تھی..

چنانچہ ہمارے سامنے زرد اور بجھتی کرنوں کے گہنوں سے لدی جو دو چوٹیاں تھیں، وہ کے ٹو کی بہنیں تھیں.. اور یہ کمبخت بہنیں اتنی سوہنی تھیں کہ اس سے اس سردیلی شام میں شائی ٹو کی شام میں اُن کے بلاوے آتے تھے..

کہتے ہیں کہ ادھر سے.. مقاماتِ مقدسہ کی جانب سے بھی بلاوے آتے ہیں تب انسان اُدھر کوچ کرتا ہے یہ اپنے بس کی بات نہیں ہوتی..

کے سکس اور کے سیون بھی حجرِ اسود کی مانند ایک بلاوے کی قوت رکھتی تھیں کیونکہ دونوں میں کم از کم پتھر ہونا مشترک تھا..

ہم کوشش کر رہے تھے کہ اس بلاوے پر دھیان نہ دیں.. اس لیے اُدھر دیکھنے سے اجتناب کرتے تھے۔ ادھر اُدھر دیکھتے تھے۔ چنانچہ اس کوشش میں کسی نے دائیں جانب جو پہاڑ تھا اس کے اوپر ٹہلتے ہوئے دو یاکوں کی نشاندہی کی اور حیرت کا اظہار کیا کہ یہ کمبخت وہاں تک کیسے پہنچ گئے ہیں..

"جیسے وہ ہمیں نیچے یہاں دیکھتے ہوئے ایک دوسرے سے پوچھتے ہوں گے کہ یہ کمبخت یہاں کیسے پہنچ گئے ہیں.."

شائی ٹو میں اگرچہ ہر طرح سے خیریت رہی لیکن ایک چھوٹا سا سانحہ ہو گیا..

میاں صاحب نے اپنے خیمے سے شاہد کو دھکیل کر باہر نکال دیا.. اس کا ساز و سامان، سلیپنگ بیگ وغیرہ باہر پھینک کر اُسے خیمے سے عاق کر دیا۔ "خان صاحب اپنا بندوبست خود کرو.. میں نوکر لگا ہوا ہوں تمہارا کہ اپنا خیمہ لاؤں.. اسے خود لگاؤں اور پھر تمہیں سلاؤں.. اور پھر تم رات کو خراٹے مار مار کر میرا کچلوس اُڑا دو.. ہوشے میں میں ساری رات سو نہیں سکا.. آج چلنے میں سب سے پیچھے تھا.. کیوں؟ صرف تمہارے نامعقول خراٹوں کی وجہ سے.."

شاہد اپنے بوریے بستر پر ایک اُداس پناہ گزین کی طرح بیٹھا تھا..

"میاں صاحب.." میں نے دخل در نامعقولات کرنے کی کوشش کی۔

"بس جی آپ لیڈر ہوں گے تو اپنے گھر ہوں گے۔" انہوں نے مجھے بھی جھاڑ پلا دی۔ "میں کل ساری رات سو نہیں سکا.. ایسی پارٹی مجھے وارا نہیں کھاتی جس میں خراٹے ہی خراٹے ہوں۔"

میاں صاحب واقعی جلال میں تھے کیونکہ ان کی ہر "ز" جو تھی وہ "ز" میں بدل رہی تھی..

"لیکن میاں صاحب آپ دونوں تو برسوں سے اکٹھے سوتے آئے ہیں..."

"وقت وقت کی بات ہے جناب.. اب برداشت نہیں ہوتا.. نہ میں جب خیمہ لگانے لگتا ہوں تو یہ اِدھر اُدھر ہو جاتا ہے اور جب خیمہ تیار ہو جاتا ہے تو کہیں سے نمودار ہو کر کہتا ہے.. میاں صاحب کچھ ہیلپ کروں.. میرے تو اوپر نیچے کے بال جل جاتے ہیں یہ سُن کر.. تو جناب گڈ بائے ہے میری طرف سے.."

"میاں صاحب کو بلندی ہو گئی ہے تارڑ صاحب.. ان کی باتوں کا مائنڈ نہ کریں۔" شاہد نے کھسیانے ہو کر ذرا سرگوشی میں مجھ سے کہا لیکن میاں صاحب نے سُن لیا اور چمک اُٹھے۔ "نہ میں تم سے کہہ رہا ہوں تو مائنڈ تم نے کرنا ہے کہ تارڑ نے.. اوئے بھائی مجھے تو کنکورڈیا میں بلندی نہیں ہوئی تھی یہاں شائی چو چو میں کیسے ہو جائے گی.... بس میری آنکھیں کھل گئی ہیں.. لیکن پارٹی کا معاملہ ہے، میں تمہارے لیے کچھ بندوبست کر دیتا ہوں۔"

میاں صاحب نے سامان میں سے ایک خیمہ نکالا جو برمائی اپنے ساتھ لایا تھا اور جس پر "پاکستان زندہ باد" لکھا ہوا تھا اور صرف اس مقصد کے لیے ساتھ لایا تھا کہ اگر کہیں ٹائلٹ ٹینٹ کی ضرورت پڑے تو اسے استعمال میں لایا جائے.. ورنہ وہ کوئی ایسا خیمہ نہ تھا جس میں کوئی خوددار شخص رات گزار سکے..

میاں صاحب نے وہ خیمہ نصب کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ایسا نامرد تھا کہ ایستادہ ہونے سے انکاری ہوتا جاتا تھا.. میخیں بھی پوری نہیں تھیں اور طنابیں بھی ٹوٹی ہوئی تھیں اور میاں صاحب اسے زبردستی کھڑا کرنے کی کوشش کر رہے تھے.. میاں صاحب اس پر پتھر رکھ کر اسے قائم رکھنے کی سعی کر رہے تھے..

"یہ تو ذرا سی ہوا کے چلنے سے گر جائے گا میاں صاحب.."

"نہیں گرتا تارڑ صاحب.. میں نے بہت سارے پتھر رکھ دیئے ہیں.. اگر گر بھی جاتا ہے تو اندر سونے والا ہلاک تو نہیں ہو جائے گا۔ اس کے گرنے سے.. آپ ذرا ملاحظہ کریں کہ اب بھی اس کے لیے میں ہی خیمہ لگا رہا ہوں اور یہ.. یہ شاہد مزے سے بیٹھا مسکرائے جا رہا ہے میری ہیلپ نہیں کرتا.."

میاں صاحب فُل فارم میں تھے..

اُن سے بحث کرنا فضول تھا..

بالآخر جب وہ خیمہ کچھ نیم ایستادہ سا ہو گیا تو شاہد کو اس میں دھکیل دیا گیا.. شاہد اُس کے پردوں میں سے سر نکال کر ہمیں انتہائی حسرت سے دیکھنے لگا..

برمائی کہنے لگا۔ "لگتا ہے شاہد صاحب سیلاب زدہ ہیں اور خیراتی خیمے میں پناہ لیے ہوئے امدادی کھانے کا انتظار کر رہے ہیں۔"

شاہد نے حسبِ عادت اپنے چند بال نہایت اہتمام سے سنوارے.. عینک اتاری اور چندھیائی ہوئی آنکھوں سے ہمیں دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "جی سر.. بڑا ظلم ہوا ہے سیلاب میں سب کچھ بہہ گیا ہے۔"

اس سانحے کے دوران کے ٹو کی دونوں بہنیں اپنے زرد گہنے اُتار کر نیند میں چلی گئی تھیں.. شائی چو میں ایک سرد ہوا اتری اور ہم اپنی گرم جیکٹیں تلاش کرنے لگے..

کھانے کے بعد.. جو بہت ہی واجبی کھانا تھا.. ہم سب اپنے اپنے خیموں میں چلے گئے.. البتہ شاہد کا سر اس کے امدادی خیمے کے پردے میں سے نظر آتا رہا..

شائی چو کی خیمہ گاہ.. اور ہم تو اس کے کناروں پر مقیم تھے.. بارونق تھی.. کہیں کہیں گیس لیمپ روشن تھے اور اجنبی زبانوں کے فقرے ہوا کے دوش پر تیرتے ہمارے کانوں تک آتے تھے اور ان میں ڈھول کی تھاپ بھی رُک رُک کر آتی تھی.. جیسے کافرستان کی رات میں برون گاؤں سے

ڈھول کی آواز نیچے وادی میں رُک رُک کر اترتی ہے..

"کل ہم نے کس مقام پر پہنچنا ہے سلمان؟"

سلمان نے ایک کروٹ بدلی جو کسی بھونچال کی چھوٹی ہمشیرہ تھی اور بولا "دل سنگ پا"

"کیا؟" عجیب واہیات نام تھے اس ٹریک کے..

اس نے پھر دوہرایا..

"دل تنگ پا؟"

"نہیں سر ہمارا دل اتنا تنگ نہیں.. یہ دل سنگ پا ہے جہاں ہم نے پہنچنا ہے اور اس کا مطلب ہے۔ "پھولوں کے کھیت" کل ہم وہاں جائیں گے.."

"واہ" میں نے کہا..

تھکا ہوا تھا.. پھولوں کے کھیت کے خیال میں گُم.. دھیرے دھیرے اس نیند میں اترنے لگا جسے میں کبھی ایک عارضی موت سے تشبیہ دیتا تھا لیکن اب.. اس عمر میں اس کی ہمیشگی کے بھی امکانات تھے..

حسن صاحب ہلکے ہلکے خراٹے لینے لگے.. وہ اتنے بلند نہ تھے کہ انہیں خیمہ بدر کر دیا جائے..

حیرت انگیز طور پر سلمان نہایت بے آواز سوتا تھا.. اور یہ ثابت کرتا تھا کہ صرف انسان خراٹے لیتے ہیں بھالو نہیں..

"مُجراں ان شائی چو.. بابا فلاکت زدہ اور رقص کرتے حسن صاحب"

ڈھول کی تھاپ مسلسل آتی تھی..

اور اس کے ہمراہ کچھ نامانوس گیت تھے جو سرد ہواؤں کے ساتھ سفر کرتے آتے تھے.. میں ابھی ہوش سے آیا تھا، چنانچہ ہوش سے نیند میں مدہوش ہونے کے مراحل میں کہیں ہچکولے کھا رہا تھا جب مجھے ایک مدھم سی آواز آئی۔ "تارڑ صاحب.. تارڑ صاحب.."

خیمے کے باہر کوئی تھا..

میں نے اسی نیم مدہوشی کے عالم میں کہا۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں قادر.."

"کون قادر؟"

"سر.. اشرف امان کا کزن.. جس نے آپ کے لیے "پاک سرائے" کے سفر کے لیے وادیٔ اشکومن تک جیپوں کا بندوبست کیا تھا.. سوری ٹُو ڈسٹرب یُو سر.."

"یار مجھے اب جیپوں کی ضرورت نہیں.. تم یہاں کیسے آ گئے ہو..؟" میں نے بیزاری سے کہا۔

"صاحب مجھے تو ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ ادھر شائی چو میں پہنچے ہو.. میں اپنا گروپ لے کر ادھر کے ٹو سے گندوگورو کے راستے ادھر اُترا ہوں تو.. صاحب اُدھر ہوٹل کے پاس سارے پورٹر لوگ اور گائیڈ لوگ مزا کرتے ہیں.. ڈھول بجاتے ہیں اور ناچتے ہیں تو ان کو بھی معلوم

ہو گیا کہ آپ ادھر ہو تو وہ کہتے ہیں کہ تارڑ صاحب کو درخواست کر.. کہ آ جاؤ.. آ جاؤ صاحب.. مہربانی ہو گا.."

میں آنکھیں ملتا اپنے سلیپنگ بیگ میں سے کھسکتا نہایت مشقت کرتا خیمے سے باہر آیا تو اندھیرے میں ایک بار پھر قادر کھڑا تھا اور مسکرا رہا تھا..

"سوری سر.. آپ سو گیا تھا..؟"

"نہیں ہم کبڈی کھیل رہا تھا۔"

"جی؟"

"نہیں.. نہیں سو یا تھا.. کیسے ہو قادر؟.. داڑھی میں اچھے لگتے ہو۔"

"تھینک یو سر.. تو تشریف لائے گا.."

"صرف میں نہیں پورا ٹیم تشریف لائے گا.." میں نے سوچا اگر میری نیند برباد ہوئی ہے تو بقیہ حضرات کیوں خوابِ خرگوش کے مزے لوٹیں۔ چنانچہ میں نے ٹیم ممبران کو پکارنا شروع کر دیا۔ میری آواز پر صرف سلمان، میاں صاحب اور حسن نے لبیک کہا اور گرتے پڑتے خیموں سے باہر آ گئے۔

باہر سردی تھی..

"کدھر قادر؟" کیونکہ اندھیرے میں کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ یہ محفل جو سجی ہے تو کدھر سجی ہے..

"میرے پیچھے آ جائیں صاحب.." قادر اندھیرے میں ندیاں پھلانگنے لگا.. اور ہم بھی جو نیت امام کی کے مصداق اس کے پیچھے پیچھے اندھا دھند چھلانگیں لگانے لگے.. کبھی اندازہ نہ ہوتا تو کسی برفانی نالی کے پار جانے کی بجائے اس کے درمیان میں لینڈ کر جاتے، جو گرز بھگوتے گرتے پڑتے رقص گاہ تک پہنچ گئے..

یہ تو وہی جگہ تھی گزرے تھے ہم جہاں سے.. جہاں گوریاں ٹانگیں پھیلائے کافی پیتی تھیں اور ندی پر بنا جہاں ایک کھوکھے پر TWILIT لکھا تھا..

ہمارے لیے جگہ بنائی گئی.. بنچ اور کرسیاں خالی کر دیے گئے.. ان کے سامنے شائی چو کی شب میں مردانہ مجرا ہو رہا تھا..

پتھریلی آماجگاہ کے برآمدے میں ایک چھپر تلے کرسیاں لگی تھیں اور ان پر طرح طرح

کے ناظرین اور شائقین لگے تھے اور ان سب کی ہتھیلیاں ان کی آنکھوں کی سطح پر تھیں اور تالیاں بجاتی تھیں.. درجنوں پورٹر، گائیڈ، ٹور آپریٹر.. باورچی.. ہائی پورٹر.. کوئی ہنزہ کا.. کوئی نگر کا.. گلگت کا.. وادیٔ شگر یا اسکولے کا.. سب کے سب آپس میں مقامی مخاصمت رکھنے کے باوجود اس شب شائی چو میں مسرت سے چھلکتے تھے.. خوشی سے بے خود ہوئے جاتے تھے.. ناچتے تھے.. تالیاں بجاتے تھے۔ گاتے تھے، ڈھول بجاتے تھے.. کنستروں پر تھاپ لگاتے تھے اور شور مچاتے تھے..

دراصل آج کی شب ان کے لیے کوہ نوردی کی مزدوری اور مشقت کی آخری شب تھی.. وہ سکردو سے چلے تھے.. اسکولے کے راستے کے ٹو بیس کیمپ تک پہنچے تھے اور پھر مشابرم گلیشیر عبور کر کے دڑہ گنڈو گورو پار کرتے ہوئے نیچے یہاں شائی چو میں پہنچ گئے تھے..

اور کل انہوں نے ہوشے میں ہو جانا تھا.. جہاں ان کے لیے جیپیں منتظر تھیں.. انہوں نے فارغ ہو کر.. اُجرت کے نوٹوں سے گرم جیبوں کے ساتھ اپنے گھروں کو لوٹنا تھا.. ان کی سرخوشی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انہیں آج طے شدہ مزدوری ادا کر دی گئی تھی کہ یہ ٹریک کا آخری پڑاؤ تھا..

تماشائیوں اور رقاصوں میں کچھ فرق نہ تھا..

ہر تماشائی کبھی نہ کبھی رقاص ہو جاتا تھا..

اس اکھاڑے کے بیچ اگرچہ ہر کوئی کود جاتا تھا لیکن ان میں سٹار پرفارمر ایک ہی ہوتا تھا جو اپنے کمالِ رقص دکھاتا سب کی توجہ حاصل کر لیتا تھا.. وہ مردِ میدان تھک جاتا تو ایک اور دھم سے اکھاڑے میں کود پڑتا.. بلکہ مردِ میدان بہت تھے اور میدان ان کے لیے مختصر تھا..

اس اکھاڑے میں ایک ایسے صاحب تھے جو مسلسل تھے اور رقاصوں اور گویوں کو بلا شیری دینے پر معمور تھے.. جیسے امریکی فٹ بال یا بیس بال کے میچ میں چیئر لیڈر ہوتے ہیں جن کا کام ہی یہی ہوتا ہے کہ وہ عوام کو اشتعال دلاتے رہیں..

یہ چیئر لیڈر رات ان تھک اور روحانی مسرت سے لبریز تھا کہ اگلے دو گھنٹوں میں میں نے اسے ایک لمحے کے لیے غیر متحرک نہ دیکھا.. نہ اس کی چوڑی بے مہار مسکراہٹ کو سٹ کر ہونٹوں میں غائب ہوتے دیکھا اور نہ اس کی تالیاں بجاتی ہتھیلیوں نے ایک پل بھی آرام کیا.. وہ مسلسل تالیاں بجاتا.. رقص کرتا ایک مست درویش تھا جو ہر رقاص کی آمد پر بے پناہ مسرت کا اظہار کرتا۔ اس کے رقص کی بے پناہ داد دیتا بے خود تھا.. تماشائیوں میں جو پورٹر اور گائیڈ رقص کے ماہر تھے، وہ ان کے ہاتھ پکڑ کر انہیں میدانِ عمل میں لے آتا.. اس کی سرخوشی دیکھنے کے لائق تھی.. پتہ

نہیں اس کی اس بے مہار مسرت کا سبب کیا تھا.. اس کی خوشی کس منبعے سے پھوٹتی تھی.. مسلسل حرکت کرتا.. ناچتا.. کبھی ڈھول والے کو داد دیتا اور کبھی بنسری نواز کی تال پر ناچتا.. میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اتنا خوش کیسے ہو سکتا ہے..

شائد اس لیے کہ میں جس گھٹے ہوئے بے روح معاشرے سے یہاں شاؤ چوک آیا تھا وہاں اتنی بے پناہ مسرت کا.. بلکہ بے جواز مسرت کا رواج نہ تھا..

ڈھول کی تھاپ شائی چوک پر تیرتی اس کی ندیوں اور صنوبر کے درختوں کو ہماری طرح اندھا دھند پھلانگتی کے سکس اور کے سیون کی برفوں تک جاتی تھی.. عام پورٹر.. دریدہ دامنوں والے.. پھٹے پیراہنوں والے.. پاؤں میں کینوس شوز جرابوں کے بغیر.. وہ بھی اپنے ساتھی پورٹروں کے رقص کرنے پر ان پر نئے نوٹ بے دریغ نچھاور کر رہے تھے.. غربت میں بھی.. اتنا بڑا دل رکھنا انہی اہل شمال کا خاصا ہے.. ایک غریب مزدور خون پسینے کی کمائی کو بھی سینے سے لگا کر نہیں رکھتا.. شائی چوک رات میں کسی اجنبی رقاص پر لٹا دیتا ہے.. وہ کسی ایک نوٹ سے اپنے لیے ایک عمدہ بوٹ خرید سکتا ہے.. چند نوٹوں سے ایک گرم جیکٹ حاصل کر سکتا ہے لیکن وہ پھٹے ہوئے بوٹوں اور چیتھڑا جیکٹ میں رہ سکتا ہے.. اپنی مسرت کے اظہار کے طور پر اکھاڑے میں ناچتے کسی شخص پر نوٹ پھینکنے سے نہیں رہ سکتا..

میں نے کہیں پہلے بھی لکھا ہے کہ اہل شمال میں رقص کی ایسی حس ہے ان کے بدن میں ایک ایسی ردھم ہے جو بقیہ پاکستان میں کم کم ہی پائی جاتی ہے اور ان کے رقص میں کہیں بھی نسوانیت کی لچک کا رنگ نہیں ملتا.. انہیں دیکھ کر یہ یقین ہو جاتا ہے کہ رقص تو صرف مردوں کے کرنے کی چیز ہے اور عورتوں کو اس کی اجازت نہیں ہونی چاہیے..

مسلسل تالیاں بجانے والے اور مسلسل مسکرانے والے شخص نے زمین پر پھسکڑا مار کر بیٹھے ہوئے ایک بابا جی سے درخواست کی کہ وہ میدان میں آئیں.. بابا جی نے کچھ دھیان نہ دیا.. ان سے پھر گزارش کی گئی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے بالآخر ان کی منت سماجت کی گئی اور اس کے ساتھ شائقین نے بھرپور تالیاں بجا کر انہیں مجبور کر دیا کہ وہ میدان میں اتر آئیں..

یہ بابا جی نہایت فلاکت زدہ تھے..

پھٹے پرانے کپڑوں میں تھے.. بھوری آرمی جیکٹ کی سب جیبوں کی زبانیں لٹک رہی تھیں۔ کسی گورے کی عطا کردہ پتلون جو پاجامہ ہو چکی تھی، بابا جی کے گھٹنوں کی نمائش کرتی

تھی.. ان کی میلی چیکٹ اُونی ٹوپی میں بھی سوراخ تھے.. یہاں تک کہ ان کے دانت بھی پورے نہ تھے.. لیکن جب وہ اُٹھے تو کل مخلوق نے نعروں اور تالیوں سے شائی چوک کا آسمان جو بلندی کی وجہ سے نیچے آ چکا تھا اسے سر پر اٹھا لیا.. وہ کسی نہ کسی فن میں کوئی نہ کوئی کمال تو رکھتے تھے..

بابا فلاکت زدہ نے نہایت سنجیدگی سے اپنے اعزاز میں پیٹی جانے والی تالیوں کا جھک کر شکریہ ادا کیا جیسے وہ ایسے استقبال کے عادی تھے.. انہوں نے دو چھوٹے چھوٹے طبلہ نما ڈھول جو شائد انہوں نے خود بنائے تھے، اپنے سامنے رکھے اور شہتوت کی دو چھڑیوں سے انہیں جل ترنگ کی مانند بجانے لگے.. ان پر ایک خاص لے میں ضرب دینے لگے.. اور تالیوں میں مزید اضافہ اور تحسین کے نعرے.. اور پھر منہ کھول کر.. اتنا منہ کھول کر کہ ان کے بقیہ ماندہ.. اور جو چیدہ چیدہ دانت تھے، گنے جا سکتے تھے.. گانے لگے.. اب جو بابا فلاکت زدہ نے پہلی تان اٹھائی ہے تو غدر مچ گیا.. یوں جیسے ام کلثوم سٹیج پر آ گئی ہو.. نور جہاں نے ''آواز دے کہاں ہے..'' شروع کر دیا ہو اور مہدی حسن نے ''گلوں میں رنگ بھرے'' چھیڑ دیا ہو.. ایسے غدر مچ گیا..

میرے برابر میں بیٹھے ایک باریش بزرگ جو اگر سبز چوغہ زیب تن کر کے لاہور کے کسی پاش علاقے میں دھرنا مار کر بیٹھ جاتے تو پیر سائیں ہو جاتے اور معتقدین ان کے پاؤں دھو دھو کر پیتے.. بقیہ ناظرین کی مانند مسلسل تالیاں پیٹنے میں مصروف تھے۔ انہوں نے کھڑے ہو کر بابا فلاکت زدہ کا استقبال کیا.. وہ موسیقی اور اس کی تال سے اتنے سرکش اور سرمست ہو رہے تھے کہ دوران گفتگو میں نے پوچھ ہی لیا.. اور اس لیے پوچھ لیا کہ اتنی سرمستی اور بے خودی تو نشے کی کسی بند بوتل کو کھول کر ایک ہی سانس میں چڑھا جانے کے بعد ہی ممکن ہوتی ہے کہ.. بزرگو آپ ٹُن ہو؟

بزرگوں نے پہلے تو میرے لاہوری محاورے ''ٹُن'' کی رمز نہ پائی اور جب میں نے ذرا کھول کر بیان کیا تو انہوں نے اپنی ہتھیلیوں کو تالیاں پیٹنے سے لمحہ بھر کے لیے فارغ کیا اور انہیں ریش مبارک پر پھیرتے ہوئے بولے ''نہیں تارڑ صاحب.. اب تو نہیں.. اب تو میں نے حج کر لیا ہے۔''

''اور جب آپ نے حج نہیں کیا تھا تو..''

''رات گئی بات گئی۔'' حاجی بابا ہنس کر بولے۔ ''جوانی میں تو سب چلتا ہے.. اب تائب ہو چکا ہوں۔''

''تو بزرگو یہ بے حساب سرخوشی اور سرمستی ابھی تک کیسے قائم ہے؟''

"یہ تو ایامِ جاہلیت میں جو خمار ہوئے تھے، ان کا اثر ابھی تک چلا آتا ہے۔"

میں نے نوٹ کیا کہ بابا فلاکت زدہ پر بھی نوٹ نچھاور کیے جا رہے ہیں.. کبھی کوئی چاہنے والا ان پر نوٹ وار کے ہوا میں اچھالتا تھا اور کبھی کوئی سنجیدہ شوقین ان کے ڈھول کے نیچے چپکے سے کچھ رقم رکھ آتا تھا.. بابا فلاکت زدہ البتہ اپنی دیوانگی میں بھی ہوشیار تھے اور ان نوٹوں کو سمیٹ کر اپنی جیکٹ کی جیب میں اچھی طرح سنبھال لیتے تھے.. اور کسی ایک نوٹ کو بھی آگے پیچھے نہیں ہونے دیتے تھے..

بابا اُمِ کلثوم عام طور پر بلتی لوک گیت گا کر داد وصول کرتے تھے لیکن کبھی کبھی کوئی چالو فلمی گیت شروع کر کے اُسے بلتی کا ری مکس بنا دیتے تھے.. جیسے "چن میرے مکھناں" کا اپنے حساب کتاب سے ری مکس کر لیا گیا ہے.. چنانچہ ایک گیت.. آپ یقین کریں یا نہ کریں.. "بیجو باورا" کا "بچپن کی محبت کو دل سے نہ جدا کرنا" سے شروع ہوا اور اس کے بعد اس کا بلتی ترجمہ پیش کیا جانے لگا.. پھر جانے کہاں سے "ویر میرا گھوڑی چڑھیا" آ گیا اور ویر صاحب اور جس گھوڑی پر وہ چڑھے تھے بلتی زبان میں منتقل ہو گئے.. دھن وہی جاری رہتی لیکن زبان بدل جاتی.. "شہباز قلندر" کی بھی باری آئی اور وہ بھی بلتستان میں دھمال ڈالنے لگے..

میں نے پائیو میں ریشماں کا "وے میں چوری چوری" کا بلتی ری مکس بھی سنا تھا..

بابا فلاکت زدہ کہیں بلند پہاڑوں میں.. کہیں شائی چو میں ایک پاپ سٹار تھے.. لیکن یہ حقیقت تھی کہ بابا فلاکت زدہ ایک ان پڑھ اور عام پہاڑی پورٹر ہونے کے باوجود ردھم میں تھے.. جڑواں طبلہ نما چھوٹے چھوٹے ڈھولوں کو شہتوت کی ٹہنیوں سے جل ترنگ کی طرح بجاتے بے سُرے نہیں ہوتے تھے نہ صرف یہ کہ ان کی پھٹی ہوئی جیکٹ کی جیبیں نوٹوں سے ٹھنسی پڑی تھیں بلکہ ان کی سوراخ زدہ اونی ٹوپی میں بھی نوٹ اُڑسے ہوئے تھے..

ویسے.. یہ بھی حقیقت ہے کہ جیسے وہ مگن ہو کر ڈوب کر گاتے تھے، میں نے صرف پٹھانے خان کو اتنی محویت سے "میرا عشق وی توں" گاتے ہوئے دیکھا تھا..

حسن صاحب دھڑا دھڑ تصویریں اُتار رہے تھے..

سلمان ایک بھدی سی اونی ٹوپی میں تالیاں بجا رہا تھا..

اور میاں صاحب نے اپنی آنکھ مووی کیمرے کے ویو فائنڈر سے ایک لمحے کے لیے بھی جدا نہ کی تھی..

حسن کے کیمرے میں فلم ختم ہو گئی تو وہ ہانپتا ہوا میرے پاس آ کر بیٹھ گیا اور چونکہ وہ مقامی پانی نہیں پیتا تھا.. اپنے معدے کا خیال رکھتا تھا اس لیے ہمہ وقت اپنے بیگ میں منرل واٹر کی ایک بوتل سنبھالے پھرتا تھا.. کہنے لگا "سر جی.. میں نے آج شام نوٹ کیا تھا کہ آپ خیموں کے نزدیک جو ندی ہے، اس میں سے اپنی اوک بھر بھر کر پانی پی رہے تھے تو سر جی.. یہاں آلودگی بہت ہے.. آپ کا پیٹ یقیناً خراب ہو جائے گا.. اس لیے اس منرل واٹر کے چند گھونٹ بھر لیجیے.."

میں نے بھر لیے..

"سر جی اگر آپ اجازت دیں تو میں بھی اس اکھاڑے میں کود پڑوں اور بھالو ناچ کا مظاہرہ کروں؟" یہ سلمان ہی ہو سکتا تھا..

"کیسے؟"

"ایسے.." اس نے پھر اپنے ہاتھ اونچے کر کے ہتھیلیاں نیچے کر دیں اور منہ کھول کر بھالوؤں کی مانند ہانپنے لگا..

"نہیں.." مجھے اپنی ہنسی ضبط کرنے میں بہت دشواری ہوئی.. سلمان اتنا فربہ نہ تھا جتنا کہ وہ اپنے آپ کا.. اپنی فربہی کا مذاق اُڑاتا تھا..

اور تب قادر میدان میں آیا.. پہلے میرے سامنے جھک جھک کر آداب بجا لاتا، سلام کرتا آیا اور پھر کسی جنوبی ہندوستان کی رقاصہ کی مانند لچکتا.. ہاتھ بلند کر کے گردن دائیں بائیں جھٹکاتا.. کمر مٹکاتا میدان میں آیا..

قادر کے سٹیج پر آنے پر بھی ایک مرتبہ پھر غدر برپا ہو گیا.. اس کے رقص کے انداز میں کبھی وجنتی مالا دکھائی دیتی اور کبھی وحیدہ رحمان کا رنگ نظر آتا.. اور کبھی تو وہ امراؤ جان ادا ہو جاتا.. جس نے آوارگی میں زمانے کی سیر کی تھی..

"سر جی.." سلمان نے چپکے سے اپنا بٹوہ کھول کر اس میں سے کچھ نوٹ برآمد کیے اور چپکے سے مجھے تھما دیے.. "لاہوریوں کی عزت بے عزتی کا سوال ہے.. آپ بھی ذرا ویل دینی شروع کر دیں.. قادر پر کچھ نوٹ لگا دیں.. بہت ضروری ہے.."

چونکہ نوٹ سلمان کے تھے، اس لیے میں بھی بے دریغ اٹھا اور اکھاڑے میں جا کر چند نوٹ حسبِ دستور قادر کے ناچتے قدموں میں ڈالے.. کچھ اس کے سر پر وارے اور بقیہ ہوا میں اُچھال کر واپس ہونے کو تھا کہ شائی چو کی اس وجنتی مالا یعنی قادر نے میرا ہاتھ پکڑ لیا..

"تارڑ صاحب..رُک جائیں۔"

اب میں وہاں رُکا ہوں تو حسن اور سلمان بھی میری مدد کے لیے میدان میں آ گئے اور اپنی اپنی اوقات کے مطابق:.ایک بڑے ڈھول کی تال پر..ایک بنسری کی لَے پر.. بابا فلاکت زدہ کی تانوں پر..اور اُس کے جڑواں ڈھولوں کی ردھم پر..جھومنے لگے..

ہم تینوں کا استقبال..قادر اور بابا فلاکت زدہ کی میدان میں آمد سے کم نہ تھا..یوں نعرے لگائے گئے..تالیوں کا شور اُٹھا جیسے ہم سب مہاراج کتھک ہوں..حالانکہ مجھ میں رقص کی کوئی رمق باقی نہ تھی۔ چالیس برس پیشتر جو ایسے قدموں میں اعتدال تھا وہ مضمحل ہو چکا تھا..اور میرا موجودہ وجود چند قدم اٹھانے سے بے وجود ہو جاتا تھا اور ہانپنے لگتا تھا..

حسن صاحب ہاتھ فضا میں بلند کئے ایک چترالی ٹوپی میں..کسی ایسی انجانی ردھم پر رقص کرتے تھے جو کہیں اور تو نہیں شاید کرشن نگر لاہور میں کہیں رائج تھی اور سلمان..جوانی کے خمار میں تھا..یہ خمار ہی دنیا کی سب سے بڑی ردھم تھا..اس عمر میں تو جو قدم اٹھتا ہے گرم خون کی گردش میں آیا ہوا سر میں اٹھتا ہے..اور یوں بھی وہ اس ٹریک پر آنے سے چند روز پیشتر نکاح شدہ ہوا تھا اور ایک منکوحہ ردھم میں رقص کرتا تھا..اس نے ناچتے ناچتے میرے قریب ہو کر کہا.."سر جی میں بھالو بن کر دکھاؤں؟" میں اور سلمان تو اپنی ڈیوٹی دے کر فوراً ہی واپس آ گئے..اور ہاں مجھ پر بھی کچھ نوٹ..جو زیادہ تر قادر کی جیب میں سے برآمد ہوئے تھے، نچھاور کئے گئے..لیکن حسن صاحب اپنی سرمستی میں مست الست رہے اور ناچتے رہے..

اور وہ اس شب بابا فلاکت زدہ کے ہمراہ سٹار آف دی ایوننگ تھے..ان کی چترالی ٹوپی میں سو سو کے متعدد نوٹ بہار دکھا رہے تھے اور یہ ان کے متعدد مداحین نے ناچتے ہوئے ان کی ٹوپی میں اڑسے تھے..

بابا فلاکت زدہ البتہ حسن کو قدرے ناپسند کر رہے تھے کیونکہ وہ ان کے نوٹوں میں شریک ہو گئے تھے..

اس لمحے مجھے ایک نادر خیال آیا..کہ اگر کبھی ٹیم کی مالی حالت بالکل دگرگوں ہو جاتی ہے..کیش کم ہو جاتا ہے تو ہم اس کیش کی کمی کو پورا کرنے کے لیے آسانی سے حسن صاحب کو نچا سکتے ہیں..

اس رات میں..شائی چو کی اس رات میں..ایک لمحہ آیا..

ایسا لمحہ جب یکدم میں اس منظر، اس مقام اور اس رات سے الگ ہو گیا..

آوازیں۔ تالیاں۔ ڈھول کی تھاپ..بابا فلاکت زدہ کی آواز سب کے سب معدوم ہو گئے..ایک مکمل چُپ کا سناٹا چھا گیا جس میں وہ شام..بابا فلاکت زدہ اور پورٹر اور گائیڈ اور ہم سب تو تھے کوئی آواز نہ تھی..جیسے ایک خاموش فلم چل رہی ہو..اس سناٹے میں..میں تنہا تنہا..میرا آس پاس خالی ہو گیا..صرف میں تھا جو ایک بنچ پر بیٹھا اس رات میں تنہا اور خاموشی میں تھا..اور اس چپ میں سے ایک آواز آئی "تم کہاں ہو؟"

"پتہ نہیں.."

"تم شائی چو میں ہو.."

"ہانگ چو میں؟"

"نہیں..تم وہاں نہیں ہو جہاں پتنگ کی ٹُنکی تھی..وارث شاہ کی ٹُنکی پھینکے دی تھی..یہ تو ہوش سے آگے ایک مقام ہے جس کا نام تمہیں یاد نہیں رہتا.."

"یہ اچھا ہے کہ مجھے مقام یاد نہیں رہتے..صرف کیفیت یاد رہتی ہے..اک گونہ بے خودی کے دن رات میں کیا فرق پڑتا ہے کہ انسان کہاں ہے۔"

"فرق تو پڑتا ہے۔ آج شب جب تم خیمے میں اپنے پہلے دن کی مشقت کے بعد بے سُدھ پڑے تھے تو تمہارے خیمے کے پردے کے پار..بالکل سامنے..K_6 اور K_7 کی چوٹیاں جب غروب کی کرنوں میں زرد ہوتی تھیں تو تم بے سُدھ پڑے تھے اور تم نہیں جانتے تھے کہ ان چوٹیوں پر سونا پگھل رہا ہے.."

"میں اتنا بے سُدھ بھی نہیں تھا..میں جانتا تھا کہ وہاں حجاب تجھ پر ہیں اور بازو بند تخلیق ہو رہے ہیں..میرے اندر بھی تو ایک سونے کی شہزادی تھی جو کبھی پگھلتی تھی اور کبھی شاہ گوری کی برفوں کی مانند منجمد ہو جاتی تھی..میں اتنا بے سُدھ نہیں تھا۔"

"سنو تم نصیب والے ہو کہ ابھی تک سُدھ بُدھ میں ہو..تم بشر ابھی تک اتنی شکتی ہے کہ تم شائی چو تک پہنچ جاتے ہو..اپنے رب کا شکر ادا کرو.."

مجھ میں..میرے بدن میں شکرانے کی ایک عجیب سنسناہٹ نے جنم لیا اور پھر یکدم اس خاموش سناٹے میں بے پناہ تالیوں اور ڈھول کی آواز نے ایک ایسی دراڑ ڈالی کہ میں پھر سے شب شائی چو میں تھا..

جہاں بابا فلاکت زدہ اپنے جڑواں ڈھولوں پر شہتوت کی چھڑیوں سے ضرب دیتا گاتا تھا.. منہ کھولے اپنے چند دانتوں والے منہ کو کھولے گاتا تھا..

اکثر شب تنہائی میں.. کچھ دیر پہلے نیند سے..
اکثر شب شائی ٹچو میں.. کچھ دیر پہلے نیند سے..

کچھ دیر پہلے نیند سے.. اس شب.. جیسے کے سکس اور کے سیون کی چوٹیاں میرے خیمے کے کھلے پردوں میں سے اندر آئیں اور میرے ساتھ میرے سلیپنگ بیگ میں سو گئیں.. ان کی برفیں میرے پہلو میں خوابیدہ ہو گئیں.. ان کے دامن میں جو بلند گھاس تھی جہاں مویشی نہیں پہنچ سکتے تھے اور ایک جھیل تھی.. تو اس گھاس کی ہریاول میرے نتھنوں میں آتی تھی اور جھیل کے پانی مجھے بھگوتے تھے.. گیلا کرتے تھے.. برفیں، گھاس، پانی.. مجھے بلندی کی ایک لوری سنانے لگے..

کچھ دیر پہلے نیند سے..
اور کچھ دیر بعد میں نیند میں چلا گیا..

"شائی ٹچو سے آگے جہاں اور بھی ہیں.."

شائی ٹچو گندو گورو گلیشیئر کے دامن میں آباد تھا..

جیسے کورو فون بیافو گلیشیئر کے اختتام پر.. ندیوں، ریت اور ٹھگنے درختوں میں روپوش تھا.. ہم شائی ٹچو سے اُٹھے اور ظاہر ہے صبح سویرے اٹھے اور پھر ناشتے کے بعد اٹھے اور گندو گورو کا جو بلند جھاڑیوں اور درختوں سے ڈھکا کنارہ تھا اس پر اُٹھنے لگے..

مجھے شائی ٹچو تو یاد ہو گیا تھا لیکن اب یہ یاد نہیں ہو رہا تھا کہ اگلے پڑاؤ کا کیا نام ہے.. دل شکن پاپا دار جیلنگ شاقسم کا کوئی مقام تھا جہاں ہمیں شام تک پہنچنا تھا..

گلیشیئر کے کنارے تک پہنچے تو شائی ٹچو نیچے رہ گیا تھا کہ ہم اس سے کہیں بلند ہو چکے تھے.. سامنے جو پہاڑ تھا اس پر وہ دو یاک ابھی تک دکھائی دے رہے تھے.. پتہ نہیں سوئے ہوئے تھے یا جاگ رہے تھے..

پہلا دھچکا تو ہمیں ہوشے میں لگا جب ہم نے اُس اپنے تئیں دور افتادہ اور سوئے ہوئے گاؤں کو یوں جاگتے ہوئے پایا کہ اس کی خیمہ گاہیں غیر ملکیوں سے چھلکی پڑتی تھیں..

دوسرا دھچکا شائی ٹچو میں لگا جہاں ایک دنیا آباد تھی..

اور تیسرا.. اور یہ آخری نہیں تھا ہمیں گندو گورو کے کناروں پر چڑھتے درختوں اور جھاڑیوں میں جو راستہ تھا اس پر چلتے ہوئے لگا..

ہم تو یہی سمجھتے تھے ناں کہ شائی ٹچو سے نکلتے ہیں تو اب ایک نادیدہ اور اجنبی جہان کے اندر جا رہے ہیں.. ایک ایسی بلند ویرانی میں جہاں کسی اور ذی روح کے قدم کہاں پہنچے ہوں گے.. اس کی ان چھوئی تنہائی میں صرف ہم ہی ہم ہوں گے اور ہمارے اردگرد جو برف اونچائیاں۔

ندیاں، جھرنے اور پتھر ہوں گے وہ ہمارے اعزاز میں جھک جھک جائیں گے.. ندی نالے تھم جائیں گے اور کہیں گے.. تھینک یو تارڑ جی۔ آپ نے یہاں قدم رنجہ فرمایا، ہم اتنی مدت سے آپ ہی کے منتظر تھے.. اور یہ تیسرا دھچکا یوں لگا کہ اوپر سے درجنوں نہیں بلکہ سینکڑوں غیر ملکی کوہ نورد دھڑا دھڑ اُترتے آتے تھے.. ایک بے قابو ریوڑ کی مانند یلغار کرتے آتے چلے جاتے تھے.. ہمیں ان کو راستہ دینے کے لیے رکنا پڑتا ورنہ وہ ہمیں روند کر اُتر جاتے.. پہلے پہل تو ہم بے حد خوش مزاجی سے انہیں گڈ مارننگ وغیرہ کہتے لیکن ان میں سے اکثر ہمیں لفٹ نہ کرواتے اور ہمیں راستے کے پتھر جان کر پھلانگتے جاتے.. کوئی ایک آدھ نمونہ ایسا ہوتا جو جواب میں گڈ مارننگ وغیرہ بُڑبُڑا دیتا ایسے جیسے ہم پر احسان کر رہا ہو.. وہ ہمیں باقاعدہ دھکیلتے ہوئے گزر جاتے..

ان گورا لوگوں نے ہماری انا کو شدید طور پر مجروح کیا..

وطن ہمارا تھا اور دندناتے یہ پھرتے تھے..

یہ سایہ دار راستہ اختتام کو پہنچا تو آگے ایک پتھروں سے بھرا میدان تھا.. گندوگورو گلیشیئر کے دامن میں.. گلیشیئر اب نظر نہیں آتا تھا کیونکہ ہم اس کے دامن میں تھے.. بلکہ میں اس کے دامن میں تھا کیونکہ غیر ملکی کوہ نوردوں کی یلغار نے ہمارے ڈسپلن کا ستیاناس کر دیا تھا اور ہم تتر بتر ہو چکے تھے.. برمانی کا بے مہار شتر پورٹروں کے ہمراہ کہیں آگے جا چکا تھا اور جب میں نے اسے ایک بار ٹوکا تھا کہ وہ ذرا آہستہ خرام ہو جائے اور بقیہ ٹیم کے ہمراہ خراماں خراماں چلے تو اس نے اپنے دفاع میں یہ دلیل دی تھی کہ "تارڑ صاحب یہ میری قدرتی چال ہے۔ اگر میں اپنے آپ کو روک کر چلتا ہوں، بریکیں لگا کر چلتا ہوں تو پھر میں یکدم ڈھے جاؤں گا.. مجھے یونہی بے مہار چلنے کی اجازت دیجیے.."

"اجازت ہے.." میں نے مغلِ اعظم کے انداز میں ایک گہری گونج دار آواز بناتے ہوئے کہا تھا..

پہاڑوں میں.. کہیں بلند پہاڑوں میں وہاں جانا جس کا نام آپ جانتے ہوں.. مشکل ہوتا ہے..

اور پہاڑوں میں وہاں جانا جس کا نام آپ نہ جانتے ہوں، بہت مشکل ہوتا ہے..

پتھروں کے انبار پھلانگنے کے بعد ایک بہت وسیع میدان سامنے آیا.. ریتلا اور خشک.. کہیں کہیں سوکھ چکی ندیوں کی گزرگاہیں تھیں.. دائیں ہاتھ پر کچھ فاصلے پر جو چٹانیں تھیں، ان کی آغوش میں

سے ایک خشک ہو چکے نالے کے پتھر پورے علاقے میں پھیلتے تھے..

چند پتھریلے گھر بھی دکھائی دے رہے تھے..

دراصل یہ گندوگورو تھا..

کیسے تھا؟

گندوگورو کا درّہ تو ابھی دو روز کی مسافت پر تھا تو یہ گندوگورو کہاں سے آ گیا..

یہ ایسے تھا کہ گئے زمانوں میں.. یہ میدان اور چراگاہ ہی گندوگورو کہلاتے تھے اور یہاں سے اوپر دو دن کی مسافت پر جو ایک درّہ تھا اس کا کوئی نام نہ تھا کہ وہ شمال کے درّوں میں کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا..

اور جب وہ درّہ اہم ہو گیا تو اس کا نام اس چراگاہ کے حوالے سے گندوگورو رکھ دیا گیا.. اس لیے یہی اصلی اور بڑا گندوگورو تھا جسے میں نے بمشکل طے کیا کیونکہ یہاں کوئی سایہ نہ تھا.. کڑی دھوپ کا سفر تھا اور یہ میدان ختم ہونے میں نہ آتا تھا..

کل ہوشے سے شائی چونگ کے سفر میں مجھے زیادہ دشواری نہیں ہوئی تھی کیونکہ راستہ تقریباً ہموار تھا اور ہر صبح ماڈل ٹاؤن پارک کے ٹریک پر چھ کلومیٹر چلنا میرا معمول تھا.. لیکن آج شروع سے ہی چڑھائی کا سامنا ہو گیا اور چند قدم اٹھانے کے بعد ہی میرا ابولو رام ہو گیا.. ظاہر ہے ایک بنیاد پرست مسلمان ہونے کے ناطے سے میں یہ نہیں جانتا تھا کہ رام کیسے بولتا ہے.. جیسے بھی بولتا تھا بس ویسے ہی بولتا ہو گا جیسے چڑھائی چڑھتے ہوئے آس پاس کہیں بولا تھا..

میں اپنی حیاتی کے اس برس میں.. جو پچھلے برس سے ایک برس زیادہ تھا.. اور میں اس پچھلے ایک برس میں کچھ مزید زوال پذیر ہوا تھا.. مجھ میں ہمت کم ہوئی تھی اور چہرے پر کم از کم ایک جھری کا اضافہ ہوا تھا تو میں اپنے اندر ایک جھجک رکھتا تھا کہ کیا پتہ یہی وہ آخری برس ہو جب مجھ سے ہمت چھن جائے.. میں ایک ایسا قدم اٹھاؤں جو اُٹھ نہ سکے اور میری کوہ نوردیوں کا اختتام ہو جائے.. لیکن اس برس بھی کہیں نہ کہیں وہ ہمت موجود تھی.. میں اسے ہمتِ مرداں تو نہیں کہوں گا کیونکہ مردانگی کے محض چند برس ہوتے ہیں، اس کے بعد پشیمانگی شروع ہو جاتی ہے..

اگرچہ چڑھائی چڑھتے ہوئے بولو رام ہو گیا تھا لیکن اب وہ رام خاموش تھا اور مجھے چلنے میں دقت نہیں ہو رہی تھی..

البتہ میاں صاحب کے گھٹنے میں موچ آ گئی تھی اور وہ اس پر ایک پٹی باندھ کر قدرے

آہستگی سے چلتے تھے..

میاں صاحب نے صرف پچھلی شب شاہد کو اپنے خیمے سے بے دخل کر دیا تھا بلکہ پوری ٹیم کے سمجھانے کے باوجود وہ اپنے سستے سے جوگرز تبدیل کرنے پر رضامند نہ ہوئے تھے جو انہوں نے دس برس پیشتر کے ٹو ٹریک کے لیے خرید کیے تھے.. یا شائد اس سے پہلے خرید کیے تھے..ان کا کہنا تھا کہ یہ جوگر.. جن کے تلے گھس چکے تھے اور جن کی شکل پژمردہ چوہوں جیسی ہو چکی تھیں..یہ جوگر.. جوگر نہیں رہے تھے بلکہ ان کے پاؤں ہو چکے تھے جن کے ساتھ وہ پاک سرائے اور یہاں تک کہ سنولیک ٹریک کے دوران بھی سرخرو ہوئے تھے..اس لیے اس بچہ ٹریک کی ان کے سامنے کیا حیثیت تھی..

ویسے یہ حقیقت ہے کہ وہ ان جوگرز میں نہ کبھی پھسلے نہ گرے اور ہمیشہ بہت اچھا چلے..ہم میں سے جو لوگ نہایت قیمتی اور امپورٹڈ ایڈی ڈاس اور نائکے وغیرہ میں چلتے تھے، ان سے کہیں بہتر چلے..

شنید تھی کہ وہ بھائی گیٹ کے کسی ایکسپرٹ موچی سے ان جوگرز کی تجدید کرواتے رہتے تھے..بلکہ شاہد صاحب کا بیان تھا کہ اوریجنل جوگر تو کب کے غائب ہو چکے تھے اور میاں صاحب اب جوگرز کے نام پر جو کچھ بھی پہنتے تھے، وہ بھائی گیٹ کے موچیوں کا کمال تھا..

عامر کے نو کا وزن پہلے سے بڑھ چکا تھا..ایک آسودہ اور آرام طلب صنعتی زندگی کی آسائش کے بعد وہ اتنے برسوں کے بعد پہاڑوں میں آیا تھا تو اسے چلنے میں کچھ دشواری پیش آ رہی تھی جسے وہ اپنی جوانی کے زور سے زیر کرتا چلتا جاتا تھا..اور حسن صاحب کا کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ چل بھی رہے ہیں یا نہیں..وہ ایک عجیب روبوٹ انداز میں واکنگ سٹک ٹیکتے ٹھپ ٹھپ چلتے جاتے تھے اور کہیں نہ کہیں پہنچ ہی جاتے تھے..

شاہد کی حالت بھی دگرگوں تھی لیکن وہ حسب عادت نہ مانتا تھا نہ اقرار کرتا تھا اور اکیلا چلتا جاتا تھا..اپنے آپ میں گم..اپنے آپ کو دوسروں سے پوشیدہ رکھتا ہوا.تنہا چلتا جاتا تھا..

اور میں..اب اکیلا چل رہا تھا..

چل کیا رہا تھا..ایک اپاہج کی مانند اپنے آپ کو گھسیٹتا آگے آگے ہوتا جاتا تھا کہ اب سورج تباہ کرتا تھا..پیاس فنا کرتی تھی..پسینہ بہتے بہتے بدن کو خالی کرتا تھا..اور بلندی اپنا اثر دکھاتی تھی ،سانس نہیں لینے دیتی تھی..

بائیں ہاتھ پر ایک بلند کنارے کے نیچے گندو گورو تھا..برف ہی برف تھی لیکن وہاں سے کوئی سرد سندیسہ نہیں آتا تھا اور دائیں ہاتھ پر میدان کے پار چٹانی بلندیاں تھیں جو دھوپ میں بہت ہی برہنہ اور بے حیا لگ رہی تھیں..میری واٹر بوتل میں نمکول ملا پانی کم ہو رہا تھا..

نیچے ہمارے میدانوں میں یہ معمہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنی بلندی پر برفوں اور اونچائیوں پر اتنی تیز دھوپ کیسے ہو سکتی ہے کہ وہ جلا ڈالے یا بدن خشک کر کے مار ڈالے..جیسے آپ ایک صحرا میں ہوں..

لیکن بلندی کی دھوپ صحرا کی دھوپ سے کہیں بڑھ کر جان لیوا ثابت ہوتی ہے..ہوا کی باریکی..آکسیجن کی کمی اور الٹرا وائلٹ شعاعیں آپ کے بدن میں سے نمی کا آخری قطرہ بھی خشک کر دیتی ہیں..

چنانچہ آپ اپنا سر لپیٹ کر چلتے ہیں..نمکول ملے پانی کے گھونٹ بھرتے جاتے ہیں..

میں چلتا جاتا تھا..

اور ایک مقام پر اس بلندی اور دھوپ نے مجھ پر کچھ اثر کیا اور مجھے خدشہ ہوا کہ نہ تو کوئی میرے پیچھے آ رہا ہے اور نہ کوئی مجھ سے آگے نکل گیا ہے اور میں بالکل تنہا ہوں۔ایک وسیع دھوپ بھرے ویرانے میں..

گورا لوگوں کے جو غول اوپر سے اُترتے تھے، وہ سویرے سویرے اُتر چکے تھے اور اب آگے کوئی ذی روح نہ تھا..بس ایک بڑی تنہائی تھی..

"کچھ دیر بعد ممی آ گئی...اور مجھے پار لے گئی"

اور اس تنہائی اور دھوپ کی یکسانیت سے جب میں اکتا چکا تھا تب ایک نالے کا شور میرے کانوں میں اُترا..

جو مکمل سکوت میرے آس پاس خیمہ زن تھا اس میں کسی آبی گزرگاہ کی روانی کا شور سنائی دینے لگا..

میرے کان ایسے شور کے عادی تھے اور فوری طور پر چوکنے ہو جاتے تھے کہ شور سے قطعی طور پر اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ آگے ورگوتھ کی مرگ صداؤں والی ندیاں ہیں یا کوئی معصوم سا دلربا نالہ ہے جس کے پار جانا.. بچوں کا کھیل ہے، بہر طور ایسا آبی شور ایک مرتبہ تو آپ کے قدموں تلے سے زمین نکال دیتا ہے اور پھر وہی رام بولنے لگتا ہے..

لیکن میں ناحق ڈر کے سنانے میں آ گیا تھا.. آگے.. ایک بلند کنارے کے نیچے جو نالہ شور و غوغا کرتا تھا، نہایت ناتواں تھا.. اس کے پانیوں میں بہت سے ایسے پتھر تھے جن پر قدم رکھتے ہوئے آپ آسانی سے پار اتر جاتے تھے..

چنانچہ میں آسانی سے پار اتر گیا..

ابھی کچھ دور اور چلا ہوں.. اور اپنے بچے کھچے سانس سمیٹتا ہوا.. تنہا چلا ہوں تو پھر میرے کانوں میں ایک نالے کی آہ وزاری بلند ہونے لگی..

ورگوتھ کی ندیوں کے بعد مجھے کسی اور ندی نالے کا خوف نہیں رہا تھا.. بقیہ نالے تو نومولود بچہ لوگ تھے..

پل صراط پر سے گزر جانے والے نالہ پلکھو یا کوہ سلمان کی راکھی ندی پر جو پل ہیں،

ان کو کیا خاطر میں لائیں گے..

لیکن جب میں اس آہ وزاری کے منبے کے قریب ہوا ہوں.. چلتا ہوا ایک بلند کنارے پر جا پہنچتا ہوں تو اس تنہائی اور بلندی پر نیچے کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نہایت پرخشونت.. اور پروحشت نالہ جھاگ اڑاتا ہے اور جھاگ بھی اس کی باچھوں سے بہتی ہے کہ وہ پاگل ہے.. آس پاس کوئی نہ تھا..

کچھ آگے نکل گئے تھے اور کچھ پیچھے رہ گئے تھے..

میں اور یہ آبی آفت آمنے سامنے تھے..

میں بلند کنارے سے نیچے اُتر کر اس کے آبی شور کے قریب ہوا تو وہ کان بہرے کرتا تھا.. میں اسے بہت دیر تک ایک مبہوت حالت میں تکتا رہا کہ اسے کہاں سے اور کیسے پار کروں..

نہیں یہاں سے نہیں.. یہاں یہ اپنے پورے زور میں ہے.. پانیوں میں سے کوئی ایک پتھر بھی نہیں اُبھرتا جس پر پاؤں رکھ کر پار جایا جا سکے..

یہاں سے نہیں تو اس کے بہاؤ کے نیچے جا کر چیک کریں کہ وہاں کوئی ایسا مقام ہو جہاں سے سیاں جی بخیریت پار اتر سکیں..

میں بہت نیچے تک گیا لیکن اُترائی پر تو اس کا زور بڑھتا جاتا تھا..

میں پھر اوپر اس جگہ پر واپس آ گیا..

بہت ہی غور و فکر کے بعد ایک مقام مناسب لگا.. یہاں نالے کے کنارے سے کچھ پرے پانیوں میں ایک پتھر اُبھرا ہوا تھا.. اگر انسان اس پر جا کھڑا ہو تو وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک اور ترچھا سا پتھر پانی میں سے کبھی کبھار نمودار ہوتا تھا تو اس پر چھلانگ لگا دی جائے.. اور اگر نہ پھسلا جائے تو.. اگر پھسلا جائے تو لاہور واپسی کھٹائی میں پڑ سکتی تھی کہ اس نالے کے پانی سیدھے گندوگوروی برفوں میں جا گم ہوتے تھے..

میں ایک مرتبہ پھر نہ صرف اس پہاڑی نالے کا بلکہ کسی بھی ایسے بدتہذیب نالے کا محل وقوع گوش گزار کرنا چاہوں گا..

یہ نالہ کبھی بھی دور سے دکھائی نہیں دیتا.. قریب ہونے پر سنائی دیتا ہے کہ ہمیشہ گہرائی میں ہوتا ہے.. اونچے کناروں کے درمیان بہتا ہے.. چنانچہ آپ اپنے راستے پر چلتے ہوئے اس کے کنارے پر آتے ہیں اور پھر آہستہ آہستہ اپنے آپ کو سنبھالتے.. اپنے جوگر جماتے نیچے

اُترتے ہیں اور اس کے پانیوں تک پہنچتے ہیں تو دنیا جہان سے کٹ جاتے ہیں.. کیونکہ آپ ایک کنارے سے نیچے گہرائی میں آتے ہیں اور نالے کے پار بھی ایک کنارہ بلند ہو رہا ہے اور آپ ان دونوں کناروں کے درمیان ایک پاتال میں حیران، پریشان اور جنگل بیابان میں کھڑے ہیں اور صرف پانیوں کا پاگل جھاگ اڑاتا شور ہے اور ان میں گڑگڑاتے بہتے پتھروں کی گونج ہے.. پانیوں کی نمی ہے جو ہوا میں شامل ہے اور آپ کے چہرے کو بھگوتی مرگ بوسے دیتی ہے.. اور اس کیفیت میں اگر آپ بالکل تنہا ہیں تو سونے پر سہاگہ ہو جاتا ہے..

اور اس عمر میں میرا سونا جو پیتل کا ہو چکا تھا اس پر بھی سہاگہ ہو رہا تھا..

چنانچہ میں نے قدم بڑھا کر اپنے آپ کو اس پتھر پر کھڑا کیا جس کے آگے نالے کا ایک تند اور منہ زور حصہ جھاگ اڑاتا تھا اور اس کے پار اس پتھر کو تا دیر غور سے دیکھا جس پر مجھے چھلانگ لگا کر پہنچنا تھا اور وہ پتھر کبھی زیرِ آب چلا جاتا تھا اور کبھی اس کی گیلاہٹ سورج کی کرنوں سے چمکتی تھی.. اس پتھر کا زاویہ ایسا تھا، اس پر لینڈ کرنے والا جو گر آسانی سے پھسل سکتا تھا..

میں نے بہت حساب کتاب کیا.. ناپ تول کیا کہ اگر میں جست بھرتا ہوں تو کیا اس پتھر تک جا بھی سکتا ہوں یا نہیں.. اگر جا سکتا ہوں تو پھسلنے کے کیا امکانات ہیں.. کافی دیر غور و خوض کرنے کے بعد فیصلہ ہوا کہ نہیں بھائی جان تمہارے پھسلنے کے امکانات بہر طور ہیں.. اگر پھسل کر نالے میں گرتے ہو تو خود سے تو اٹھنے اور باہر آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اس مکمل تنہائی میں آس پاس کوئی بچانے والا بھی نہیں تو بہتر یہی ہے کہ بے شک بقیہ عمر اس کنارے پر گزار دو لیکن یہ رسک نہ لو.. جب تک کہ کوئی ساتھی پیچھے سے نہیں آ جاتا.. اور ساتھی بہت پیچھے تھے اور سورج کی تمازت میرے بدن کو پسینے سے بھگوتی تھی اور اس پسینے میں کبھی کبھار نالے کا سرد چھینٹا پڑتا تھا..

میں نے اپنی واٹر بوتل میں سے ایک اور گھونٹ بھرا.. وہی بوتل جو شاید سلجوق یا سمیر کے سکولوں کے دنوں کی یادگار تھی.. ایک گھونٹ بھرا اور ایک پتھر پر بیٹھ کر امدادی پارٹی کا انتظار کرنے لگا..

میں بہت دیر بیٹھا رہا..

اس نالے کی شوخ شور شرابے والی تنہائی میں دنیا سے کٹا ہوا ایک ایسے بچے کی مانند اداس اداس اور بے بس بیٹھا رہا جس کے سکول میں کب سے چھٹی ہو چکی ہے.. دیگر تمام بچوں کے

والدین انہیں لے جا چکے ہیں اور صرف وہ باقی رہ گیا ہے.. گلے میں بستہ ڈالے آبدیدہ ہونے کو ہے کہ جانے میری ممی مجھے لینے کب آئے گی..

کچھ دیر بعد ممی آ گئی..

یہ ممی ایک پورٹر کی صورت میں سامنے کے کنارے سے نیچے اُتری.. اس پورٹر نے نالے کے کنارے پر پہنچ کر پانیوں کا ایک جائزہ لیا.. یہ جانچا کہ اسے کہاں سے عبور کیا جا سکتا ہے اور پھر وہ بھی اسی مقام پر پہنچا جہاں میں کچھ دیر کھڑا رہنے کے بعد پسپا ہو گیا تھا.. اس نے ان دونوں پتھروں کو پل بنا کر ایک چھلانگ لگائی اور پھر میرے پاس لینڈ کر گیا.. ذرا سنبھلا.. مجھے ایک نظر دیکھا اور سلام دعا کے بغیر کنارے پر چڑھنے لگا.. یکدم مجھے خیال آیا کہ یہی تو وہ اتفاقی ممی ہے جو مجھے گھر لے جا سکتی ہے۔ "ہیلو.. اوئے بھائی.. بھائی جی ذرا سنئے.."

وہ رُک گیا..

میں نے اشارے سے اسے پھر سے نیچے آنے کو کہا..

وہ آ گیا..

"بھائی ذرا امداد کرو.. ہم ذرا ڈرپوک اور موٹا ہے.. نالے کے پار جانا ہے۔"

"آپ پاکستانی ہو؟" وہ ذرا حیرت زدہ ہوا..

"آہو.. یار امداد کرو.. ہم فریاد کرتا ہے۔"

شمال میں فریاد کرنے کا مطلب ہے کہ ہم تمہارے پاؤں پڑتا ہے.. منت سماجت کرتا ہے..

"پاکستانی ہو تو ادھر کیسے آ گیا.. ادھر تو صرف گورا لوگ آتا ہے۔"

"یار غلطی سے.. پھر نہیں آئے گا.."

اب وہ پھر سے پانیوں کو پھلانگتا دوسری جانب چلا گیا اور اس پتھر پر کھڑا ہو گیا جو میری پہنچ سے باہر تھا.. اور ہاتھ آگے کر کے کہنے لگا۔ "آ جاؤ۔"

میں پھر اسی پتھر پر کھڑا تھا اور اس نے اپنا ہاتھ میری جانب بڑھا رکھا تھا لیکن میں نے جو ہاتھ بڑھایا وہ اس کے ہاتھ سے ایک فٹ کے فاصلے پر رہ گیا.. اور اس ایک فٹ کی دراڑ کے نیچے نالے کے پانی منہ کھولے جھاگ اڑاتے تھے..

"نہیں یار.. میں نہیں آ سکتا.."

''آسان ہے آجاؤ..ہم پکڑے گا..آجاؤ..''

''اور اگر گر گیا تو..''

''وہ تو اللہ کا مرضی ہے..''

میں پھر سے حساب کتاب لگانے لگا کہ کیا کروں.. چھلانگ لگاؤں یا نہ لگاؤں..اگر اس کا ہاتھ میرے ہاتھ کی گرفت میں نہیں آتا تو کیا یہ اتفاق اور عارضی ممی مجھے نالے کے پانیوں میں سے نکال لے گی..

قطعی طور پر نہیں نکال لے گی، چاہے یہ ممی مجھ سے کتنی ہی محبت کیوں نہ کرتی ہو کیونکہ میں تو پل دو پل میں کہیں کا کہیں بہہ جاؤں گا..گندوگورو گلیشیر میں اُتر جاؤں گا..میں تو دریا ہوں، سمندر میں اُتر جاؤں گا..

اس حساب کتاب اور غور و خوض کے دوران ایک مسئلہ ہو گیا کہ اس پتھر پر کھڑے کھڑے نالے کی دہشت اور چنگھاڑ کے خوف سے میری ٹانگیں لرزنے لگیں..میرے قابو میں نہ رہیں..اب اگر میں فوری طور پر چھلانگ نہیں لگاتا تو آٹومیٹک طور پر یوں بھی ڈھے کر غرق نالہ ہو جاتا ہوں چنانچہ میں نے مجبوراً چھلانگ لگا دی..لیکن اللہ اللہ کرتے ہوئے..

شمالی علاقوں میں کوہ نوردی کا ایک روحانی پہلو یہ بھی ہے کہ اللہ اللہ کرنے کے مواقع اکثر و بیشتر ملتے رہتے ہیں اور انسان پارسا ہو جاتا ہے لیکن صرف چند لمحوں کے لیے..وہ لمحے گزر جاتے ہیں تو پھر سے رند ہو جاتا ہے کہ یہی حضرت انسان کی خصلت ہے..

بہر حال یہ عارضی پارسائی میرے کام آئی اور دوسرے پتھر پر کھڑے پورٹر کا ہاتھ میرے ہاتھ میں آ گیا..میرے جوگر گیلے پتھر پر اگرچہ پھسلے اور یہ ثابت ہو گیا کہ اگر میں اپنی بہادری کے زعم میں یہاں خود سے چھلانگ لگا دیتا تو منزل ما..دور نیست تھی..پورٹر ممی میری ڈرپوکی سے اتنا بیزار ہو چکا تھا اور اسے آج ہی شائی چو بھی پہنچنا تھا کہ اس نے مجھے شکر گزار ہونے کا موقع بھی نہ دیا اور فوراً عازم سفر ہو گیا..

''موت چٹانوں کی صورت ہمارے سروں پر معلق تھی''

میں بھی دوسرے کنارے پر چڑھ کر اوپر گیا اور چند منٹ کے لیے ہی عازم سفر ہوا تھا کہ میں نے سامنے ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں چند جھاڑیوں کے ناکافی سائے میں ایک شکر دوپہر میں اپنے سامان کو بکھرا دیکھا..پورٹروں کو بے سدھ سوتے دیکھا اور ان میں ایک پتھر سے ٹیک لگائے ہوئے برمانی کو بڑھی ہوئی داڑھی کھجلاتے اور اس کے علاوہ بہت کچھ کھجلاتے دیکھا..

یعنی ہم پر قیامت گزر گئی ہے اور یہ لوگ یہاں جنت کے مزے لوٹتے ہیں..

میں نے اپنی اس کوہ نوردی کے دوران پہلی بار اپنے بلڈ پریشر کو وحشی ہو جانے دیا اور ان پر برس پڑا..پہلے پورٹروں پر برسا ''شائی چو سے چلتے ہوئے میں نے سب کو بولا تھا کہ راستے میں جہاں کہیں بھی دشواری ہوگی آپ لوگوں نے ٹھہرنا ہے..ہماری مدد کے لیے رُکنا ہے..اگر راستے میں کوئی بڑا نالہ آتا ہے تو وہاں ہمارا انتظار کرنا ہے..کیوں نہیں کیا؟''

پورٹروں میں ایک ایسا حسین تھا جسے بے شک پیاسا ہو پھر بھی کبھی پانی نہیں دینا چاہیے تھا۔ یہ ایسا حسین تھا۔ یہ وہی حسین تھا جو ہوشے میں نہایت مسکین اور درخواست گزار تھا اور بے حد منت سماجت سے ہماری ٹیم میں شامل ہوا تھا..کہ صاحب ہم تو پورٹر بھی ہوگا اور آپ کا باورچی بھی..ہم کو ساتھ لے جاؤ..ہم نے آپ کے لاہور میں چینی، جاپانی اور پاکستانی ریستورانوں میں باورچی کا کام کیا ہے..آپ کو یہ سب کھانا کی ورائٹی کھلائے گا..اور پورٹر بھی ہوگا..ہمیں ساتھ لے چلو..

لیکن یہاں وہ کوئی اور حسین تھا..باغی ہو گیا تھا اور مجھے ایک طوطے کی چشم حقارت سے دیکھتا ہوا کلام کرتا تھا..کیوں؟

صرف اس لیے کہ کاندے کا اسحاق بھی ہمارے ہمراہ تھا..یہ اسحاق شروع میں تو نہایت شوخا اور بدتمیز تھا..نہایت لچر گفتگو کرتا تھا اور بے حد فرینک ہوتا تھا..پھر میں نے اسے فوری طور پر فارغ کر کے ہوشے واپس بھیجنے کی دھمکی دے کر سیدھا کر لیا تھا..یہ اسحاق بھی کسی حد تک باورچی تھا..اور حسین جو کہ ہوشے کا تھا، اس کے لیے یہ ڈوب مرنے کا مقام تھا کہ اس کے کچن ٹینٹ میں کاندے کے کسی باورچی کا عمل دخل ہو..اس نے آج صبح یہ ڈکلیئر کر دیا تھا کہ صاحب ایک تو آپ نے کل رات مجھے سوکھے چاول کھلائے..اور یہ سوکھے چاول چکن پلاؤ تھا..اور دوسرے یہ اسحاق ادھر کچن ٹینٹ میں کیوں آتا ہے..تو میں نے ایک نہایت خوشامدانہ تقریر کی تھی کہ حسین بھائی میں تم سے معافی مانگتا ہوں کہ پچھلی شب تمہیں سوکھے چاول کھانے کو ملے..آئندہ تم پہلے کھاؤ گے اور پھر ہم..اور جہاں تک اسحاق کا سوال ہے تو یہ محض ایک پورٹر ہے..ٹیم کے سرکاری باورچی تم ہو لیکن..اسے اپنے ساتھ مدد کے لیے رکھو تو کیا حرج ہے..

حسین کو یہ بھی گوارا نہ تھا اور اس کی عزت نفس اتنی مجروح ہوئی تھی کہ مجھے کسی بھی پہاڑی نالے کے پانیوں میں برد ہوتے دیکھتا تو مسرت سے تالیاں بجاتا..

تو یہی حسین..ایک مجروح اور آنکھیں بدل لینے والا حسین کہتا ہے۔''صاحب ہمارا کام بوجھ اٹھانا ہے..آپ کا مدد کرنا نہیں ہے۔''اور وہ بدستور ایک پتھر سے ٹیک لگائے مکمل بیگانگی سے بیٹھا رہا..

میرا بلڈ پریشر تمام حدود عبور کر گیا اور مجھے حیرت ہے کہ اس لمحے میرے دماغ کی کوئی رگ کیوں نہ پھٹ گئی..

میں نے اس لمحے یہ محسوس کیا کہ مجموعی طور پر کاندے کے پورٹرز زیادہ سادہ اور ہمدرد تھے جب کہ ہوشے سے جتنے بھی پورٹر بھرتی کیے گئے وہ قدرے لاپروا اور بیگانے تھے..کوہ نوردوں کی بے پناہ آمد نے ان کا دماغ خراب کر دیا تھا..

''برمانی..''حسین پر جب کچھ اثر نہیں ہوا تو میں ڈاکٹر پر حملہ آور ہو گیا۔''تم ان پورٹروں کے ساتھ تھے..میرے منع کرنے کے باوجود قلانچیں بھرتے ہوئے آگے نکل گئے تھے تو تم نے اس نالے کے کنارے بقیہ ساتھیوں کا انتظار کیوں نہیں کیا..''

برمانی پہلی بار مجھے اس حالت غضب میں دیکھ رہا تھا۔''سر..میں نے حسین کو کہا تھا کہ یہ نالہ خطرناک ہے..وہ لوگ مدد کے بغیر اس کو پار نہیں کر سکتے..تم یہاں ٹھہرو..لیکن یہ وہاں

نہیں ٹھہرے..کہتے تھے جب ٹیم ادھر تک آئے گی تو ہم پھر آ جائیں گے..اور یہ یہاں آ کر لیٹ گئے۔''

''اور پھر تم بھی بھول گئے کہ کچھ اُلو کے پٹھے ابھی اس نالے پر اتریں گے اور اسے دیکھ کر اپنی جان کو روئیں گے کہ پار اترنا ممکن نہ ہوگا..یہ لوگ اگر یہاں آ کر لیٹ گئے تھے تو تم بھی کیوں لیٹ گئے تھے..تمہارا فرض تھا کہ تم وہاں رک کر ہمارا انتظار کرتے..ڈیم اٹ برمانی میں مرتے مرتے بچا ہوں..اگر میری ممی وہاں نہ آ جاتی تو میں ابھی تک یا تو دوسرے کنارے پر بیٹھا اپنی قسمت کو کوس رہا ہوتا یا ڈوب چکا ہوتا..''

''آپ کی ممی سر؟''برمانی، ڈاکٹر تھا..جان گیا کہ میرا بلڈ پریشر کے ٹو سے بھی اونچا ہو چکا ہے..اور میرے دماغی خلیوں میں کھلبلی مچ چکی ہے۔''میں آپ کو جوس پلاتا ہوں۔''

''تم موضوع بدلنے کی کوشش مت کرو برمانی..تمہارا کیا خیال ہے کہ میں اس نالے کو ایک ممی کے سہارے کے بغیر پار کر سکتا تھا..''

''ہرگز نہیں تارڑ صاحب..''

''تو پھر بیٹھے میرا منہ کیا دیکھتے ہو..پورٹروں کو ساتھ لے کر فوراً نالے کے نیچے پہنچو..بقیہ لوگ آتے ہی ہوں گے..''

''ویسے تارڑ صاحب آپ نے کمال کر دیا..سب سے پہلے پہنچ گئے۔''

''میری خوشامد کرتے ہو؟''میں نے چمک کر کہا۔''مجھے اُلو کا پٹھا سمجھتے ہو؟''

''بالکل نہیں..''

برمانی نے نہایت تحمل کا مظاہرہ کیا..اپنی بلوچ رگ کو ذرہ بھر پھڑکنے نہ دیا اور پورٹروں کو ہانک کر نالے کی جانب چلا گیا..

مجھے نگیر، خوشحال، امت اور صدپارہ کے علی جیسے پورٹر یاد آنے لگے جو بھائیوں کی طرح ہمارا خیال رکھتے تھے..کہیں کوئی راستہ ذرا خطرناک اٹھان رکھتا تھا تو ٹھہر جاتے تھے..کہ صاحب آئے گا تو اسے مشکل نہ ہو..کوئی نالہ آتا تھا تو مجھے اپنے جوگر اتارنے نہ دیتے تھے اور اپنے کندھوں پر اٹھا کر پار لے جاتے تھے..شام ہوتی تھی تو زبردستی بدن دباتے ہماری تھکاوٹ اتارتے تھے اور پھر الاؤ کے گرد رقص کرتے گیت گاتے دوستوں سے بڑھ کر دوست ہو جاتے تھے..اور کسی بھی معاوضے یا لالچ سے برتر ہو کر..ایک نفیس اور شاندار انسان کی صورت میں..

ہر کوہ نوردی کی مہم میں جو پورٹر ہائر کئے جاتے ہیں، ان میں بقول منیر نیازی کچھ خبیث روحیں ہوتی ہیں اور کچھ طیب..

پورٹروں میں بھی یہی دو قسمیں پائی جاتی ہیں..

ابھی تک تو ہمیں خبیث روحوں سے پالا پڑا تھا.. لیکن وزہ گندو گورو کے بیس کیمپ تک پہنچتے پہنچتے دو تین طیب پورٹر بھی ظاہر ہو گئے..

جب میری بقیہ ٹیم.. برمانی اور پورٹروں کی مدد سے نالے کے پار ہوئی اور وہ سب مجھ تک پہنچے تو میرا بلڈ پریشر کے ٹو سے اُتر کر میدانی علاقے کی سطح پر تو نہیں البتہ نانگا پربت.. جو دنیا کی نویں بلندترین چوٹی ہے.. وہاں تک اُتر چکا تھا..

ہم نے بڑے پتھر کے سائے میں خوراک کے نام پر کچھ زہر مار کیا اور کچھ دیر اونگھتے ہوئے آرام کیا..

اس بڑے پتھر کے برابر میں.. یہ ایک بلند کنارا تھا تو اس کے نیچے گندو گورو کا گلیشیئر کروٹیں بدلتا تھا.. اور اس کی برفوں سے جدا ہو کر جو پتھر پاتال میں گرتے تھے، ان کی آواز ہم تک پہنچتی تھی اور لگتا تھا کہ ہم ایک بڑبڑاتے ہوئے آتش فشاں کے دہانے پر بیٹھے ہیں.. بلکہ اونگھ رہے ہیں..

وہاں سے چلے تو ذرا منتشر کے طور پر چلے.. ایک دوسرے کو نظر میں رکھتے ہوئے چلے.. شاگی چُو سے چلتے ہوئے علی موسیٰ نے ہمیں اطلاع دی تھی.. اور یہ وہی علی موسیٰ تھا جس نے ہمیں بدگمان اور بے ایمان کر کے گندو گورو کی بجائے کے سکس اور کے سیون کی بڑی بڑی گھاس اور جھیل کی جانب لے جانے کی کی کوشش کی تھی تو اسی ٹین ایج پورٹر نے ہمیں اطلاع کی تھی کہ صاحب راستہ ویسے تو آسان ہے.. آگے میدان ہے.. صرف ایک تھوڑا چڑھائی آئے گا۔

چڑھائی آئے تو آ جائے.. ہم نے سوچا تھا.. آخر کتنا چڑھائی ہوگا.. کیا یہ نوخیز مرد ناداں نہیں جانتا کہ ہم "سنولیک" کے دوران ہیسپر گلیشیئر کے کناروں پر چلتے ہوئے تین عظیم برفانی گلیشیئرز کے کناروں سے اُتار کر انہیں پار کر کے دوسرے کناروں پر چڑھ چکے ہیں جہاں صرف چیونٹیوں اور مکوڑے ہی چڑھ سکتے تھے تو اُن کے مقابلے میں یہ کیا چڑھائی ہوگی.. اور کتنی ہوگی..

لنچ کے زہر مار کے بعد ذرا آگے گئے ہیں تو سطح بالکل ہموار ہو گئی.. اور ہمیں چلنے میں دشواری پیش آنے لگی.. کیونکہ ہمیں چڑھائی کی ایسی عادت ہو گئی تھی کہ میدان میں ہمارے پاؤں

بے ربط ہوتے جاتے تھے.. دائیں ہاتھ پر.. جہاں ہم چلتے تھے.. وہاں سے خاصے فاصلے پر ایک عظیم چٹان سربلند تھی اور اس کے دامن میں چند خیمے نصب تھے..

چٹان کے ایک بڑے اور وسیع دامن میں دوپہر کی دھوپ میں جلتے خیمے تھے..

ان خیموں میں جو مکین تھے اور ظاہر ہے غیر ملکی تھے۔ انہوں نے شاید خیموں کے پردے اٹھا کر ہمیں وہاں سے گرتے پڑتے چلتے دیکھا ہوگا.. اور ان مکینوں میں سے کوئی ایک مسکراتا ہوا.. بلندیوں سے ڈسے ہوئے ایک چہرے کے ساتھ مسکراتا ہوا میرے پاس آ گیا۔

"سر.. آپ یہاں بھی آ گئے؟"

میں اس سوال سے اگرچہ تنگ آ چکا تھا.. مجھے ہمیشہ محسوس ہوتا تھا کہ مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا.. میں نے یہاں آ کر گستاخی کی ہے.. لیکن اس کے باوجود میری انا کو تسکین بھی ہوتی تھی کہ... میں یہاں بھی آ گیا ہوں۔ "آپ کون ہیں؟"

"میں ایک غیر ملکی ٹیم کے ہمراہ رابطہ افسر کے طور پر آیا ہوں۔ کیپٹن.. ہم لوگ گشابرم فور کر کے آئے ہیں.. کنکورڈیا میں.. اور اب گندو گورو سے اُتر کر یہاں پہنچے ہیں.. میں اپنے خیمے سے باہر کھڑا تھا۔ جب آپ کو دیکھا تو دور سے پہچان گیا کہ یہ آپ ہی ہو سکتے ہیں.."

"کیسے؟" میں نے مسکرا کر دریافت کیا..

"ادھر تو آپ ہی ہو سکتے ہیں سر.. اور کون ہو سکتا ہے۔"

یہ نوجوان کپتان ڈھکے چھپے انداز میں مجھے فاترالعقل ہی تو کہہ رہا تھا..

چٹان کے بڑے سائے میں جو خیمہ گاہ تھی، اس سے ذرا آگے گئے تو گر گئے.. اور گر گئے... سے مراد یہ ہے کہ... یہ میدان جب ایک چٹانی سلسلے کی رکاوٹ سامنے پا کر اختتام پذیر ہوا اور ہم ذرا بائیں جانب ہوئے کوئی راستہ تلاش کرنے کے لیے تو کنارے کی بلندی سے نیچے جھانکا تو نیچے گندو گورو گلیشیئر کی وسیع برفانی گزرگاہ سانس لیتی تھی..

اور ہمیں اس گزرگاہ میں اُترنا تھا..

اور اس گزرگاہ تک ایک ایسی اترائی اُترتی تھی جس پر اترا نہیں بس گرا جا سکتا تھا.. اس لیے ہم گر گئے..

شائد یہ وہی اترائی تھی جس کے بارے میں ہمیں خبردار کیا گیا تھا کہ صاحب آگے ایک چڑھائی ہے.. لیکن یہ تو واپسی پر چڑھائی ہوگی.. اب تو یہ ایک اُترائی تھی.. اور یہاں سے نیچے جانے

کے لیے ایک بنگی چھلانگ ہی کارآمد ہو سکتی تھی..

بنگی چھلانگ جس میں ایڈونچر کے رسیا لوگوں کے پاؤں میں ایک رسّی باندھ کر انہیں بلندی سے دھکیل دیا جاتا ہے..

باری باری ایک دوسرے کے سہارے، پورٹروں کے سہارے..لڑھکتے..گرتے پڑتے..پھسلتے..رولر سکیٹنگ کرتے..کبھی بے بسی سے مسکراتے اور کبھی خوف کے آنسو روکتے نیچے پہنچ گئے..گلیشیئر کے قریب پہنچ گئے لیکن اس پر اترے نہیں، اس کے برابر میں جس کنارے سے ہم گرے تھے، وہاں ایک پگڈنڈی پر چلنے لگے..گلیشیئر کے ساتھ ساتھ!

چونکہ ہم کھلے میدان اور بڑے آسمان سے نکل کر گلیشیئر کی گہرائی میں آگئے تھے اور یہاں صرف برفیں تھیں اور اس کے بلند کنارے تھے جن کی تہہ میں ہم چلتے تھے تو یہاں بھی ایک دنیا جہان سے کٹی ہوئی تنہائی تھی جس میں ہم ایک ڈھلوان کنارے پر گلیشیئر کے برابر میں اپنے آپ کو سنبھالتے چلتے جاتے تھے..یہاں بھی دو چار سخت مقام آئے لیکن انہوں نے جی کو خوش نہ کیا کیونکہ پھسلنے کی صورت میں ہم محض چند گز نیچے گر کر گلیشیئر پر جا گرتے اور بخیریت رہتے..تب میں نے پہلی بار اپنے اوپر دیکھا..اور اوپر موت کا ایک منظر دیکھا جو معلق تھا..

چٹانی تودے اور جہازی سائز کے پتھر بلند کنارے کی مٹی میں یوں اٹکے ہوئے تھے جیسے ذرا سی ہوا کے چلنے سے ہم پر لڑھکتے ہوئے نازل ہو جائیں گے..عین ہمارے سروں کے اوپر وہ چٹانیں جانے وہاں کیسے قائم تھیں..کچی مٹی میں پھنسی وہ کسی معجزے سے قائم تھیں اور ذرا سا سانس لینے پر نیچے گر سکتی تھیں..بلکہ گرنے کو تھیں اور ذرا سوچ میں پڑ گئی تھیں کہ اب فوراً گریں یا اپنے نیچے مزے سے چلتے ان بے وقوفوں کو چند لمحے اور جینے کے عنایت کر دیں..وہ چٹانیں ایسے ڈائنا سور تھیں جن کی صرف دُمیں مٹی میں پھنسی ہوئی تھیں اور وہ زور لگا کر باہر آنے کو تھیں..ان سینکڑوں پتھروں اور معلق چٹانوں میں سے کوئی ایک بھی گر کر ہمیں اجل کا سرمہ بنا سکتی تھی..

بہتر یہی تھا کہ سر اٹھا کر اوپر دیکھا ہی نہ جائے..صرف اپنے سامنے دیکھیں اور ایک عالم جذب میں سر ہلاتے چلتے جائیں..

بائیں ہاتھ پر گندوگورو کی برفانی دنیا کی اونچ نیچ میں سے کوئی پتھر کسی برف کی دیوار میں سے جدا ہو کر کہیں نیچے کھائیوں میں گہری گونج سے گرتا تو ہم چونکے ہو کر فوراً اوپر دیکھتے کہ کہیں یہ پتھر اوپر سے تو نہیں آ رہا..کہیں موت کا دن تو معین نہیں ہو گیا..

ازابیل شاہ نے اسی راستے کے بارے میں خبردار کیا تھا کہ اس کی ہولناکی بیان سے باہر ہے..اس کے اوپر جو چٹانیں معلق ہیں وہ کسی وقت بھی نیچے آ سکتی تھیں اور آپ کو ملیامیٹ کر سکتی تھیں..ہم نے شاٹی چو سے چلنے کے بعد اب تک تیز دھوپ کو کوسا تھا اور اب وہی دھوپ اور بن بادل کا آسمان ہمارے لیے باعثِ رحمت تھا..یہاں اگر بارش کے چند چھینٹے بھی پڑ جاتے تو اس کچی مٹی کی گرفت ڈھیلی کر کے ان چٹانوں کو ہم پر دھکیل دیتے..ہم نے یہاں اپنے بے قابو سانس درست کرنے کے لیے بھی ذرا سا رک جانا مناسب خیال نہ کیا اور چلتے رہے..اور ایک دوسرے سے ذرا فاصلے پر چلتے رہے..خاموشی سے دم سادھے چلتے رہے کہ لے سانس بھی آہستہ..کہ نازک ہے بہت کام..

پتھریلی موت کے دامن میں یہ مسافت جب اختتام کو پہنچی تو نیچے ایک نالہ اس طرح گرتا تھا جیسے ہم کنارے سے گرے تھے..نالہ گرتا تھا اور نیچے گلیشیئر کی کسی دراڑ میں گم ہوتا تھا..

ہم نے اسے نہایت آسانی سے اور رغبت سے پار کیا..

اس کے پار ایک کچا راستہ..تقریباً سیدھی ڈھلوان پر..عرش کو اٹھتا تھا..اس پر پرواز کر جانا تو ممکن تھا اس پر قدم رکھ کر چلنا اور چڑھنا..لانا تھا جوئے شیر کا..یا شائد جوئے شیر تو صرف ایک تیشے کے مسلسل استعمال سے لائی ہی جا سکتی ہے لیکن یہاں وہ تیشہ بھی بیکار ہو جاتا تھا..چنانچہ فرہاد ہو جانا بھی کارآمد نہ تھا۔ اس لیے میں نے دو پورٹر طلب کئے اور ان کے بازوؤں پر جھولتا..یونہی کارروائی کے طور پر اپنے پاؤں ہلاتا ان کے سہارے سہارے اس عرش تک جا پہنچا اور شناخت ہو گیا کہ وہ چڑھائی جس کا ڈراوا ہمیں شاٹی چو سے چلتے ہوئے دیا گیا تھا بالآخر طے ہو گئی لیکن پھر وہ شناختی ایک ایسے ہراس میں بدلی جس میں ماتھے پر یکدم خوف کے پسینے نالوں کی صورت میں بہنے لگے..اور دل جو پہلے سے ہی پریشر میں تھا ایک دھک کر کے تا دیر رُکا رہا اور پھر اس نے بہت دیر بعد ایک اور دھک کی اور پھر رک گیا کیونکہ سامنے..سامنے تو نہیں اوپر وہ چڑھائی تھی جس کے بارے میں ہمیں خبردار کیا گیا تھا..

پہلے جو کٹھنائیاں آئی تھیں وہ تو محض ٹریلر تھے، اصل فلم کا تو اب آغاز ہوا تھا..میں نے بہت سی تو نہیں..لیکن دس بارہ ایسی آسمانی سیڑھیوں پر قدم رنجہ فرمایا تھا..لیکن سیڑھیاں ایسی جن کا کوئی زینہ سلامت ہو..کبھی ورگوتھ کی ندیوں سے پہلے اور کبھی سنولیک کے دوران کسی گلیشیئر کی دیوار پر چڑھتے ہوئے..لیکن اس چڑھائی کی شان ہی الگ تھی..

دیگر چڑھائیوں میں تو پھر کہیں اخلاقیات کی کوئی نہ کوئی رمق موجود تھی.. لیکن یہ چڑھائی ایسی واہیات تھی کہ اس کا کوئی کردار نہ تھا.. کوئی اخلاق نہ تھا اور نہایت مخرب الاخلاق تھی..

ہم بُھربُھری مٹی اور پتھروں سے تقریباً ناک لگائے کھڑے تھے اور جب بمشکل اوپر نظر کرتے تھے تو وہاں ہمارا ایک پورٹر آسمان میں نقب لگائے کھڑا نظر آتا تھا..

یہ کمبخت کا بچہ وہاں پہنچ کیسے گیا.. یقیناً کسی اور راستے سے وہاں پہنچا ہے۔ ادھر کوئی راستہ ہوتا تو ہمیں دکھائی نہ دیتا..

اور ہاں میں ابھی یہ اعتراف کر لوں کہ درہ گندوگورو کی اس مہم کے دوران یہ آسمانی چڑھائی.. جہاں ایک محتاط اندازے کے مطابق کوئی معمولی درجے کی روح بھی پرواز نہیں کر سکتی تھی.. بدترین تھی اور مرگ ترین تھی..

ہم اس پر آگے پیچھے چڑھتے.. نہیں چڑھ سکتے تھے.. ہر ایک کو باری باری.. اس سولی پر چڑھنا تھا.. اور یہاں بھی یہ کہا جا سکتا تھا کہ بچّے چڑھ جا سولی رام بھلی کرے گا.. لیکن ہمارا تو پہلے ہی بولو رام ہو گیا تھا، اب وہی رام کیسے بھلی کر سکتا تھا..

چنانچہ پہلا بچّہ جو شاید سلمان تھا پہلے سولی چڑھا.. بلکہ اوپر اٹھتا گیا اور پھر ہماری نظروں سے غائب ہو گیا.. لیکن تنہا نہیں بلکہ پورٹروں کے بازوؤں میں لٹکتا ہوا.. اب یہ کھلا کہ ہم نے باری باری اوپر کیوں جانا تھا.. دو پورٹروں اور ایک سلمان کے پاؤں جب بوجھ سے لدے خچروں کی طرح پتھروں پر بے اختیار پڑتے تھے تو وہ گیندوں کی مانند اچھلتے ہوئے نیچے وہاں تک آتے تھے جہاں ہم گھبرائے ہوئے کدوؤں کی مانند ڈرے بیٹھے تھے..

اور یہ پتھر سکڈ میزائلوں کی مانند.. شہاب ثاقب کی مانند شوٹ کرتے آتے تھے.. پھر خبر آئی کہ سلمان پہنچ گیا ہے.. پتہ نہیں کہاں پہنچ گیا ہے کہ وہ ہمیں نیچے سے دکھائی نہیں دے رہا تھا.. لیکن ہمیں تسلی ہوئی کہ اگر ایک بھالو اوپر پہنچ سکتا ہے تو ہمارا ابھی کچھ چانس ہے.. اور ہم بھول گئے کہ بھالوؤں کا تو کام ہی لڑھکنا اور چڑھنا ہے اور ہم انسانی جانور تھے.. چوپائے کی بجائے دوپائے تھے..

اور یہی ہماری غلط فہمی تھی کہ ہم اپنے آپ کو اب تک اشرف المخلوقات کی فہرست میں رکھتے تھے کیونکہ ہم سب اوپر جاتے ہوئے چوپائے ہو گئے.. تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے.. بلکہ سبھی بھالو ہوئے..

یہ داستانِ الم مختصر کر دوں تو بہتر ہے..

میں بھی ایک معلق حالت میں ہوا میں پاؤں چلاتا.. ہتھیلیوں پر رینگتا.. دو پورٹروں پر اپنا ناروا بوجھ ڈالتا شدید سراسیمگی کی حالت میں اوپر جاتا تھا اور اپنے آپ پر لعنت بھیجتا تھا کہ آخر کار میں یہاں.. کسی شائی نچوسے چل کر کسی دل سنگ پا وغیرہ کو جاتا ہوں تو کس لیے جاتا ہوں.. میں اس بیہودہ مقام پر کیا کر رہا ہوں۔ لاہور میں ہوتا تو کسی ادبی یا بے ادبی فنکشن کی صدارت کر رہا ہوتا اور بعد میں چائے کی میز پر چند نابالغ مداحوں میں گھرا.. کچھ حسین اور زیادہ تر غیر حسین خواتین کو آٹوگراف دے رہا ہوتا تو میں یہاں کیا کر رہا ہوں..

داستانِ الم نہ صرف مختصر کرتے ہیں بلکہ مختصر ترین کر دیتے ہیں..

اوپر.. آسمانی سیڑھی کے اختتام پر ہر کوئی ایک بڑے پتھر کی قربت میں ڈھیر ہو رہا تھا..

میں بھی ہو گیا..

اور جب نزع مکمل ہو گئی.. تو پھر بھی ہم کچھ دیر کے لیے ڈھیر رہے.. خاصی دیر کے بعد اس ڈھیر میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے اور ہم پھر سے چلنے لگے..

"دل سنگ پا.. پھولوں کا کھیت، جہاں کوئی پھول نہ تھا"

ہم چلے.. دائیں ہاتھ پر کہیں نیچے گندوگور رہ گیا تھا جب ہم چلے..

ہمارے آس پاس.. برفانی نالیوں اور ندیوں کی سوکھی ہوئی گزرگاہیں تھیں.. مرجھائی جھاڑیاں اور بُوٹے تھے.. ایسے جن پر کبھی پھولوں کے ڈھیر کھلے ہوں گے اور اب وہاں ان کے خزاں رسیدہ پتوں پر ان کے ڈھل باقی تھے... جیسے دیوسائی میدان کی بہار چند روزہ ہوتی ہے اور جو کوئی موسم گل کے بعد وہاں سے گزرتا ہے تو یقین نہیں کر سکتا کہ یہاں قافلہ ہائے رنگ و بُو بھی ٹھہرے تھے..

ازابیل نے ں.. ے وزیک کا سب سے خوبصورت حصہ قرار دیا تھا.. اسے پھولوں کی وادی کہا تھا..

اس لیے کہ "دل سنگ پا" کے لغوی معنی "پھولوں کے کھیت" کے ہیں.. لیکن پھولوں کا یہ کھیت ویران ہو چکا تھا..

جیسے گندم کی کٹائی کے بعد کھیت میں بُوٹوں کے کُھردرے ٹُنڈ رہ جاتے ہیں.. اُن کی جڑیں باقی رہ جاتی ہیں اور انہیں دیکھ کر یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ کبھی ان پر سنہری خوشے جھومتے تھے.. ایسے یہ پژمردہ بوٹے اور جھاڑیاں تھیں.. گھاس میں.. ڈھلوان پر اور ہمارے راستے میں بکھری ہوئیں کہ انہیں دیکھ کر یہ گمان بھی نہ گزرتا تھا کہ یہاں کبھی صرف رنگوں کی بادشاہت ہوگی..

خشک گزرگاہوں کو دیکھ کر یہ خیال بھی نہیں آتا تھا کہ ان میں برفانی اور سورج کی روشنی سے پارہ ہوتے لشکتے پانی بہتے ہوں گے..

ہمیں پچھلے ماہ یہاں آنا چاہیے تھا جب یہ انداز ے.. یہ گمان اور یہ خیال جھوٹے ہوتے..

کہیں بلند پہاڑوں میں.. ان کے اندر جانے کے لیے موزوں ترین مہینہ جولائی کا ہے.. مئی کے مہینے میں برف پگھلتی ہے.. دھوپ تیز ہوتی ہے.. جون میں غدر مچ جاتا ہے.. ندی نالے پُرشور ہو جاتے ہیں.. گلیشیر کے کناروں پر جو وادیاں ہوتی ہیں، ان میں آبشاریں اُترتی ہیں۔ گھاس بلند ہونے لگتی ہے اور پھول کھلنے لگتے ہیں.. چشمے جاری ہو جاتے ہیں اور جھرنے چٹانوں کی کوکھ میں سے پھوٹنے لگتے ہیں.. ڈھلوانوں پر جہاں برف ہوا کرتی تھی، وہاں ہریاول کی چادر بچھنے لگتی ہے.. اور جولائی میں قافلہ ہائے رنگ بُو جوبن پر آ جاتا ہے.. لیکن اگست کے شروع میں بلندیوں پر پھر سے ٹھنڈک اُترنے لگتی ہے.. دھوپ میں تمازت نہیں رہتی.. ہلکی برفباری شروع ہو جاتی ہے اور ندی نالے سوکھنے لگتے ہیں.. وہ دن کی بہار کے بعد جھاڑیوں اور بوٹوں پر جو پھول کھلتے تھے وہ اپنی زندگی پوری کر لیتے ہیں.. رنگ و بو کا قافلہ کوچ کر جاتا ہے..

اور ہم یہاں اگست کے تیسرے ہفتے کے آغاز میں پہنچے تھے..

اب یہاں محض پرچھائیاں تھیں.. آثار تھے کہ کبھی یہاں سے کوئی قافلہ گزرا تھا..

"پھولوں کا کھیت" اُجڑ چکا تھا..

آسمانی سیڑھی سے آگے.. ہم زیادہ دیر نہیں چلے جب ہم ذرا اونچے ہوئے.. ایک بلند کنارے پر آئے تو یکدم نیچے.. دل سنگ پا دکھائی دیا..

ایک ویران میدان.. گلیشیر کے بلند کناروں کی اوٹ میں.. چٹانوں کے دامن میں شام کی سرد چھاؤں میں آ رہا تھا.. ایک جانب ایک مختصر پانیوں والی جھیل جس میں شام اُترتی تھی..

اور دوسری جانب گلیشیر کی دیوار کے اس پار مشابرم سربلند.. درہ مشابرم کی ابھار برفیں.. اور ان کے آس پاس بے شمار.. بلکہ چھ سات بڑے بڑے گلیشیر برفانی دریاؤں کی مانند بہتے اُترتے.. لیکن منجمد کیفیت میں.. ٹھہرے ہوئے.. دل سنگ پا پر اُمڈتے ہوئے..

اور ان برف زاروں کی اوٹ میں دل سنگ پا کی ویران پناہ گاہ..

کسی نے بتایا تھا کہ دل سنگ پا کی رات میں اتنی ہی سردی ہوتی ہے جتنی کنکورڈیا میں۔

4150 میٹر یا 13600 فٹ کی بلندی پر دل سنگ پا..

مشابرم چوٹی اور مشابرم درّے کے سامنے پھولوں کا کھیت جس میں کوئی ایک پھول بھی نہ تھا..

"لاہور کی بھیڑ میں.. باقی رہ گئے پانچ"

لاہور کی بھیڑ بڑھ گئی تھی..

صرف دو ہفتے پیشتر جب ہم یہاں سے نکلے تھے تو یہاں اتنی کاریں.. اتنے ریڑھے تانگے، رکشا، بسیں اور لوگ تو نہیں تھے..

یہ کہاں سے آ گئے..

ہماری ویگن کی ونڈ سکرین میں سے کوئی دندناتی ہوئی بس ہماری جانب آتی تو ہمیں یقین ہو جاتا کہ یہ ونڈ سکرین کو پاش پاش کرتی ویگن کے اندر آ جائے گی اور ہم اپنی نشستوں میں دبک جاتے..

بھاٹی گیٹ سے آگے میرے بچپن کے دن ایک فلیش کی صورت گزرے..

یہاں.. جہاں اب جوس کی دکانیں ہیں یہاں اپنے نعیم بخاری کے دادا ڈاکٹر طفیل کا کلینک ہوا کرتا تھا اور وہ گورے چٹے نہایت پیارے بھالو ڈاکٹر میری پسلیوں میں سٹیتھوسکوپ لگاتے تھے تو میں آسمان سر پر اٹھا لیتا تھا کہ میں ایک چھ برس کا گانو مالو بچہ ہوا کرتا تھا..

ذرا آگے مسلم ماڈل ہائی سکول کی عمارت نظر آنے لگی جہاں میں ایک معمولی لیاقت کا طالب علم ہوا کرتا تھا اور ماسٹر رحمت خاں، رفیق صاحب، نادر خاں اور ہیڈ ماسٹر عبدالعزیز صاحب کے ستم کا نشانہ ہوا کرتا تھا.. اور پھر اس کے برابر میں گورنمنٹ کالج کے گوتھک برج منارے تھے جن کے سائے میں میری جوانی کے دو برس پل بھر میں بیت گئے..

وہی گورنمنٹ کالج جہاں میرے بدن میں کوہ نوردی کے پہلے جراثیم انجیکٹ کیے گئے.. "وادی کشن گنگا" مہم کے ایک ممبر کی صورت میں اور وہاں سے واپسی پر ہر لڑکے کو

بلاتخصیص کالج کا کوہ پیمائی کا کلر عطا کر دیا گیا تھا.. اور اسی حادثے کی بنا پر کے ٹو کی چوٹی پر پہنچنے والا پہلا پاکستانی اشرف امان مذاق میں مجھے اپنا استاد کہتا تھا..

تو یہیں اس کالج کے وکٹورین برآمدوں میں.. اوول گراؤنڈ میں.. اس دیوانگی کوہ نوردی نے جنم لیا تھا.. میں اگر آج کہیں بلند پہاڑوں سے لوٹتا تھا تو اس کا بیج یہیں بویا گیا تھا..

گورنمنٹ کالج گزرا تو لوئر مال پر "سنگ میل پبلی کیشنز" کا بورڈ نظر آیا..

پہاڑوں سے واپسی پر یہ بورڈ ہمیشہ نظر آتا تھا..

لیکن اس بار اس بورڈ کے حروف دھیمے اور بجھے بجھے سے تھے..

وہاں اب اعجاز نہ تھا.. صرف جوان بیٹے کی یکدم ہمیشہ کے لیے رخصتی کے دکھ میں دکھی ڈھے چکے نیاز صاحب تھے اور وہ بھائی تھا جو تنہا رہ گیا تھا۔ اس کی جوڑی ٹوٹ گئی تھی اور اس کی کمر پر زندگی بھر کی تنہائی اور رنج کی دھوپ تھی.. ایک بھاری پتھر تھا جو اس کے بدن کی جھیل کی تہہ میں تھا..

سول سیکرٹریٹ کے آگے ہوئے.. اور ہماری ویگن میوگارڈن میں داخل ہو گئی..

سلمان کے گھر کے آگے جا رکی..

وہ اُترنے سے پیشتر ذرا جھجکا اور پھر اُتر گیا..

باقی رہ گئے.. پانچ!

"پانچ گلیشیئر.. میرا خیمہ اور 13600 فٹ بلند سرد رات"

ہم دل سنگ پا میں اُترنے لگے..

گندوگورو کے کناروں سے نیچے اُترنے لگے..

اس کے پہلو میں اجڑا ہوا پھولوں کا کھیت تھا، اس میں اُترنے لگے..

گھاس کم کم تھی.. ریت بہت تھی..

دائیں ہاتھ پر چٹانوں کے دامن میں ایک کم پانیوں والی جھیل تھی.. اتنے کم کہ اس میں جابجا پتھر اُبھرے ہوئے تھے.. وہیں کہیں سے ایک چشمہ اس میں شامل ہوتا تھا اور یہ ہماری واٹر سپلائی تھا.. شکر ہے ابھی تک چل رہا تھا خشک نہیں ہوا تھا..

ریتلے میدان سے ذرا بلند ایک پتھریلی چاردیواری دکھائی دے رہی تھی جس کی جانب ہمارے پورٹر ایک تیر کی مانند گئے اور لمحوں میں پتھروں کے اوپر کچن ٹینٹ کی ترپال آویزاں کر کے آسودہ ہو گئے..

دل سنگ پا میں اُترنے سے پیشتر میں نے بائیں جانب ایک سرسبز گھاٹی کے دامن میں دو پتھریلے جھونپڑے دیکھے تھے جن میں بقول ازابیل شاہ ہوشے کی کچھ ایسی خواتین کو ہونا چاہیے تھا جو یہاں مویشیوں کی نگہبانی کرتی ہیں، دودھ دوہتی ہیں اور پنیر بناتی ہیں.. وہ پتہ نہیں اب تک وہاں تھیں یا نہیں کیونکہ میں نے آس پاس کسی مویشی کو نہیں دیکھا تھا..

اور اس منظر نے میری توجہ اس لیے حاصل کی کہ ان جھونپڑوں کی جانب ہمارے دو پورٹر کمبل اٹھائے جا رہے تھے.. وہ یقیناً اس بلندی پر تن تنہا قیام پذیر خواتین کے عزیز رشتے دار تھے اور ایک چھت تلے رات گزارنے کے لیے ادھر جاتے تھے.. وہاں ایک چھت کے علاوہ انہیں پینے

کو دودھ اور کھانے کو پنیر ملنے کی امید تھی..

ہم تو اسی خیال میں تھے کہ شائی چُو کی مانند ادھر دل سنگ پا میں بھی غیر ملکیوں کے خیموں کی ایک دنیا ہوگی لیکن وہاں کوئی نہ تھا.. اگرچہ ہم تنہائی کے تمنائی تھے اور ہمیں خوش ہونا چاہیے تھا لیکن ہم ذرا ڈر گئے کہ ہم اتنی بڑی اور مکمل تنہائی کے بھی تمنائی نہ تھے..

ہر جانب گلیشیئر دندناتے ہوئے اُترتے تھے..

لیکن وہ دیوار کے پار رُک جاتے تھے..

برف بلندیاں تھیں اور ان برف پوش حسیناؤں میں سب سے گورے اور ٹھنڈے اور بلند قامت والی مشابرم تھی.. ہم نے اس سے بے وفائی کی تھی اور اس کے بیس کیمپ میں جانے کی بجائے ادھر آ نکلے تھے..

ویسے ہم کسی حد تک کنکورڈیا ٹریک کے متوازی چل رہے تھے..

بھگر پیک کی جانب سے ایک راستہ کھوبرسے کی خیمہ گاہ میں جا اُترتا تھا..

شائی چُو سے پرے وہ گلیشیئر شروع ہوتا تھا جو مونالیزا چوٹی چوغولیزا تک چلا جاتا تھا.. چلا جاتا تھا یا وہاں سے اُتر کر نیچے آتا تھا اور چوغولیزا گلیشیئر کہلاتا تھا..

اس مشابرم کے پار وہ برفانی عجائب گھر تھا جس سے اگلا سٹاپ گورے ٹُو کا تھا.. اور گندوگورو درے کے پار کنکورڈیا اور کے ٹُو تھا..

گویا ہم سب کنکورڈیا ٹریک کے اس جانب چل رہے تھے.. دیوار کے اس پار تھے..

اس لیے یہاں دل سنگ پا میں بھی وہی موسم تھے.. آئے موسم برفیلے سہانے.. ہم خیموں کے باہر میٹرس پر استراحت فرمانے کی کوشش کرتے تھے لیکن سردی کرنے نہ دیتی تھی.. کبھی کبھار کسی گلیشیئر پر سے کوئی ایوالانچ گرنے سے ایک گہری دل کو ہلا دینے والی گونج دل سنگ پا کی تنہائی میں امڈتی ہوئی آتی.. سنائی دیتی.. اور جتنی دیر میں ہم اس برفانی تودے کو گرتے ہوئے دیکھنے کی آرزو میں اسے متعدد گلیشیئرز پر نظریں دوڑاتے تلاش کرتے وہ تودہ گر چکا ہوتا اور اس کی گونج گم ہو چکی ہوتی..

پورا دل سنگ پا.. مشابرم کی چوٹی.. اس کا برفانی وزہ اور متعدد گلیشیئر کم از کم آج کی شب ہماری جائیداد تھے.. ان کی رجسٹری ہمارے نام ہو چکی تھی، بے شک ایک شب کے لیے ہی سہی.. ہم وہ نظام سقے تھے جو برف کے سکے چلا سکتے تھے.. اپنے تخیل کی ٹکسال میں پوری مشابرم کو ڈھال

سکتے تھے..

عموی طور پر ٹیم ممبران کی بدنی حالت مناسب تھی..اگرچہ ٹیم لیڈر کی پنڈلیوں اور رانوں میں ایسی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے..یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے نہیں..بلکہ یہ ٹیسیں اور درد کہاں سے نہیں..کہاں کہاں سے اٹھتا ہے..بہر حال مجموعی طور پر صورت حال انڈر کنٹرول تھی..

"تارڑ سائیں" برمانی گھوڑا میرے پاس آ بیٹھا..

"جی سائیں.."

"میں بے حد مایوس ہوا ہوں.."

"دل سنگ پا سے؟"

"نہیں سائیں،اس کی تنہائی نے تو میرا دل موہ لیا ہے۔"

"تو پھر کس سے؟"

"آپ کی ٹیم سے..!"

"ہاں..یہ ایک عجیب نا قابلِ فہم قسم کی مسخری ٹیم ہے..جس میں ہر قسم کے تحفے پائے جاتے ہیں..اور تم تازہ ترین تحفہ ہو۔"

"سائیں یہ ٹیم تو "سنولیک" والی ٹیم نہیں ہو سکتی..اُسے تو پرفیکٹ ہونا چاہیے.. "سنولیک" تک پہنچ جانے والی ٹیم ایسی اَن فِٹ کیسے ہو سکتی ہے..بشمول آپ کے۔"

"ہم تو بس ایسے ہی اول جلول قسم کے لوگ ہیں ڈاکٹر..بے شک دور سے ہم کوہ نوردی بجائے اپاہج فقیر لگتے ہیں جو گھسٹتے ہوئے چلے آتے ہیں اور سب سے پیچھے یہ فقیر پُر تقصیر چلا آتا ہے لیکن میں تمہیں کیا بتاؤں کہ سوہنے رب کا کوئی ایسا کرم ہے ہم پر کہ ہم آج تک ناکام نہیں لوٹے..جہاں پہنچنا ہوتا ہے وہاں کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی جاتے ہیں..ماتم کرتے روتے پیٹتے..گھسٹتے..آنسو بہاتے..پہنچ ہی جاتے ہیں..یوں بھی سنولیک کا ٹریک کیے ہوئے پانچ برس ہونے کو آئے ہیں تو اس دوران بدنی ہمت میں فرق تو پڑ گیا ہے ناں..عمر کے زوال پر تو ہمارا بس نہیں۔"

"میرا خیال ہے آپ یوں بھی اپنے ساتھیوں کو ذرا زیادہ پروٹیکٹ کرتے ہیں.."

"ہاں شائد..کیونکہ وہ میرے ساتھی ہیں..میرا ساتھ دیتے ہیں۔ میرا خیال رکھتے

ہیں..میں ان کے بغیر شاید اتنے ٹریک نہ کر سکتا..لیکن کبھی کبھار اوور پروٹیکشن بھی ہو جاتی ہے اور میرا کوئی ساتھی گھمنڈ میں آ جاتا ہے اور مجھے اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے..کوئی ایک ساتھی گدا ہو جاتا ہے..ویسے تم فکر نہ کرو،میں تمہیں بھی پروٹیکٹ کروں گا۔"

برمانی ہنسنے لگا..اور وہ اپنے بیٹے تیمور کی مانند ایک معصوم بچے کی طرح ہنستا تھا..

ویسے برمانی کی ہنسی اس بات کی مظہر تھی کہ دل سنگ پا ایک ایسا مقام ہے جہاں اس جیسا خاموش انسان بھی ہنسنے پر..خوش ہونے پر..مجبور ہو جاتا ہے..

چنانچہ دل سنگ پا اُس شب ہماری سلطنت تھا..

ہم اس پر حکمرانی کرتے تھے..

یہ جو چھ سات عظیم برفانی تودے ہمارے دائیں بائیں اُترتے تھے،یہ ہماری ریاستیں تھیں..ان کے اوپر جو چوٹیاں برف بھار سینوں والی اُمڈتی تھیں،یہ ہماری کنیزیں تھیں..مشابرم ہماری رکھیل تھی..یہ سب ہمارے تابع تھے..صرف اس لیے کہ ہم یہاں تک پہنچ گئے تھے..

جیسے "پاک سرائے" کے دوران پورٹر نگیر نے کہا تھا کہ صاحب وادی اُس کی ہوتی ہے جو وہاں تک پہنچ جائے..اور ہم پہنچ گئے تھے..

میں نے اگرابھی ابھی یہ بیان دیا تھا کہ عموی طور پر ٹیم ممبران کی بدنی حالت مناسب تھی تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ ہر کوئی ڈربی ریس کے گھوڑے کی مانند بگٹٹ بھاگ رہا تھا اور سپر فٹ تھا۔حسن قدرے ڈھیلا اور بے ربط ہو رہا تھا۔میاں صاحب کا ٹخنہ سوج کر کُپا ہو رہا تھا اور پاؤں میں چھالے تھے..عامر کے پیٹ میں گڑبڑ تھی..سلمان بھی فکر مند تھا اور میں اپنی حالت زار تو بیان کر ہی چکا ہوں..البتہ شاہد صاحب حسب عادت نہ اقرار کرتے تھے نہ انکار کرتے تھے..اگرچہ ڈاؤن ڈاؤن لگتے تھے..

دل سنگ پا13600فٹ کی بلندی پر براجمان تھا..ہم زیادہ دیر تک خیموں سے باہر براجمان نہ رہ سکے کہ ہم باہر بیٹھے رہتے تو اگلی صبح ہم بھی برفانی عجائب گھر کے سفید سفید مجسمے ہوتے..

کھانے کے فوراً بعد خیموں میں پناہ گزیں ہو گئے..

جوں جوں رات اُترتی تھی توں توں 13600 فٹ کی بلندی اپنے کرشمے دکھاتی تھی..ہڈیوں میں برف کے جل ترنگ بجاتی تھی اور سانس میں ہوا کی بجائے برف کی کرچیاں

بھرتی تھیں اور سونے نہیں دیتی تھیں.. بچپن میں فلم ''پرچھائیں'' کا لتا منگیشکر کا گایا ہوا گیت ''کٹتے ہیں دکھ میں یہ دن.. پہلو بدل بدل کے'' مجھ پر بہت اثر کرتا تھا.. اب کھلا کہ لتا نے یہ گیت دل سنگ پا کی اس رات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے گایا تھا.. یہاں بھی یہ رات دکھ میں کٹتی تھی اور کروٹ بدل بدل کے..

دل سنگ پا کی شام میں ہم جن گلیشیرز کو اپنی رعایا تھیں اور جن چوٹیوں کو اپنی کنیزیں سمجھ رہے تھے، وہ اس کی سرد رات میں ہم پر حاوی ہو کر ہم پر حکمرانی کرنے لگیں.. اس سے ہمارا سکہ کھوٹا ہو گیا اور ہم بادشاہ سے پھر سے غلام بنے ہو گئے..

رات کے کسی پہر مجھے مجبوراً خیمے سے باہر آنا پڑا..

ایسی شدید سردی میں اگر خیمے میں آگ بھی لگ جائے تو بھی میں اپنے سلیپنگ بیگ سے باہر نہ آؤں.. لیکن یہ مجبوری آگ سے بھی زیادہ مجبوری تھی..

مجھے کوہ پیمائی کی کسی کتاب میں اس کا حل نہیں ملا.. بلکہ ایک بار شاید دیوسائی کے درّہ برجی لا کی اُس رات میں جب برفباری تھمتی نہ تھی تو میں نے سوچا تھا کہ انسان کے پاس ایک ربڑ پائپ ہونا چاہیے کہ اس میں فٹ ہو کر خیمے کے اندر ہی اندر فراغت ہو جائے..

اگر یہاں دل سنگ پا میں میرے پاس کوئی پائپ ہوتا تو میں ہرگز باہر نہ جاتا..

لیکن یہ نہ تھی ہماری قسمت.. اس لیے مجھے مجبوراً باہر آنا پڑا.. کہ میرے مثانے پر جو شدید دباؤ تھا، وہ خیمے میں آگ لگ جانے سے کہیں زیادہ جان لیوا تھا..

بہر حال میں اس دباؤ کو دبانے کی کوشش کرتا.. سلیپنگ بیگ سے باہر آیا.. رینگتا ہوا خیمے سے باہر آیا.. لیکن باہر آنے سے پیشتر اپنی سنو جیکٹ پہن لینے کو نہ بھولا.. اگر بھول جاتا تو برفانی عجائب گھر میں ایک مجسمہ ہو جاتا..

میں باہر آیا.. اور جب میں اپنے آپ کو ہلکا کرنے کے بعد ایک عجب بالیدہ رُوح کے ساتھ خیمے میں جانے کو تھا تو میری نظر آسمان پر گئی..

اور وہاں کوئی اور آسمان تھا..

اور یہ وہ آسمان تو نہ تھا جو پچھلے ساٹھ برس سے میرے سر پر ایک خیمے کی مانند تنا رہا تھا..

میں اپنا آسمان کہیں بھول آیا تھا..

یہ درست کہ ایک آسمان اپنے کہکشاں کے دوپٹے کے ساتھ دریائے سندھ میں اُترا تھا اور

اس میں اپنے ستارے ڈبوتا اور جھلملاتا تھا.. ایک اور آسمان فیئری میڈو پر اُترتا تھا اور ہم الاؤ بجھا دیتے تھے تاکہ اس کے ستارے نزدیک آ جائیں..

لیکن یہ.. دل سنگ پا کی رات کا آسمان کوئی اور آسمان تھا..

اس آسمان کے ستارے الگ الگ نہ تھے بلکہ ایک کہکشاں کی صورت میں بچھے ہوئے روشن تھے..

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے!

اور وہ 13600 فٹ کی بلندی پر اتنا قریب تھا کہ میں اس کا روشن دوپٹہ ذرا ہاتھ بڑھا کر اُتار کر سکتا تھا اور اوڑھ سکتا تھا..

ستاروں کے جھمگھٹے تھے جو مشابرم کی چوٹی سے لپٹتے جاتے تھے.. روشن شراروں کی مانند اس کی برفوں میں دفن ہوتے جاتے تھے لیکن بجھتے نہ تھے اور اس کی برفوں کے ناخنوں تلے لَو دیتے تھے..

میرے آس پاس.. ہر سو چپ تھی.. دل سنگ پا پر لاکھوں ستاروں کی روشنی بچھی ہوئی تھی..

یہ ستاروں کی کیسی بارات اُترتی تھی..

میں پوری شب جب تک کہ ستاروں کی یہ بارات رخصت نہ ہو جاتی وہاں خیمے سے باہر جب سارا عالم سوتا تھا، میں منہ اٹھائے اس بارات کو تکتا رہتا لیکن سنو جیکٹ اور گرم جرابوں کے باوجود میرا بدن سردی کو سہارتا نہ تھا اور بری طرح کپکپانے لگ گیا تھا..

اُن چھ سات گلیشیئرز کی قربت مجھے منجمد کرنے کو تھی..

مجھے اپنے خیمے میں لوٹنا تھا..

خیمے کا پردہ اٹھانے سے پیشتر میں نے ایک بار پھر دل سنگ پا کے آسمان پر نظر کی.. پھولوں کے اس برفانی اجڑ چکے کھیت پر نگاہ کی..

وہ... 13600 فٹ کی بلندی پر ایک گھنا اور روشنی بھرا ستاروں کا کھیت تھا جس میں میرے تخیل اور آرزوؤں کے بل چلتے تھے.. دل سنگ پا کی صرف یہ رات بھی اس لائق تھی کہ.. لاہور سے.. بشام۔ گلگت۔ سکردو۔ خپلو۔ ہوشے اور پھر شائی چو سے کہیں آگے صرف اس کے لیے سفر کیا جائے..

یہ ایک ایسا منظر تھا..

منظروں کا یہی وہ دانہ تھا جو سوہنا رب کبھی ترشنگ میں.. کبھی کرومبر میں.. شمشال۔ ملتر کی جھیلوں۔ بیافوہیسپر کی سنولیک اور کبھی ماگو اور کبھی اشکولے میں ڈال دیتا تھا اور ہم ناتواں پرندے اپنے اپنے آشیانے چھوڑ کر اس دانے کو چگنے کے لیے آ جاتے تھے..

یہی وہ برفانی اور بلند دام تھا جس میں شکار ہونے کی خاطر ہم بے اختیار اپنے گھروں سے نکل آتے تھے..

اس دام سے.. اس جال میں پھنس کر اگرچہ ہم اپنی ناتوانی میں پھڑپھڑاتے اپنے آپ کو زخمی بھی کر لیتے تھے لیکن اس کے باوجود اس کی گرفت سے آزاد نہیں ہونا چاہتے تھے..

دل سنگ پا کا یہ آسمان بھی.. ایک ایسا ہی دانہ تھا.. دام تھا.. جال تھا.. کیا ہر ایک کے نصیب میں ایک مختلف آسمان ہو سکتا ہے..؟

نہیں.. ہرگز نہیں!

بیشتر لوگ ایک ہی آسمان تلے نہایت کامیاب زندگیاں گزار دیتے ہیں.. بلکہ اپنی زندگی میں وہ ایک آسمان بھی کم کم ہی دیکھتے ہیں..

صرف کوہ نوردوں کے نصیب میں مختلف آسمان ہوتے ہیں!

اور دل سنگ پا کے آسمان ہوتے ہیں..

"حیلو کا بلتی نگتی.. اور اُجڑا ہوا پھولوں کا کھیت"

سورج کے رتھ نے دل سنگ پا کے آسمان پر بکھرے ستاروں کو اپنی روشنی سے روند کر معدوم کر دیا تھا اور اب وہاں اس کا راج تھا.. جب میں اپنے خیمے سے باہر آیا..

نایاب قسم کی تصویر کشی کے آرزومند میرے ساتھی جھیل کے مختلف پانیوں میں سویر کی روشنی میں عکس ہونے والی مشابرم اور دوسری برفانی چوٹیوں کی تصویریں اُتارنے میں محو تھے.. جھیل سے ذرا اوپر ایک چشمہ چٹانوں میں پھوٹ کر ایک چھوٹی سی ندی کی صورت نیچے اُترتا تھا، جھیل کا حصہ بن جاتا تھا.. میں نے اس ندی کے کنارے بیٹھ کر شیو کی اور اس احتیاط سے کی کہ آئینے میں دیکھتے ہوئے اپنا آپ نہ دیکھا جائے کہ وہاں دیکھنے کے لیے سوائے ایک مجنوں باباجی کے اور کچھ نہ تھا..

شیو کے بعد میں نے اپنا پہاڑی اشنان کیا..

چاہے ہم کتنی ہی بلندی پر فائز کیوں نہ ہوں.. دنیا کے طویل ترین گلیشیرز پر ہی خیمہ زن نہ ہوں، میں ہمیشہ یہ اشنان کرتا تھا.. یعنی شیو کے بعد جیکٹ اُتارتا تھا۔ سویٹر اُتارتا تھا، ٹی شرٹ اور بنیان اُتارتا تھا اور پھر تقریباً تیس سیکنڈ کے اندر اندر اپنے بالائی دھڑ پر پانی کے چھینٹے مار کر اسے تولیے سے خشک کر کے فوراً ہی تو اترے اپنا سب کچھ پہن لیتا تھا.. وزدہ ہیسپر کی ٹاپ پر پانی نہ تھا تو برف سے کام چلا لیا.. میرے ساتھی ہمیشہ مجھے اس اشنانی عمل میں مصروف پا کر تشویش سے دیکھتے تھے کہ باباجی اتنی سردی میں یوں پیرس کے کسی نائٹ کلب کی سٹرپ ٹیز ڈانسر کی مانند اپنا اوپر والا حصہ عریاں کر رہے ہیں تو نہیں ڈبل تو کیا ٹرپل نمونیا ابھی ہو جائے گا.. لیکن میں باز نہ آتا تھا کہ یہ اشنان مجھے نیا نکور کر دیتا تھا اور میرا بدن.. کم از کم بالائی بدن کھنکنے لگتا تھا.. زیریں بدن میں

کھنکنے کی صلاحیت یوں بھی کم کم رہ گئی تھی..

شاہد صاحب کیمرے کو اتنی سنجیدگی سے آپریٹ کرتے تھے جیسے وہ پہلے ایٹم بم کو ڈی ٹونیٹ کرنے کو ہوں..اُن کا خاصا تھا کہ وہ نہایت اہتمام سے اور دھیرج سے سلوموشن میں کیس میں سے کیمرہ نکالتے پھر تادیر روشنی، دھوپ اور سائے کا اندازہ لگاتے..ایپرچر، سپیڈ اور پتہ نہیں کیا کیا سیٹ کرتے اور پھر ایک عجیب سازاویہ بنا کر بہت سوچ سمجھ کر کیمرے کا بٹن دباتے..جیسے داد طلب کر رہے ہوں کہ بچّو آج تک کبھی کسی نے تمہاری ایسی نایاب تصویر اُتاری ہے..اس احتیاط اور اہتمام کا نتیجہ یہ نکلا..کہ لاہور واپسی پر جب انہوں نے اپنی آٹھ فلمیں پرنٹ کروائیں تو تصویروں میں ہر جانب تاریکی ہی تاریکی تھی..کچھ سائے تھے..کچھ ہیولے تھے اور یا پھر ان کی احتیاط تھی..

حسن کا کیمرہ ملتز پھورا ٹریک کے دوران ایک ندی میں منہ کے بل گر گیا تھا..وہ ذاتی طور پر خود ہی تو نہیں گر گیا تھا، اس کے ساتھ حسن صاحب تھے، اس لیے اب وہ ایک نیا نکور کیمرہ نمائش کرتے پھرتے تھے جو انہوں نے اپنی بیگم کی معاونت سے خریدا تھا اور اس کے نتائج بعد میں حوصلہ افزا برآمد ہوئے..

اور سلمان اس زعم میں تھا کہ جناب یہ کیمرہ تو آسٹریلیا سے آیا ہے..یہ بری تصویر کھینچ ہی نہیں سکتا..

صرف میں اپنے محبوب اشائی پنٹکس کے بغیر تھا..

میں منظروں کو فلم پر نہیں اپنے بدن پر کھینچتا چلا جاتا تھا..

آج ہمیں درہ گندوگورو کے بیس کیمپ تک پہنچنا تھا اور پھر اس کی چوٹی پر یلغار کرنا تھی..خیمے زمین بوس ہونے لگے..

''آج کا سفر کیسا ہے؟'' میں نے حسب عادت اور روایت اسحاق سے پوچھا..

''ادھر نکلے گا تو سامنے تھوڑا چڑھائی ہے..پھر گلیشیئر پر اتر جائے گا..آسان ہے..''

''گلیشیئر پتھریلا ہے؟''

''ہاں ناں..''

''سفید ہے یا سیاہ ہے؟''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے صاحب!''

''بہت فرق پڑتا ہے اسحاق..سیاہ گلیشیئر مادہ کہلاتا ہے اور سفید کو نر کہا جاتا ہے تو میں سیاہ گلیشیئر پر چلنے کی پریکٹس رکھتا ہوں..''

''تھوڑا سیاہ ہے اور تھوڑا سفید ہے..''

''اور آج ہم کہاں پہنچیں گے؟''

''گندوگورو کے بیس کیمپ میں..''

''اور اس بیس کیمپ کا نام کیا ہے؟''

اسحاق نے ایک عجیب و غریب ہسپانوی قسم کا نام لیا..

میں پہلے بھی اقرار کر چکا ہوں کہ اس ٹریک کی منزلوں کے نام بہت الگ تھے اور مجھے یاد نہیں ہوتے تھے..مشکل سے شائی چُو اور دل سنگ پایاد کیا تھا اور اب یہ پھر آ گیا تھا..چنانچہ میں نے محض سر ہلا دیا کہ نام میں کیا رکھا ہے..

ہمارے خیمے سمیٹے جا رہے تھے..

میں اپنی میٹرس پر بیٹھا اپنے نئے ہائی ٹیک بُوٹوں کے تسمے باندھ رہا تھا اور مجھے بے حد لطف آ رہا تھا..میں خوش تھا..

جی ہاں ایک کوہ نورد کی خوشیاں بہت الگ ہوتی ہیں..

ایک کوہ نورد کے لیے یہ بھی ایک خوشی ہوتی ہے..ایسے نئے نکور ہائکنگ بوٹ پہننا جو آپ کے پاؤں کو پسند کر لیں اور پھر ان کے تسمے اور وہ بھی نئے نکور..کس کر یوں باندھنا کہ آپ کے پاؤں ان میں محفوظ محسوس کریں..یوں کہہ لیجیے کہ ایسے تسموں کو باندھنے میں وہی سنسنی محسوس ہوتی ہے جو ایک رقاصہ نئے گھنگھرو باندھتے ہوئے محسوس کرتی ہے..گویا رقص کوہ نوردی سے پیشتر بوٹوں کے تسمے ہمارے گھنگھرو ہوتے ہیں..

یہ نئے بوٹ پہننے کے بعد میں نے جامنی رنگ کی نارتھ فیس جیکٹ پہنی تو یہ ایک اور نئی ایکسائٹمنٹ تھی..

جامنی رنگ کی نارتھ فیس جیکٹ..

یہ خپلو سے آئی تھی..

کیسے آئی تھی، اس کا ذکر کرنا میں بھول گیا تھا..

یہ میں نے ایک نگتی سردار سے حاصل کی تھی..

خپلو کے بازار میں یہ عامر تھا جس نے وہاں ایک ایسی دکان دریافت کر لی تھی جس کے کاؤنٹر کے پیچھے ایک بگتی کھڑا تھا... ہمارے لیے یہ نہایت اچنبھے کی بات تھی کہ آخر بلوچستان سے چل کر بلتستان میں آ کر ایک بگتی پرانے جوتے.. کپڑے.. لالٹینیں اور ٹائلٹ پیپر کے رول وغیرہ کیسے بیچ رہا ہے.. بہر حال ان بگتی صاحب کے ہاں کسی غیر ملکی مہم کے گوروں کے بدنوں کی اُترن کچھ نہایت شاندار جیکٹیں اور ونڈ چیز بے تھے اور تھے بھی نارتھ فیس برانڈ کے جو کوہ نوردی کا سامان بنانے والی نہایت معتبر اور معروف فرم ہے.. ہم نے پہلے یہ طے کر لیا تھا کہ واپسی پر یہ کسی کو نہیں بتائیں گے کہ ہم یہ جیکٹیں خپلو کے لنڈے بازار سے خرید کر لائے ہیں تاکہ عزت سادات اگر تھی تو محفوظ رہے.. اور یقین جانئے کہ یہ راز آج تک ایک راز ہے.. بہر حال جیکٹیں وغیرہ خریدنے کے بعد.. اگرچہ یہ سائز میں اتنی بڑی تھیں کہ ہم انہیں پہن کر مست ملنگ لگتے تھے اور دور سے پہچانے جاتے تھے کہ ان لوگوں نے دراز قد گورا لوگوں کی اُترن زیب تن کر رکھی ہے.. لیکن ہم ان کے رنگ اور ڈیزائن سے اتنے مبہوت ہو چکے تھے کہ رہ نہ سکے.. تو انہیں خریدنے کے بعد ہم نے بگتی صاحب سے دریافت کیا کہ سائیں آپ خپلو کب اور کیسے تشریف لائے.. تو انہوں نے پُرتبسم ہو کر فرمایا کہ صاحب ہم تو پیدا ہی اِدھر ہوا ہے...

اس پر ٹیم کے پہلے بلوچ ممبر برمانی نے بے پایاں مسرت کا اظہار کیا کہ یہ تو ایک نئی تحقیق کا در کھل گیا ہے کہ وادی خپلو میں بھی بلوچ اور بگتی پائے جاتے ہیں.. لیکن برمانی کی یہ بے پایاں مسرت پایاں ہو گئی جب اُن صاحب دکان نے بڑے فخر سے بتایا کہ صاحب ہم تو خالص بلتی ہیں.. لیکن قصہ کچھ یوں ہے کہ میرے والد صاحب قبلہ نہایت رعب دار شخصیت کے مالک تھے.. سیاہ چشمہ پہنتے تھے اور بڑی بڑی مونچھیں رکھتے تھے تو اہل خپلو انہیں چھیڑتے تھے کہ تم تو بگتی لگتے ہو.. چنانچہ وہ بگتی ہو گئے.. اور وہ ہو گئے تو ہم بھی ہو گئے.. اب ہمارا چھوٹا بچہ لوگ بھی بگتی ہے...

تو بگتی بھائی سے خرید کردہ جامنی رنگ کی.. اپنے سائز سے کہیں بڑی نارتھ فیس کی جیکٹ پہنے.. قدرے پُھدّا لگتا ہوا میں اپنی میٹرس پر بیٹھا تھا کہ عامر بھی ایک ایسی ہی جامنی جیکٹ میں لہراتا ہوا میرے پاس آ گیا۔ ''تارڑ صاحب.. ایک مسئلہ ہے.. آپ کو معلوم ہے کہ حسن صاحب کچھ ٹھیک نہیں ہیں.. کل شام تو اُن کا چہرہ سُوجا ہوا بھی لگتا تھا اور انہیں بخار بھی تھا.. اور یہ بلندی کی بیماری کے آثار لگتے ہیں۔ آج ہم مزید پونے دو ہزار فٹ اوپر جائیں گے.. تو کیا انہیں

سارا دن چلانا.. گلیشیئر پر.. اور انہیں اتنی بلندی تک لے جانا.. پندرہ ہزار فٹ کی بلندی تک.. لے جانا مناسب ہو گا.. کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔''

پچھلی شب میں نے بہت دیر حسن کے بارے میں فکرمندی کی تھی.. واقعی اس کی حالت کچھ غیر سی ہوئی جاتی تھی لیکن وہ ایک بہادر شخص تھا.. معصومیت سے مسکراتا چلا جاتا تھا اور پوچھنے پر کہتا تھا.. جی آپ فکر نہ کریں..

''تو پھر کیا کریں عامر..''

''میرا خیال ہے کہ اس حالت میں انہیں سارا دن چلانا اور اتنی بلندی تک لے جانا خطرناک ہے.. راستے میں یا وہاں پہنچ کر ان کی طبیعت مزید خراب ہو گئی تو کیا کریں گے.. بہتر یہی ہے کہ انہیں یہیں دل سنگ پا میں چھوڑ جائیں.. کسی پورٹر کے ساتھ یا ہم میں سے کوئی ایک ٹھہر جائے.. کل شام تک کی تو بات ہے.. ہم واپس آ جائیں گے..''

کسی بھی ٹریک کے دوران چھوٹے موٹے سانحے تو ہوتے رہتے تھے لیکن کبھی اس قسم کی صورت حال کا سامنا نہیں ہوا تھا..

یوں تو ٹیم کے بھی ممبران ہمیں پیارے تھے لیکن حسن صاحب تو نہ صرف ہمیں پیارے تھے بلکہ راج دُلارے تھے اور ہم ان کے بھولپن کا خاص خیال رکھتے تھے..

''ایسا کرتے ہیں کہ برمانی سے مشورہ کرتے ہیں.. وہ انہیں میڈیسن بھی دیتا آیا ہے.. تو وہ بہتر طور پر فیصلہ کر سکتا ہے کہ حسن صاحب سفر کے قابل ہیں یا نہیں.. اگر نہیں تو انہیں یہاں چھوڑ کر نہیں جائیں گے.. ہم سب یہیں ٹھہر جائیں گے.. آگے جا کر ایک ایسے مقام پر حسن صاحب کے بغیر جا کر کیا کرنا ہے جس کا نام بھی ہمیں معلوم نہیں.. آج کا دن یہیں ریسٹ کریں گے اور پھر واپس..''

برمانی کو طلب کیا گیا.. وہ دل سنگ پا کی جھیل کے کناروں پر ڈُبکی لگا رہا تھا اور بے چین تھا کہ کب سفر کا آغاز ہو اور وہ قلانچیں بھرتا وہ سامنے والی بلندی پر چڑھ جائے اور وہاں سے ہمیں ہاتھ ہلا کر SEE YOU کہہ کر غائب ہو جائے..

''ہاں.. کل شام تو حسن صاحب کا چہرہ قدرے سُوجا ہوا تھا.. ہلکا بخار بھی تھا.. موشن بھی آ رہے تھے لیکن میں نے ابھی ابھی ان کا چیک اپ کیا ہے.. وہ بہت بہتر ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ آہستہ آہستہ چل سکتے ہیں، کوئی خطرہ نہیں۔''

"آر یو شیور.."

"بالکل.. لیکن حسن صاحب سے بھی پوچھ لیا جائے تو بہتر ہے۔"

حسن صاحب سے پوچھا گیا..

"نہیں جی.." حسن صاحب شرماتے ہوئے بولے "آج تو اللہ کا فضل ہے.. پاٹیاں بھی بند ہو گئی ہیں.. بخار بھی نہیں.. تھوڑی سی کمزوری ہے تو میں آہستہ آہستہ چلوں گا.."

اُن کے اس بیان پر اگر تو میں احتیاط پسند ہوتا اور بے حد ایماندار ہوتا تو یہی کہتا کہ.. نہیں حسن صاحب.. ہم یہ رسک ہرگز نہیں لے سکتے۔ زندگی موت کا معاملہ ہے، ہم سب یہیں ٹھہریں گے اور کل واپس.. لیکن میں نے تھوڑی سی بے ایمانی کی.. کہ میں جسے انگریزی میں کہا جاتا ہے کہ ان مائی ہارٹ آف ہارٹس.. یعنی اپنے دلوں کے دل میں یہی چاہتا تھا کہ ہم بہر صورت گندو گورو بیس کیمپ تک جائیں.. اس لیے میں نے کہا.. کہ بس جی فیصلہ ہو گیا.. ٹیم ڈاکٹر نے بھی اوکے کر دیا ہے اور حسن بھی معترض نہیں تو انشاء جی اب کوچ کرو..

بہر حال ایک شرط تھی.. کہ برمانی چولستانی ہرن ہو جانے سے باز آ جائے اور حسن صاحب کے ہمراہ رہے.. ان کی نبض چیک کرتا رہے.. گولیاں کھلاتا رہے..

دل سنگ پا کو چھوڑتے ہوئے مجھے اُس پر بڑا ترس آیا..

کیونکہ وہ ہماری روانگی سے ویران ہو گئی تھی.. بیوہ ہو گئی تھی..

یہ شائی چُوکی خیمہ گاہ نہ تھی جسے ہماری روانگی سے کچھ فرق نہ پڑا تھا اور وہاں جو میلہ لگا ہوا تھا، اُسے احساس بھی نہیں ہوا تھا، کچھ میلہ گھومنے والے آئے تھے اور چلے گئے..

دل سنگ پا کو بہت فرق پڑا تھا..

اُس کی جھیل کے پانی پژمردہ ہو گئے تھے اور اُس کے آس پاس جو ورجنوں گلیشیر اُترتے تھے اور مشابرم کی برفیں.. سب کے سب بے وقار ہو گئے تھے..

کیونکہ کوئی بھی چہرہ یا منظر تبھی باوقار ہوتا ہے جب اسے دیکھنے والے ہوں.. دیکھنے والے ہی نہ رہیں تو وہ چہرے اور منظر کسی کام کے نہیں رہتے.. بیکار اور تہبارہ جاتے ہیں..

ہم دل سنگ پا کو بیکار کر کے.. اس کی تنہائی میں سے نکل کر ایک بلند کنارے پر پہنچے اور ایک پگڈنڈی پر چلنے لگے..

"برف کے صحراؤں میں بھٹکتی ایک لیلیٰ.."

دائیں ہاتھ پر وہی گندوگلیشیر ہمارا ساتھ دیتا تھا اور اس میں بہت سے برفانی وجود اُتر رہے تھے..

یہاں بھی گلیشیر کے دامن میں ہریاول پھول اور ندیاں رخصت ہو چکے تھے.. اُن میں چلتے ہوئے ایک مرتبہ پھر احساس ہوا کہ ہم دیر سے آئے تھے.. ہمیں پچھلے ماہ ادھر سے گزرنا چاہیے تھا..

حسبِ معمول سامنے سے غیر ملکی کوہ نوردوں کے ریوڑ اُتر رہے تھے.. دندناتے ہوئے اُتر رہے تھے اور ہم ان کے گزرنے کے لیے جگہ بناتے تھے..

پتہ نہیں یہ کافر کے بچے آج صبح کتنے بجے گندوگورو کے بیس کیمپ سے چلے تھے کہ ہم نے ابھی اپنے سفر کا آغاز کیا تھا اور یہ دل سنگ پا کی قربت میں پہنچ رہے تھے..

کنارا جس پر ہم چلتے تھے.. ذرا اونچا ہوا.. کچھ پتھریلا ہوا اور پھر یکدم یہ اختتام پذیر ہو گیا اور آگے گندوگورو راستہ روکے کھڑا تھا..

ہمیں بہر طور نیچے اُتر کر گلیشیر پر چلنا تھا..

نہایت احتیاط سے اُترتے ہوئے گلیشیر تک پہنچنا تھا.. جو ہم پہنچ گئے..

نیچے ہر گلیشیر کے شروع میں ہمیشہ بڑے بڑے پتھروں کا ایک سلسلہ ہوتا ہے.. اور پھر دراڑیں ہوتی ہیں.. ان پتھروں پر آپ کو بہت دیکھ بھال کر قدم رکھنے ہوتے ہیں.. ان پر آپ چہل قدمی نہیں کرتے.. چلتے نہیں بلکہ چھوٹی چھلانگیں لگا کر آگے جاتے ہیں.. ایک چٹان پر سے کود کر دوسری کو پہلے سے جانچتے ہیں کہ اس پر قدم کہاں پڑنا چاہیے اور ان دونوں چٹانوں کے درمیان جو

خلاء ہے۔اس میں اگر لینڈ کریں گے تو ٹانگ خلاء میں جائے گی اور ٹوٹ جائے گی..بس اتنا خیال رکھنا پڑتا ہے..

اور یہ بھی خیال رکھنا پڑتا ہے کہ اگلا قدم جس پتھر پر رکھنا ہے تو وہ پتھری ہے ناں..کہیں بجری سے ڈھکی ہوئی سخت برف تو نہیں جس پر قدرے بے احتیاطی سے پڑنے والا بوٹ یوں پھسلتا ہے کہ آپ ایک مختصری قلابازی کے بعد بھی اٹھ بیٹھتے ہیں،ہائے ہائے کرتے ہیں اور کبھی نہیں بھی اُٹھتے اور آپ کے ساتھی ہائے ہائے کرتے ہیں کہ ہائے ہائے عجب آزاد مرد تھا..

کنارے کے ان پتھروں پر چلتے چلتے ہم گلیشیئر کے درمیان میں پہنچ گئے جو سیاہ رنگ کا تھا اور یعنی مادہ تھا اور اس پر چلنا آسان تھا..اس کی دراڑوں کی شکلیں بھی ایسی تھیں کہ دور سے پتہ چلتا تھا کہ یہ مادہ ہی ہے..

ہم اس گندو گورو گلیشیئر سے زیادہ متاثر نہ ہوئے یعنی ہم میں سے جو سنولیک کے سفر کے دوران دنیا کے طویل ترین گلیشیئر پر قدم رنجہ فرما چکے تھے،اگر ہم نے ان قدم رنجوں کے دوران رنج بھی بہت اٹھائے تھے..ان کے مقابلے میں تو یہ ایک بچہ گلیشیئر تھا،لیکن احتیاط پھر بھی لازم تھی..

یہیں پر گندو گورو پر چلتے ہوئے دائیں جانب لیلے نے پہلی بار اپنے وجود کی سفید عریانی کو ہم پر ظاہر کیا..

وہ پہلے تو وہاں نہیں تھی..

شائد اس نے ابھی ابھی میری پسلی سے ایک اماں حوا کی طرح جنم لیا تھا اور دائیں ہاتھ پر بلند ہوگئی تھی..

اس صحرائے برف میں جھلکتی ہوئی اچانک کہیں سے آ نکلی تھی..

متعدد برفانی بلندیوں میں سے قد نکالتی ہوئی..چھریرے بدن کی ترچھی تکون کی صورت اختی لیلے..جس کی چوٹی اُس تکون کی ایک ایسی نوک تھی جس پر کوئی دودھ پیتا مجنوں تو نہیں جا سکتا تھا..

ہمارے کوہستانی سفر کے دوران کے سکس۔کے سیون اور مشابرم ہم پر ظاہر ہوئیں۔ ہم اُن سے مرعوب بھی ہوئے اور مسحور بھی لیکن وہ محض برف تھیں۔چٹانیں تھیں لیکن لیلے..گوشت پوست کی بنی لگتی تھی..بدن ابھاروں اور گرم جذبوں سے سلگتی چوٹی لگتی تھی..زندہ لگتی تھی..یہ ایسی لیلے تھی..

میں چلا تو گلیشیئر پر تھا لیکن گردن ٹیڑھی کر کے دائیں جانب بس اسے مسلسل دیکھتا جاتا تھا اور اگر یہ کوئی نامراد گلیشیئر ہوتا تو میں کب کا بے دھیانی میں کسی دراڑ میں گر چکا ہوتا..

مجھے خدشہ ہوا کہ مسلسل اس کی جانب دیکھتے دیکھتے میری گردن میں بل آ جائے گا۔ اس لیے میں نے اپنا دھیان سامنے کیا جہاں برمانی تھا..اس لمحے حسن کا ہاتھ تھامے شائد اس کی نبض چیک کرتا چلا جا رہا تھا..

"برمانی.."

"جی.."

"یار یہ کیسی لیلے ہے؟"

"جی؟" برمانی بھی شائد شاہد صاحب کی مانند ذرا اونچا سنتا تھا۔اس لیے یکدم سوال کرنے پر ہمیشہ چونک جاتا تھا اور ایک لمبی "جی ای ای" کرتا تھا..

"میں اس پیک کی بات کر رہا ہوں..لیلے پیک..کیا چوٹی ہے..لیلے برمانی۔"

"سبحان اللہ سائیں آپ نے جو اس چوٹی کو لیلے برمانی کہا ہے تو میرا دل موہ لیا ہے۔"

میں کچھ پزل سا ہو گیا.."کیا مطلب؟"

"لیلے کے نام کے ساتھ ہمارا نام برمانی لگا کر بولے ہو جیسے یہ ہماری منکوحہ ہو تو ہمارا دل خوش ہو گیا ہے سائیں.."

برمانی میری نظروں میں کچھ مشکوک ہو گیا۔"بھئی..یہ تو..لگتا ہے کہ ابھی ابھی یہاں ایک خلاء تھا اور یکدم یہ وجود میں آ گئی ہے..اب دکھائی دی ہے۔"

"سائیں آپ تخت لہور کے باشندے ہو،شہر کے شور اور میدانوں کے باسی ہو تو آپ کو یہ اب دکھائی دی ہے..ہم صحرا کے مکینوں کو تو یہ ایک مدت سے دکھائی دے رہی ہے۔"

"برمانی تم براہ کرم ایک مرتبہ فیصلہ کر لو کہ تم ہو کیا؟..کبھی تم سرائیکی بولنے لگتے ہو..کبھی تم بلوچ ہونے کا دعویٰ کرتے ہو..کبھی کوہ سلیمان سے رشتہ جوڑ کر مرد کوہستان ہو جاتے ہو اور کبھی صحرا کا باسی ہونے کا دعویٰ کرتے ہو..اور اس کے ساتھ سندھ سائیں کے پجاری ہونے پر بھی فخر کرتے ہو..تو تم ہو کیا؟"

"سائیں آپ کے اور ہمارے بُلھے شاہ نے کہا تھا کہ کی جاناں میں کون اوبلھیا..کی جاناں میں کون.."

"یار اتنی بلندی پر تو اس مجلسی دانشوری کی مار نہ دو.."

"نہیں سائیں توبہ توبہ، دانشوری کا دعویٰ کس بدبخت کو ہے لیکن سچ کہتا ہوں کہ میں ابھی تک واقعی یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ میں کون ہوں.. کبھی مجھے اذان سنائی دیتی ہے اور کبھی تخی سرور کے مزار کے باہر وہ مقام بلاتا ہے جہاں شو لنگ ہوا کرتا تھا اور کبھی میں کالاش کافروں کے قبیلے میں شامل ہو جاتا ہوں تو مجھے نہ پوچھئے کہ میں کون ہوں.. لیکن میں جو کوئی بھی ہوں، اس لیلے کے عشق میں فنا ہو چکا ہوں۔"

"جانے دو برمانی.."

"سچ کہتا ہوں سائیں.."

"تمہارا کیا ہے برمانی.. تم تو نانگا پربت کے سامنے جو لالی پیکٹ پیک ہے اس پر بھی لٹو ہو گئے تھے اور وہ تمہیں خواب میں ایک سفید لباس میں ملبوس دولہن کی صورت میں جلوے دکھاتی تھی.. تمہارا کیا ہے تم تو سفید گھوڑیوں کے وصل کی خواہش میں بھی گم رہتے ہو۔"

"سچ کہتا ہوں سائیں.." اور وہ حسن کو سہارا دیتا آگے بڑھ گیا..

برمانی ہم سب سے ایک الگ طبیعت ایک الگ طبع کا شخص تھا..

ہم سب اگرچہ خصلتیں مختلف رکھتے تھے لیکن ہمارا سانچہ ایک ہی تھا.. ہمارے عقیدے، اخلاقیات اور سوچ تقریباً ایک ہی سانچے میں ڈھلتے تھے لیکن برمانی ہم سے الگ کسی اور ہی سانچے سے وجود میں آیا تھا.. میں نے اس کے لیے "طبع" کا لفظ وارث شاہ سے مستعار لیا ہے کہ.. طبع ہالی وی حرص تمہیں نہ باز آئی.. تو برمانی کی یہ طبع ہم سے بہت مختلف تھی.. بے حد حریص تھی جو برفانی چوٹیوں اور سفید گھوڑیوں کے وصال کی خواہش کرتی تھی..

ویسے تو مجھ پر بھی برف بلندیاں، جھیلیں اور جنگل کچھ الگ انداز میں اثر کرتے تھے.. جیسے وہ زندہ ہوں.. ان کے بدنوں میں بہاؤ میں حرارت اور زندگی ہو.. چاہے وہ شاہ گوری ہو جس کی سفیدی پر بوسوں سے نیل پڑتے تھے یا جھیل کرومبر ہو جس کے پانیوں میں اُترتے ہوئے میں ان کی تہہ کو چھوتا تھا تو وہ آہ بھرتے تھے.. یا فیری میڈو کے جنگل ہوں جن کا ہر شجر.. چاہے وہ سر بلند اور زندہ ہو اور چاہے برسوں سے زمین بوس ہو چکا ہو، مجھے آغوش میں لینے کے لیے بے قرار ہو..

کچھ اسی طور یہ لیلے تھی..

یہ تکون آسمان میں چھید کرتی ہوئی.. قدرے ترچھی ایک ایسی ہی چوٹی تھی جو دل میں جگہ بناتی دل کش ہوتی بدن میں اُترتی تھی..

میں جب تک گندوگورو گلیشیر پر چلتا رہا.. ایک نظر سامنے ڈالتا اور دوسری نظر اٹھاتا اور لیلے پیک پر رکھ دیتا..

جس زاویے سے وہ مجھے نظر آ رہی تھی وہاں سے اس کی ترچھی تکون چڑھائی ایسی تھی کہ اس پر کسی کوہ پیما کے قدم تو کیا کسی پرندے کے پنجے بھی ٹھہر نہ سکتے تھے..

اس کا چٹانی برفانی وجود آسمان سے اپنی نوک چبھوتا ہم سے بہت غافل اور الگ تھلگ تھا اور ہم خواہ مخواہ اس کے عشق میں مبتلا اس میں اپنی اپنی لیلاؤں کو دیکھتے تھے.. خیر ہو تیری لیلاؤں کی.. آج کی شب جب دیئے جلائیں اونچی رکھیں لو..

"میں لیلے کے عشق میں..گھوڑا ہو گیا"

تنہا اور الگ صرف لیلے تھی..گندوگورو گلیشیئر نہ تھا..یہ مال روڈ بنا ہوا تھا..

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کے ٹو جانے والے جتنے بھی کوہ نورد تھے، وہ الٹے پاؤں اشکولے جانے کی بجائے درہ گندوگورو پار کر کے اب ادھر اُترتے تھے اور شائی چو کے راستے ہوشے کو منزل بناتے تھے..

ایک ایسی ہی غیر ملکی مہم کے چند افراد بھٹکتے ہوئے سامنے سے چلے آ رہے تھے..اُن کا پاکستانی گائیڈ ان بھیڑوں کو راستہ دکھاتا ہوا میری طرف بڑھ رہا تھا..میرے قریب آیا تو ایک نظر مجھ پر ڈالی..اور نہایت رکھائی سے کہا" تارڑ صاحب ہیں ناں؟"

"جی.."

"پھر آ گئے ہو.."

میں رُک گیا کہ اس شخص نے مجھے پہچان لیا ہے تو اب کچھ گپ شپ کرے گا لیکن پتہ نہیں کون نامعقول شخص تھا کہ وہ رُکا نہیں..بس یہ کہہ کر کہ "پھر آ گئے ہو" چلتا گیا..میں نے پیچھے مڑ کر بھی دیکھا لیکن وہ رُکے بغیر چلتا جا رہا تھا..

اس "پھر آ گئے ہو" میں کچھ حیرت تھی اور بہت سی تضحیک..

میں ابھی اس "پھر آ گئے ہو" کے شاک میں تھا جب گلیشیئر پر اُترتا ایک اور غیر ملکی گروپ نمودار ہو گیا..

میں نے پہلے بھی اپنی اس حیرت کا اظہار کیا تھا کہ نامعلوم وجوہات کی بنا پر ان علاقوں میں اس برس بیشتر کوہ نورد ہسپانیہ سے تعلق رکھتے تھے..اور یہ گروپ بھی ہسپانوی تھا اور حسبِ معمول

ان کو راہ دکھانے والا ایک پاکستانی گائیڈ تھا..اور یاد رہے کہ آج میں گھوڑا ہو چکا تھا..

کیسے ہو چکا تھا اس کا احوال اس ہسپانوی گروپ کے گزر جانے کے بعد آپ کی خدمت میں عرض کروں گا..

تو حسب معمول یہ پاکستانی گائیڈ جو ان ہسپانوی سیاحوں کو راہ دکھا رہا تھا میرے قریب آیا..گلیشیئر پر چلنے کے لیے ایک مخصوص راستہ یا پگڈنڈی ہوتی ہے اور آپ اُس سے انحراف نہیں کرتے کیونکہ آس پاس کھائیاں اور دراڑیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ ہر کوئی ایک ہی راستے پر چلتا ہے اور جو کوئی بھی سامنے سے آئے گا، تو اس سے آپ کی ملاقات بہر طور ہوتی جائے گی..

یہ پاکستانی گائیڈ اپنی غیر ملکی بھیڑوں کو ہانکتا میرے قریب آیا تو..نور حیات تھا..میں ایک قدرے غیر معروف گلیشیئر پر اپنی بھیڑوں کو ہانکتے ہوئے ایک گائیڈ کو کیسے جانتا تھا؟ وہ 1990ء میں کے ٹو پر جانے والی امریکی مہم کے رابطہ افسر کیپٹن مبشر حسین تارڑ کا ساتھی اور پورٹر تھا..

جو برالدو دڑے کی ایک تنگی اور بلند چٹان پر ہانپتے پیاسے مبشر کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈال کر کہیں نیچے دریا تک لڑھکتا ہوا گیا تھا اور اس کے لیے پانی لے کر آیا تھا..

اور پھر "کے ٹو کہانی" کے زمانے میں وہ کنکورڈیا کے راستے میں مجھے مل گیا تھا اور اس نے مجھے نہایت اعلیٰ ذائقے کا پلاؤ کھلایا تھا..

یہ وہی نور حیات تھا..

وہ جو انگریزی میں کہتے ہیں ناں کہ..اِٹس اے سمال ورلڈ..تو واقعی یہ ایک چھوٹی سی دنیا تھی..پاکستانی شمال کی چھوٹی سی دنیا تھی..جس میں آشنا اور دوست چہرے کہیں نہ کہیں آمنے سامنے آ جاتے تھے..نور حیات کے نتھنے اب بھی پھڑکتے تھے اور وہ بھی زمانے کے گزرنے کے نشان اپنے چہرے پر لکیروں کی صورت رکھتا تھا..

مجھے دیکھ کر اس کے سفید..خوش شکل چہرے پر ایک زبردست حیرت اور مسرت کی مسکراہٹ پھیل گئی..اس نے میرا حال احوال پوچھا..مبشر کے بارے میں استفسار کیا اور پھر پوچھا کہ صاحب کدھر سے آ رہے ہو اور کدھر جا رہے ہو؟..اور ابھی تک اس عمر میں بھی آ جا رہے ہو..

پھر اپنے گروپ کے کوہ نوردوں کے ساتھ میرا تعارف کروایا..

میں نے نوٹ کیا کہ مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے یہ ہسپانوی خواتین و حضرات کچھ عجیب انداز میں مسکراتے تھے..ایسے مسکراتے تھے جیسے میں ان کے سامنے نہ ہوں چارلی چپلن ہوں، اپنے

چھاتے.. ڈھیلی پتلون اور پھڑکتی ہوئی مونچھوں کے ساتھ..

''نور حیات یہ حضرات مجھ سے مل کر کچھ ضرورت سے زیادہ خوش ہو رہے ہیں اور بے وجہ مسکرا رہے ہیں تو کیوں..''

نور حیات قدرے پریشان اور پشیمان ہو گیا اور اپنی پھڑکتی ہوئی ناک کھجا کر کہنے لگا

''صاحب ایک چھوٹی سی بدتمیزی ہو گئی ہے..''

''کیسی بدتمیزی؟''

''دراصل ہم لوگ.. گائیڈ لوگ.. جب بھی غیر ملکی کوہ نوردوں کو لے کر پہاڑوں اور گلیشیئرز میں جاتے ہیں تو ہمیشہ ایک ہی سوال پوچھا جاتا ہے کہ تمہارا شمال اتنا یونیک اور زبردست ہے اور یہاں صرف غیر ملکی آتے ہیں، تمہارے ملک کے باشندے کیوں نہیں آتے.. آپ کے نمودار ہونے سے چند لمحے پہلے یہی سوال پھر اٹھایا گیا تھا کہ ہم نے پورے ٹریک کے دوران کوئی پاکستانی کوہ نورد نہیں دیکھا.. اور تب آپ نظر آ گئے.. آپ کے ساتھی دکھائی دینے لگے.. آپ دور سے پہچانے تو نہیں جا رہے تھے لیکن آپ کی بے ڈھنگی چال سے اندازہ ہوتا تھا کہ جو بھی یہ شخص ہے سخت مشکل میں ہے اور پاکستانی ہے.. تو میں نے نہایت فخر سے اعلان کیا کہ سینور.. سینوریتا.. آپ شکایت کر رہے تھے کہ ان پہاڑوں میں کوئی پاکستانی نہیں آتا تو لیجیے سامنے سے ایک پاکستانی آ رہا ہے اور اس کا نام تارڑ ہے.. کتابیں لکھتا ہے اور ٹیلی ویژن پر میزبانی کرتا ہے.. تو انہوں نے دریافت کیا کہ اتنی دور سے صرف ایک جامنی رنگ کی جیکٹ نظر آ رہی ہے تو تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ وہی شخص ہے جس کا تم نام لے رہے ہو.. تو میں نے وہی چھوٹی سی بدتمیزی کی اور کہا.. پاکستان میں صرف ایک ہی تنہا پاگل شخص ہے تو وہی ہو سکتا ہے.. ہم قریب آئے تو آپ.. میرا مطلب ہے کہ وہ وہی تھا.. اس لیے آپ سے ہاتھ ملاتے ہوئے یہ لوگ مسکرا رہے تھے..''

''تھینک یو.. نور حیات.. عجیب سا کومپلی منٹ دیا ہے تم نے.. لیکن تھینک یو..'' میں نے نورے اور اس کے ساتھی کوہ نوردوں سے باری باری ہاتھ ملایا اور آگے بڑھ گیا۔

شمال بہت بڑا ہے.. ایک کائنات ہے.. اور اس کائنات میں میری حیثیت ایک ذرے سے بھی کم ہے.. لیکن.. پچھلے بیس برس سے ہمیشہ یہ ہوتا چلا آیا ہے کہ میں بے شک ''یاک سرائے'' کی وادی سوخترآباد میں خیمہ زن ہوں یا ''سنولیک'' کی برفوں میں کسی برفانی پل صراط پر چلتا ہوں تو

پورے شمال کو خبر ہو جاتی ہے کہ میں اس برس کہاں دیکھا گیا ہوں..

دیوسائی ٹریک کے دوران جب مجھے بتایا گیا کہ پورے دیوسائی میں صرف بیس بائیس ریچھ ہیں تو مجھے یقین نہ آیا کیونکہ موسم گرما میں پورے سکردو میں ریچھوں کی دھوم ہوتی تھی.. ہر دوسرا شخص گواہی دیتا تھا کہ دیوسائی پر تو اتنے ریچھ ہیں کہ ان کو چلنے پھرنے میں بھی دشواری پیش آتی ہے.. یا تو ہر ایک نے ریچھ دیکھا ہوتا تھا اور یا پھر اسے بتایا گیا ہوتا تھا کہ جناب میں نے خود دیکھا ہے.. چنانچہ مجھے یقین نہ آیا کہ دیوسائی پر صرف بیس بائیس ریچھ رہائش پذیر ہیں.. پھر جنگلی حیات کے رفیق راجپوت نے یہ مسئلہ حل کر دیا..

''تارڑ صاحب دیکھیں.. اگر روزانہ بیس یا پچیس جیپیں دیوسائی سے نیچے سکردو میں اترتی ہیں اور کسی روز کوئی ایک ریچھ روڈ کے آس پاس ٹہلتا نظر آ جاتا ہے تو گویا پچیس جیپوں میں سوار تقریباً دو سو افراد نے اس ایک ریچھ کو دیکھا.. اب وہ دو سو افراد اپنے دو ہزار جاننے والوں کو بتاتے ہیں کہ ہم نے خود دیوسائی پر ریچھ دیکھے ہیں.. اور وہ دو ہزار افراد مزید لوگوں کو یہی کہانی سناتے ہیں اور یوں ریچھ صرف ایک ہوتا ہے لیکن تاثر یہ ابھرتا ہے کہ جانے والے وہاں ہزار ریچھ ہیں..''

شمال میں میری موجودگی کی دھوم بھی اسی کلیے کے مطابق ہوتی تھی..

تارڑ صاحب ایک ہوتا تھا اور..

اور ہاں اب وہ قصہ کہ میں اس روز گھوڑا ہو گیا تھا..

یہ نہایت یونیک تھیسس ڈاکٹر عمر نے ''کے ٹو کہانی'' کے دوران پیش کیا تھا..

یعنی.. کوہ نورد کا پہلا دن جب وہ اپنی جیپ سے بچھڑ کر ان ویرانوں میں قدم رکھتا ہے جہاں صرف قدم ہی جاتے ہیں تو وہ دن پُرمشقت اور اذیت والا ہوتا ہے.. اس کی بے بسی اور تھکاوٹ عروج پر ہوتی ہے.. پھر دوسرا دن آتا ہے تو وہ ذرا بہتر چلنے لگتا ہے.. اگرچہ نڈھال ہوتا ہے اور پاؤں میں چھالے ابھرتے ہیں اور رانوں میں خراشیں ہوتی ہیں لیکن وہ گرتا پڑتا اپنی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔

لیکن تیسرے دن وہ گھوڑا ہو جاتا ہے..

اور واقعی کے ٹو ٹریک کے تیسرے دن میں گھوڑا ہو گیا تھا..

شائد اس میں ڈاکٹر عمر کی عطا کردہ ان وٹامن گولیوں کا بھی کمال ہو جو میں نے صبح سویرے پھانک لی تھیں اور مجھے شک ہے کہ ان میں کچھ سٹیرونڈ کی آمیزش تھی لیکن میں ایک بہت

ہی چھریرا اور دراڑوں کو پھلانگ جانے والا ان تھک گھوڑا ہو گیا تھا.. لیکن ایک عجیب سانحہ ہو گیا..
کے ٹو ٹریک کے بعد میں نے جتنے بھی ٹریک کئے، میں نے ہمیشہ تیسرے دن کا بے تابی سے انتظار کیا کہ آہا جی آج تو ہم گھوڑے ہو جائیں گے اور ہم کبھی بھی نہ ہوئے.. ہمیشہ دو ناکارہ خچر ہی رہے جنہیں بیکار جان کو گولی ماردی جاتی ہے.. چنانچہ قابل فہم طور پر ڈاکٹر عمر کے اس تھیسس پر سے میرا ایمان اُٹھ گیا.. لیکن آج.. کنڈو گوروٹریک کے تیسرے دن یہ معجزہ ہو گیا تھا..

میں نے اپنے تمام ساتھیوں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا اور بگٹٹ چلتا جاتا تھا.. نہ میرے بدن میں کوئی زیادہ تھکاوٹ تھی اور نہ بلندی مجھ پر کوئی خاص اثر کرتی تھی اور میں ملکھا سنگھ ہو گیا تھا..

ملکھا سنگھ جسے ''فلائنگ سکھ'' کا نام دیا گیا تھا.. دنیا کے بہترین دوڑنے والوں میں سے تھا.. ایشین اولمپک میں گولڈ میڈل جیت چکا تھا اور کہتے ہیں کہ انڈین ریلوے میں ٹکٹ چیکر ہوا کرتا تھا.. ایک روز اس نے ایک بے ٹکٹ مسافر کو چیک کیا تو وہ مسافر بھاگ اٹھا.. ملکھا سنگھ کو بڑا غصہ آیا کہ کیسا احمق ہے مجھ ایسے چیمپئن سے بھاگ جانا چاہتا ہے.. چنانچہ اس نے مسافر کے پیچھے دوڑ لگا دی.. جب ملکھا سنگھ پلیٹ فارم پر قدمیں لگاتا سٹیشن سے باہر آ کر کھیتوں میں دوڑتا چلا جا رہا تھا تو کسی نے پوچھا، سردار جی وہ بغیر ٹکٹ والے مسافر کو پکڑ لیا ہے یا نہیں تو ملکھا سنگھ نے کہا ''بادشاہو ہم تو دوڑ میں اس کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں..''

تو میں بھی دوڑ میں اپنے ساتھیوں کو بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا..

شائد یہ لیلے پیک کی قربت کا اثر تھا جس نے میرے پژمردہ بدن پر اپنا برف ہاتھ رکھ کر کوئی سحر پھونک دیا تھا.. ایک دم جیسے پھونک دیا تھا اور میری نامردنی.. زندگی میں بدل گئی تھی..

ویسے مجھے کچھ کچھ شرمندگی بھی تھی کہ عمر کے اس حصے میں جب انسان باوقار اور معزز بزرگ سا ہو جاتا ہے، میں گھوڑا ہو گیا تھا.. یہ کوئی قابل فخر بات نہ تھی لیکن اس پر میرا کوئی اختیار نہ تھا..

میرا خیال ہے کہ میں ایک آدھ بار ہنہنایا بھی..

کہیں بلند پہاڑوں میں.. پتھروں کی دنیا میں.. بے انت برفوں میں عام طور پر کوئی واضح راستے نہیں ہوتے.. بس اندازے ہوتے ہیں کہ عمومی رخ یہ ہے بس چلتے جاؤ.. ان حالات میں آپ اپنی حماقت کو بروئے کار لاتے ہیں.. عقل کو اس لیے نہیں کہ وہ تو آپ میں ہوتی نہیں.. اگر ہوتو ادھر ذلیل وخوار ہونے کے لیے کیوں آئیں.. تو اس کوہ نوردی کی حماقت کو بروئے کار لا کر آپ اپنے راستے کا تعین کرتے چلے جاتے ہیں.. مثلاً کے ٹو ٹریک کے دوران جب ہم

بھٹک جاتے تھے تو بیافو گلیشیئر پر خچروں کا گوبر تلاش کرتے تھے کہ یہ خچر پاکستانی فوج کا سامان رسد ڈھوتے تھے تو جہاں جہاں ان کا گوبر کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا تو.. یقیناً یہی راستہ ہو گا.. ہوشے سے شائی چوا اور پھر دل سنگ پاتنگ سوئس اور چاکلیٹ کے وہ چھلکے اور بدذار ہر کام آئے جو بدتمیز کوہ نورد پھینکتے گئے تھے.. ان واضح نشانیوں کے علاوہ ''بتی'' کوہ نوردوں کے لیے ایک مینارہ نور ہوتی ہے.. پیچیدہ برفانی راہ گذاروں اور پتھریلے علاقوں میں کسی بڑے پتھر پر چھوٹے چھوٹے پتھروں اور کنکروں سے ایک ''بتی'' یا مینار سا بنا دیا جاتا ہے.. جیسے ''پٹھوگرم'' کھیلنے کے لیے بچے کنکریوں کو اوپر تلے جوڑ کر ایک مینار سا بنا دیتے ہیں..

آپ پتھروں کی سلطنت پر ایک نظر ڈالتے ہیں اور بہت غور سے دیکھتے ہیں تو کہیں نہ کہیں یہ نشانی نظر آ جاتی ہے جو کبھی تو دو تین کنکروں پر مشتمل ہوتی ہے اور کبھی خاصے تردد سے دس بارہ چھوٹے چھوٹے پتھروں کو اوپر نیچے رکھ کر یہ نشانی بنا دی جاتی ہے.. یہ نشانی کبھی تو کوہ نورد بناتے ہیں اور اکثر پورٹر اپنی سہولت کی خاطر بناتے چلے جاتے ہیں تاکہ ان کے پیچھے آنے والے ساتھی بھٹک کر کسی اور جانب نہ نکل جائیں.. اگر راستہ واضح نہ ہو جو کہ وہ کبھی بھی نہیں ہوتا تو ہر کوہ نورد یا پورٹر کا یہ فرض ہوتا ہے کہ کسی بڑے پتھر پر یہ نشانیاں بنا کر آگے بڑھتا جائے..

اگر ''بتی'' موجود ہو تو ہر کوہ نورد یہ کوشش کرتا ہے کہ اس رہنما مینار پر ایک اور پتھر بیلنس کر کے سرخرو ہو جائے..

یہ نشان محض ایک سرسری نظر ڈالنے سے نظر نہیں آتے..

میں بہت غور سے دیکھتا ان چھوٹے میناروں کو تلاش کرتا.. جن میں سے بیشتر پیسا کے جھکے ہوئے مینار کی مانند گرنے کو لگتے تھے.. ان کی جانب قدم اٹھاتا چلا جاتا تھا.. اور اپنے پھٹے بوٹوں کو دراصل اپنی نعلیں گردانتا تھا جو میرے سُموں میں ٹھونک دی گئی تھیں اور ان میں سے شائد چنگاریاں بھی اُڑتی تھیں کہ میں گھوڑا ہو چکا تھا.. شائد اس بلندی پر میرے نتھنوں میں سے بھاپ بھی خارج ہوتی تھی.. مردوں نے اپنی تسلی کی خاطر جو وہ انتہائی لایعنی محاورہ گھڑ رکھا ہے کہ مرد اور گھوڑا کبھی بوڑھے نہیں ہوتے.. تو میں تو بوڑھا بھی تھا اور گھوڑا بھی..

میں جب کبھی سر اٹھا کر لیلے پیک کو دیکھتا تو بے اختیار جی چاہتا کہ ہنہنانے لگوں.. ایسی ہی کرتا، اُس کے قدموں میں لوٹنے لگوں.. لیکن میں نے اجتناب کیا.. اس حرکت سے یقیناً لیلے پیک کا دل دکھے گا کہ میں تو مجنوں کی منتظر تھی اور میرے حصے میں یہ گھوڑا آ گیا ہے..

گندوگورو گلیشیئر اب تک سیدھا چلا جا رہا تھا۔ اب دیکھتا ہوں تو وہ بل کھا کر دائیں ہاتھ کہیں پہاڑوں کے اندر گم ہو رہا ہے۔ اس موڑ کے عین اوپر جو بلند کنارا تھا، اس پر ہمارے پورٹر براجمان تھے اور مجھے بے تحاشا اشارے کر رہے تھے۔ کوئی وارننگ دے رہے تھے۔ پہلے تو مجھے ان کی یا اشارہ بازی پلے نہ پڑی اور پھر بہت غور کرنے پر انکشاف ہوا کہ وہ مجھے گلیشیئر کے درمیان چلتے جانے سے منع کر رہے ہیں اور اشارے کر رہے ہیں کہ بائیں ہاتھ ہو جاؤ۔ کنارے کے ساتھ لگ کر چلو۔

ان کی وارننگ بروقت تھی۔ اگر میں اسی انداز میں گلیشیئر کے درمیان میں چلتا جاتا تو آگے ایک بہت چوڑی دراز منہ پھاڑے حائل تھی جسے پار کرنا ممکن نہ تھا۔ نہ صرف ایک دراڑ تھی بلکہ برف کا ایک کنواں بھی ایک برفانی ندی کو اپنے آپ میں گراتا گھمن گھیریاں کھا رہا تھا۔

یہ ملتر گلیشیئر والے کنویں کے حجم اور گھیر کا نہ تھا کہ وہ تو ایک عجوبہ تھا لیکن بہرطور ایک اندھا برف کنواں تھا جس کے آس پاس سے گزرنا صحت کے لیے انتہائی مضر ثابت ہو سکتا تھا۔

پورٹروں کے اشاروں نے مجھے ان ہر دو آفتوں سے بچا لیا تھا۔

کنارے کے اوپر ایک بھربھری بلندی کے اوپر ہمارے پورٹر بیٹھے تھے اور مجھے اشارے کر رہے تھے کہ یہاں سے اوپر آ جاؤ۔

میں نے گلیشیئر راستے کو ترک کیا اور اس کنارے پر چڑھتا ان تک پہنچ گیا۔

یہ بیان تو میں نے اپنی مختصر نویسی کے شوق میں دے دیا ہے کہ میں بس میں اس کنارے پر چڑھتا ان تک پہنچ گیا ورنہ اس چڑھائی میں جو برفانی پھسلن تھی اور لڑھکتے ہوئے پتھر اور کھسکتی ہوئی گیلی بجری تھی جس کے نیچے سخت برف پوشیدہ تھی، اس سے نبرد آزما ہوتے ہوتے جو میرا حال ہوا۔ سانس جو بے قابو اور بے ربط ہوا اور انتہائی بلند پایہ بوٹوں کے باوجود جو میں پھسلتا پھسلتا بچا ہوں اور نیچے گلیشیئر پر قلابازیاں کھاتے گرنے سے جو بچا ہوں تو اس کا احوال کیا کہوں۔

بے شک میں ایک گھوڑا ہو چکا تھا۔

لیکن ایک بُردبار اور شریف گھوڑے کو بھی تو ایک ریس کورس چاہیے۔ ایک صحرا یا کوئی میدان چاہیے۔ اس کے سامنے اگر ایک اس قسم کی چڑھائی آ جائے تو وہ اسے دیکھ کر محض ایک بار حسب عادت ہنہنائے گا اور شکایت آمیز لہجے میں کہے گا کہ معاف کیجیے میں ایک گھوڑا ہوا کرتا ہوں۔ ایک دھک کوڑا یا چیونٹا نہیں ہوں جو اس بلند دیوار کے ساتھ چمٹ کر رینگتا ہوا اوپر پہنچ جاؤں۔

بہرطور میں ایک گھوڑے اور ایک کوڑے کے کمبی نیشن کے ساتھ اوپر پہنچ ہی گیا۔ اپنے

مختصر رک سیک کو کندھوں سے اتارا اور لیٹ گیا۔ لیٹ گیا تو کھسکنے لگا کیونکہ ڈھلوان تھی اور بجری تھی، اس لیے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اٹھ کر بیٹھ گیا تو برابر میں رکھا رک سیک لڑھکنے کو آیا۔ اسے سنبھالا دیا اور پھر اپنے ساتھیوں کا انتظار کرنے لگا۔

بہت دیر کے بعد ہمیں بہت نیچے برف کی سلطنت کی سفیدی میں کیڑے مکوڑے رینگتے دکھائی دیے جو میرے ساتھی تھے۔ حسن بیمار تھا۔ شاہد سست ہو رہا تھا۔ میاں صاحب کا تخنہ سوج چکا تھا اور وہ پاؤں پر پٹیاں باندھ کر چلتے تھے۔ عامر کے پیٹ میں کچھ پرابلم تھی۔ سلمان اپنے بھاری بھالو پن سے عاجز آیا ہوا تھا اور برمانی اگرچہ پہلے دن سے ہی گھوڑا تھا اور بگٹٹ بھاگنا چاہتا تھا لیکن وہ حسن کی صحت پر نظر رکھنے کی خاطر اپنی باگیں کھینچتا چلا آتا تھا۔ لیلے پیک یہاں سے ایک عجیب منظر دکھاتی تھی۔

اس بلندی سے وہ ایک بے مثال درشن دیتی تھی۔

لیلے۔ جنت کے مقدس کوہ کیلاش کی مانند پرتقدس اور قابل پرستش دکھائی دیتی تھی۔

کوہ کیلاش کے بارے میں کہنا ہے کہ اس کے چرنوں کو چھونے کی خواہش کرنے والے پجاری چلتے ہوئے اس کے دامن تک نہیں جاتے بلکہ اپنے گھٹنوں پر گھسٹتے ہوئے وہاں تک پہنچتے ہیں۔ یا راستے میں ہی رہ جاتے ہیں۔

کسی بھی شے کو مقدس کر لیں۔ پرستش کے لائق کر لیں تو بڑی خواری ہوتی ہے۔ کوئی پتھر خدا ہو جاتا ہے اور کوئی حجر اسود۔

لیلے کی نوکیلی چوٹی کی تیز دھار بھی نیلگوں آسمان میں پیوست جیسے عرش پر مقیم کسی خدا کو چیلنج کرتی تھی۔

لیلے کا یہ روپ میرے لیے تو کوہ کیلاش سے کہیں برتر اور بلند تھا۔ اگر وہ قابل پرستش تھی تو پہاڑوں کے کسی مذہب میں اسے چھوڑ جانے کی سزا، ایک مرتد کی سزا ہو گی۔

ہم چونکہ اندر سے کافر تھے۔ مسلمان نہ ہوئے تھے، اس لیے لیلے ہمیں ترک اسلام کی ترغیب دیتی تھی۔ لیکن ہم کہاں اس ترغیب میں آنے والے تھے کہ ہم بہت بلہار پرست تھے۔ اگرچہ بلہار پرست وہی ہو جاتا ہے جس کے اندر کفر ابھی زندہ ہوتا ہے اور وہ اسے مارنے کے لیے آنکھیں بند کر لیتا ہے اور تلوار نکال لیتا ہے۔

لیلے او لیلے۔

''گونگے شاہ مجھے ہسپاں لے جا رہا ہے یا ہسپانیہ''

اس سے پیشتر کہ میں لیلے کی جانب دیوانہ وار لپکتا اور مذہب عشق اختیار کرتا علی موسے نے پوچھا ''صاحب آگے نہیں جائے گا۔''

''جائے گا۔''

''تو پھر جاؤ۔''

''آگے گندوگورو کا بیس کیمپ ابھی کتنا دور ہے؟''

''تھوڑا دور ہے۔''

''اور جدھر ہم پہنچے گا تو اس جگہ کا نام کیا ہے علی موسے؟''

اس بدبخت نے پھر وہی ہسپانوی قسم کا ہسپاں سا نام لیا.. اور میں اسے روک روک کر ایک ایک لفظ کو بار بار دوہراتے جب اس نام سے آگاہ ہوا تو وہ.. ہسپاں... ہی تھا.. اسی لیے ہسپانوی سا لگ رہا تھا..

''اور یہ کدھر ہے؟''

''صاحب ادھر سے نیچے اُترے گا.. جدھر ایک ندی بہتا ہے.. پھر اوپر جائے گا پھر نیچے۔''

''میں جاتا ہوں۔'' میں نے ایک برتری کی نظر اپنے نڈھال ساتھیوں پر ڈالی اور سینہ پھلا کر کہا ''بیس کیمپ پہنچ کر خیمے لگواتا ہوں اور پھر آپ کا انتظار کرتا ہوں.. میں جاتا ہوں۔'' میں چلنے لگا تو خیال آیا کہ جانا کس طرف ہے..

''کدھر ہے یہ بیس کیمپ کا راستہ۔''

''آپ کے ساتھ یہ پورٹر جائے گا صاحب.. راستہ دکھائے گا۔''

اور یہ پورٹر ایک سیاہ ریش لٹا پٹا پریشان حال گُنگ سا بابا پورٹر منہ کھولے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ''یہ آپ کو ہسپاں لے جائے گا.. ہم آپ کے ساتھیوں کو لے کر پیچھے پیچھے آئے گا۔''

میں پھر سے رواں ہو گیا..

دو تین بلندیاں اور ڈھلوانیں جھنجھناتے ہوئے طے کیں.. ندیوں میں چھینٹے اڑاتا پار گیا، پتھروں کو پھلانگتا اور برفوں پر بے خطر چلتا گیا.. اس لیے بھی کہ میرے ساتھی مجھے دیکھ رہے ہیں اور میں ان کے سامنے ڈینگیں مار کر آیا تھا.. جونہی وہ نظروں سے اوجھل ہوئے، میں نے ایک پتھر سے ٹیک لگا کر ہانپنا شروع کر دیا بلکہ زبان باہر نکال کر اس کو بھی ہوا لگوائی تا کہ تھوڑی بہت آکسیجن اس کے مساموں میں جذب ہو کر مجھے تازہ دم کرنے میں معاون ثابت ہو.. لیکن ثابت یہی ہوا کہ میں اتنا گھوڑا ابھی نہ تھا.. ایک جعلی سا گھوڑا تھا..

دراصل لکڑی کا وہ گھوڑا تھا جس میں سپاہی چھپا کر اسے ٹرائے کے شہر میں دھکیل کر لے جایا گیا تھا تا کہ ہیلن ایسی بے وفا حسینہ کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے.. میں پھر سے چلا.. اور اس سیاہ ریش پریشان حال گنگ بابے پورٹر کے تعاقب میں چلا اور تھوڑی ہی دیر میں پھر سے ہانپنے لگا..

اب وہ پتھروں کی دنیا چھوڑ کر ایک اور سفید گلیشیئر پر اُتر چکا تھا اور انتظار نہ کرتا تھا کہ میں اس سے جا ملوں.. وہ رُکتا تو تھا کسی پتھر کے ساتھ ٹیک لگا کر لیکن جونہی میں اس کے قریب پہنچتا وہ مجھ سے بات کیے بغیر پھر سے چالو ہو جاتا تھا.. چلنے لگتا تھا..

میں نے متعدد بار آوازیں دے کر اسے روکنا چاہا لیکن وہ سنتا ہی نہ تھا.. پیچھے مڑ کر دیکھتا اور اپنی سیاہ ریش میں پوشیدہ مسکراہٹ سے مجھے نواز کر پھر سے شوٹ لگا دیتا..

عجیب اول جلول اور اخلاقیات سے عاری پورٹر تھا..

میں آوازیں دیتا.. ہانپتا ہوا آوازیں دیتا کہ ہیلو.. بابا جی.. بابیو.. بزرگو.. پورٹرو.. ذرا رک جاؤ.. مجھے سانس تو لینے دو لیکن شاید وہ بہرا تھا.. ٹس اَن ٹس نہ کرتا چلتا جاتا تھا.. اور میں اسے کھو دینے کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتا تھا کیونکہ اس پتھریلی اور برفانی ریاست میں بھٹک سکتا تھا..

اور پھر حسب روایت ایک اور ہسپانوی ٹیم سے آمنا سامنا ہو گیا..

ان میں ایک ایسی بزرگ خاتون تھی جو پاکستان میں ہوتی تو پوتے پوتیوں کو کھلاتی اللہ اللہ کرتی موت کی منتظر ہوتی.. ایک ڈھیلی جین اور ہائکنگ بوٹس میں کولہوں پر ہاتھ رکھے شکایتیں کر

رہی تھی.. ''تمہارے ملک میں ایسی شاندار وادیاں اور چوٹیاں ہیں جو دنیا بھر میں اور کہیں نہیں ہیں اور تم لوگ ان کا خیال نہیں رکھتے.. ہم یہاں جس بھی خیمہ گاہ میں پہنچے ہیں وہاں گندگی اور فضلے کے ڈھیر ہوتے ہیں.. تم لوگ اپنی اس جنت کو صاف کیوں نہیں رکھتے.. ہم لوگ جو باہر سے آتے ہیں، ہم دس بیس ڈالر فی کس ادا کرنے کو تیار ہیں تاکہ اس رقم سے آپ ان خیمہ گاہوں اور منزلوں کو ستھرا رکھ سکیں.. تمہارا سیاحتی محکمہ کیا کر رہا ہے..''

''وہ سیمینار اور فیسٹیول منعقد کروا رہا ہے میڈم.. چین نیچے قراقرم ہائی وے کے آس پاس.. جہاں فائیو سٹار سہولتیں میسر ہیں.. انہیں واقعی یہ خبر نہیں کہ ادھر ہوشے سے آگے درہ گندوگورو کے دامن میں کوئی ہسپاں یا دل سنگ پا بھی ہے.. ویسے تو مجھے بھی خبر نہیں تھی..'' میں نے ہنس کر کہا..

''کتنی شرم کی بات ہے..'' میڈم بھی خوش دلی سے ہنسی اور میں نے نوٹ کیا کہ اس کے بیشتر دانت مصنوعی ہیں جنہیں باقی ماندہ دانتوں پر ایک ''برج'' بنا کر سہارا دیا گیا ہے..

میڈم کے ہمراہ جو کوہ نورد تھے، وہ ایمنسٹی انٹرنیشنل کے رکن تھے اور ادھر جانے کس سلسلے میں آ نکلے تھے..

''دیکھیں میڈم ہم تو ہسپانیہ سے اتنا پیار کرتے ہیں کہ ہم نے اپنے کئی گلیشیرز کے نام بھی ہسپانوی میں رکھے ہوئے ہیں..''

''واقعی؟''

''ہاں.. آپ لوگ بُل فائٹنگ کے دوران ہے تورو.. کے نعرے لگاتے ہیں تو ہم نے کے ٹو کے راستے میں پڑتے عظیم گلیشیر کا نام بال تورو رکھ دیا ہے.. اور اس کی لے میں گندوگورو ہے.. اور یہیں کیمپ کا نام بھی ہسپانوی ہے یعنی.. ہسپاں..''

''کیا واقعی؟''

''ہاں واقعی.. اگرچہ نام رکھنے کے بعد ہمیں معلوم ہوا ہے کہ یہ ہسپانوی سے ہیں..'' میڈم نے دل کھول کر اپنے مصنوعی اور چند اوریجنل دانتوں کی نمائش کی اور بہت خوش ہوئی..

''آپ میری ٹانگ کھینچ رہے ہیں..''

''بالکل نہیں..'' میں نے بھی ہنستے ہوئے کہا.. بھلا مجھے اس عمر کی خاتون کی ٹانگ کھینچنے سے کیا فائدہ ہو سکتا تھا.. ''اب مجھے اجازت دیجیے میڈم.. آپ نے دیکھا ہوگا کہ میں ایک باریش پورٹر کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا جب آپ کی خاطر رک گیا اور اب دیکھئے کہ وہ بہت دور نکل گیا ہے

اور مجھے اس کمبخت کو نظر میں رکھنا ہے.. اس لیے.. آدیوس.. خدا حافظ..''

بابا باریش بہت دور جا چکا تھا.. اور وہ صرف اپنی سیاہ داڑھی کی وجہ سے سفید برفوں میں نمایاں ہو رہا تھا..

داڑھی کے بھی کتنے فوائد ہیں، یہ ہم نادان نہیں جانتے..

اس کی بے اعتنائی اب بھی جاری تھی..

میں نے اب اسے پکارنا ترک کر دیا تھا کیونکہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ پیدائشی طور پر بہرا ہے..

پھر وہ ایک مقام پر رکا.. برف کے ایک تودے کے ساتھ ٹیک لگا کر سستانے لگا اور جب حسب معمول میں اپنی رفتار تیز کر کے اس کے قریب پہنچا تو وہ حسب معمول مجھے غچہ دے کر چپت ہونے کو تھا۔ جب میں نے ایک چمکیلے ریپر والی ٹافی شہادت کی انگلی اور انگوٹھے میں بھینچ کر لالچ کے ایک جھنڈے کے طور پر بلند کر دی.. اس نے خلاف معمول چپت ہو جانے کا ارادہ ترک کیا اور اس ٹافی کو رغبت بھری نظروں سے دیکھنے لگا.. مبہوت سا ہو گیا یہاں تک کہ میں اس کے پاس جا پہنچا.. اس نے ٹافی وصول کرنے کے لیے نہایت بے تابی سے ہاتھ آگے کیا تو میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ ''اوئے تم رکتے کیوں نہیں.. بہرے ہو..''

اس کی داڑھی میں سے ایک لاچار قسم کی مسکراہٹ برآمد ہوئی اور میڈم کی مانند اس کے بیشتر دانت بھی غائب تھے..

''میرا انتظار کیوں نہیں کرتے؟'' میں نے ذرا بلند آواز میں کہا تو بلندی کی وجہ سے سانس پھولنے لگا..

اس پر اس نے ٹافی سے نظریں ہٹائے بغیر غوں غاں کرتے اشاروں کی زبان شروع کر دی.. کبھی آسمان کو تکتا اور انگلی اٹھا کر بے چارگی سے سر ہلاتا اور کبھی برف پر نگاہ ڈال کر گلے میں سے کوئی عجیب سی آواز نکالتا.. پھر اس نے منہ کھول کر زبان نکالی اور سر ہلانے لگا..

وہ بہرا نہیں گونگا تھا..

''تم گونگے ہو؟'' میں نے بھی اپنی زبان نکال کر اشارہ کیا..

''غاں غاں..'' اس نے زور زور سے سر ہلایا..

تب ہم دونوں نے پُر مسرت ہو کر اپنی اپنی زبانیں دہن میں واپس کیں کہ میں جان چکا

تھا کہ وہ گونگا ہے اور وہ جان گیا تھا کہ میں جان چکا ہوں کہ وہ گونگا ہے.. تو اب سفر آسان ہو گیا..

جب اپنے لیڈر کے بارے میں علم ہو جائے کہ وہ گونگا ہے تو اس کی پیروی کرنا آسان ہو جاتا ہے.. ورنہ آپ آوازیں ہی دیتے رہتے ہیں کہ لیڈر جی ہمیں بھی ساتھ لے کر چلو.. اور اس کی ٹافیوں سے رغبت بھی میرے بہت کام آئی.. جونہی وہ اپنی رفتار تیز کرتا، میں ٹافی کا پرچم بلند کر کے اسے روک لیتا.. اس کے دانت کم ہونے کا باعث شائد یہی ٹافیوں کے لیے رغبت تھی.. شائد وہ غیر ملکی ٹیموں کے سامان سے ٹافیاں اور چاکلیٹ چُرا چُرا کر کھاتا رہا تھا.. اس لیے اپنے دانت کھو بیٹھا تھا..

ہم پتھروں سے اٹے گلیشیر سے آگے ہوئے اور ایک برف سفید گلیشیر پر اتر گئے.. اور اس کی سطح پر کرچ کرچ چلنے لگے کہ جو گر کے پیچھے دبی برف میں سے اعصاب پر سوار ہو جانے والی یہی آواز مسلسل آتی تھی.. اسی آواز کرچ کرچ نے سنولیک کے سفر کے دوران ہمیں زچ کر کے رکھ دیا تھا..

میں نے پیچھے نگاہ کی.. دُور دُور تک میرے ساتھیوں کا کچھ پتہ نہ تھا اور میں نے انہیں یوں مات دینے پر ایک انتہائی کمینی خوشی محسوس کی اور ذرا ہنہنایا..

اور جب میں ذرا ہنہنایا ہوں تو گونگا بابا رُک گیا.. اور میری جانب ڈری ڈری نظروں سے دیکھا.. اگرچہ وہ گونگا تھا اور بہرا بھی ہو سکتا تھا لیکن اس کے باوجود ایک ہنہناہٹ تو سُن سکتا تھا..

چنانچہ میں نے شرمندہ ہو کر مزید ہنہنانے سے گریز کیا اور چپکے سے اس کے پہلو میں چلنے لگا.. بائیں جانب ایک خشک چٹانی سلسلہ چلتا جا رہا تھا اور جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے توں توں اس کے عقب میں سے برفبار بلندیاں اور چوٹیاں ظاہر ہو رہی تھیں اور سرکتی ہوئی سامنے کے منظر میں داخل ہو رہی تھیں..

میں نے آج کے سفر کے لیے تین سگریٹوں کا کوٹہ طے کر رکھا تھا.. میں کسی ایک مقام پر تھوڑی دیر کے لیے سانس درست کرنے کے لیے رکتا، فلاسک میں سے گلوکوز کی آمیزش والے پانی کے دو گھونٹ بھرتا پھر سگریٹ سلگا کر پورے چار کش کھینچنے کے بعد اسے پیکٹ میں بند کر کے دم پخت کر دیتا.. یوں ایک سگریٹ تین بار میرے کام آتا.. میں تمباکو کی غلامی سے آزاد ہونا چاہتا تھا لیکن نکوٹین کی ملکہ نے مجھے پوری طرح اپنے دام میں جکڑ رکھا تھا..

سفید گلیشیر کا بھی اخیر ہوا اور ایک بار پھر اس کی سطح کو پتھروں، بجری اور سنگریزوں نے مکمل طور پر ڈھک لیا..

ٹافیوں کا رسیا گونگا پہلوان ایک بلندی پر پہنچا اور اپنی لاچار اور باریش مسکراہٹ بکھیرتا مجھے اوپر آنے کے لیے اشارے کرنے لگا..

میں اپنے ٹوٹتے بکھرتے سانسوں سے اندازہ لگا رہا تھا کہ ہم بلند سے بلند تر ہوتے جا رہے ہیں.. نامعلوم انداز میں اونچے ہو رہے ہیں.. بڑی مشکل سے.. ہر لمحہ اپنے بلڈ پریشر کا خیال رکھتے.. یہ خیال رکھتے ہوئے کہ اس عمر میں اتنی بلندی پر کہیں دل کی شریانوں میں کوئی رکاوٹ نہ آ جائے.. دھیرے دھیرے اس سانس کو جو تن بدن سے نکلا جاتا تھا منت سماجت کر کے اسے روکتا سنبھالتا اوپر بالآخر گونگے شاہ کے پاس پہنچ ہی گیا..

اور اس کے خشک بلندی سے پرے غوں غاں کے اشارے کرنے سے پہلے ہی میری نظر اس منظر تک سفر کر گئی..

''درہ گندوگورو کے دامن میں چار خیمے..لکّی باسٹرڈز''

وہ جو مقدس کتابوں میں کہا جاتا ہے کہ Lo & Behold..

تو یہاں بھی... Lo & Behold... سامنے ایک پیالہ نما میدان تھا..خشک بلندی سے نشیب میں..برف آمیز برف پہاڑوں کے دامن میں ایک پیالہ نما میدان تھا جس پر دھند کے آثار تھے..ایک پُرشور ندی تھی جو اس میدان میں اُترتی تھی لیکن ابھی یہاں سے اس کا شور سنائی نہیں دیتا تھا..برفوں میں سے اُتر کر نیچے آ رہی تھی تو یقیناً پُرشور تھی..میدان کے اوپر ڈھلوان پر کچھ پتھریلی آماجگاہیں تھیں جن کے آگے نیلے ڈرموں کی قطاریں تھیں اور ان کی نیلاہٹ پورے منظر میں سے الگ اور شوخ دکھائی دیتی تھی..

اور اس پیالہ نما وسیع میدان میں..برف زاروں کی گود میں..دھند میں..پُرشور ندی کے نیچے..اس میدان میں جس پر بے پناہ برفیں ہر جانب سے جھکتی جاتی تھیں اور برفیلی ندیوں کے پانی چلتے تھے..وہاں ایک وسیع خیمہ گاہ تھی..جس میں ہر رنگ اور ہر نسل اور ہر سائز کے بے شمار خیمے ایستادہ تھے..اگرچہ یہاں سے وہ خیمے نہیں، خیموں کے کھلونے لگ رہے تھے..رنگوں کے دھبے لگتے تھے..ایک دنیا وہاں آباد تھی..

یہی ہسپاں تھا..

مجھے اتنی آبادی کی توقع نہ تھی..

اور اس ہسپاں کے اوپر گندوگورو کی چوٹی اور درہ تھا..اور درے پر حیرت انگیز طور پر برف کے ڈھیر نہیں تھے بلکہ خشک چٹانوں کے اوپر برف کی ایک لکیر تھی..اور لیلے بھی تھی..

وہ میرے ساتھ ساتھ چلتی چلتی ہسپاں تک پہنچ گئی تھی اور اب اس پر سایہ فگن ہوتی تھی..

ایک عجیب منظروں والی برفانی بلندیوں کے دامن میں پھیلی ایک انہونی سی دنیا تھی..

جیسے تیس برس پیشتر میں نے ایک ناول کو سوچا تھا کہ ایک کوہ نورد رتی گلی کے درّے کو پار کر کے جب دوسری جانب اُترتا ہے تو وہاں دھند میں ایک شہر آباد دکھائی دیتا ہے..اور شہر موہنجوداڑو کا ہے..وہی گلیاں..وہی حمام اور غلے کے گودام اور وہی لوگ..پانچ ہزار برس پہلے کے وہی لوگ جنہوں نے آریائی حملہ آوروں سے فرار ہو کر ان دور افتادہ برفانی وادیوں میں آ کر پھر سے اپنا شہر اسی شکل میں تعمیر کر لیا تھا اور نہیں جانتے تھے کہ پانچ ہزار برس گزر چکے ہیں اور باہر کی دنیا بدل چکی ہے اور یہ کوہ نورد اس شہر میں اُتر کر انہیں بتاتا ہے کہ باہر کی دنیا کچھ اور ہو چکی ہے..

لاہور کے شیزان ریستوران میں..ذوالفقار تابش کی موجودگی میں..میں نے اس ناول کی آؤٹ لائن اپنے پسندیدہ مصنف ابن انشاء کو سنائی..ڈرتے ڈرتے کہ یہ کچھ عجیب سی آؤٹ لائن تھی..اور مجھے اب تک یاد ہے کہ ابن انشاء نے اپنے موٹے شیشوں کی عینک اتار کر مجھے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا تھا اور کہا تھا..تارڑ تم سب کام کاج چھوڑ دو..دنیا ترک کر دو لیکن یہ ناول ضرور لکھو..یہ تمہارا بہترین کام ہوگا..اور میں نے کہا تھا کہ سر جی مجھ میں ابھی اتنی تخلیقی سکت نہیں اور یہ آئیڈیا بھی عجیب اور انہونا سا ہے..تو ابن انشاء نے کہا تھا..کبھی نہ کبھی تم میں یہ سکت پیدا ہو جائے گی..اس آئیڈیے کو فراموش نہ کرنا..یہ تمہارا بہترین کام ہوگا..

تیس برس گزر گئے ہیں لیکن مجھ میں ابھی وہ سکت پیدا نہیں ہوئی..

ہسپاں کو..عجیب منظروں والی برفانی بلندیوں کے دامن میں پھیلے ہسپاں کو دیکھ کر مجھے ایک عرصے کے بعد ابن انشاء کا خیال آیا..اس لیے کہ گمشدہ موہنجوداڑو ایک ایسی ہی بلند اور نامعلوم وادی میں ہو سکتا تھا..

لیکن اس پورے منظر میں ایک اور منظر تھا..

ایک..اس منظر سے پرے ایک اور الگ منظر تھا جس نے مجھے تباہ کر دیا..

شعلہ جس نے مجھے پھونکا بس اسی الگ منظر سے اٹھا تھا..

اس وسیع پُرہجوم خیمہ گاہ سے پرے..درہ گندوگورو کی جانب جو وادی تھی..وہاں برف پانیوں کے پھیلاؤ کے کناروں پر..ایک مکمل تنہائی میں..جہاں..اور کوئی نہ تھا وہاں سب سے جدا چار خیمے ایستادہ تھے..

اور ایسے خوش نظر لگتے تھے جیسے یہ پورا منظر..درہ گندوگورو کے دامن میں یہ منظر صرف

ابھی چار خیموں کے لیے تخلیق کیا گیا تھا..

وہاں "رائٹس آف ایڈیشن ریزروڈ" کی تختی تب تک لگی رہی تھی جب تک کہ یہ چار خیمے وہاں نہ پہنچے اور اپنا رائٹ کلیم نہ کیا..

وہ چار خیمے خوابناک لگتے تھے..

ہسپاں کی خیمہ گاہ کی بھیڑ اور مخلوق سے بہت پرے.. گندو گورو کی وادی میں.. پانیوں کے کنارے چار خیمے.. خوابناک لگتے تھے..

اور میں نے انہیں دیکھتے ہوئے سوچا.. کہ یہ جن کوہ نوردوں کے بھی خیمے ہیں وہ کتنے لکی باسٹرڈز ہیں..

کاش کہ میں ان لکی باسٹرڈز میں شامل ہوتا..

میں نے گونگا پہلوان کو رشوت کے طور پر تین چار ٹافیاں پیش کیں اور اشارے سے کہا کہ بابا بارلیش اب تم بے شک مت رکو.. میرا انتظار نہ کرو.. بے دریغ چلتے جاؤ کہ میں نے منزل دیکھ لی ہے.. تم چلو میں پہنچ جاؤں گا..

مجھے اس بلند خیمہ گاہ تک پہنچنے اور اس میں اترنے میں بیس منٹ لگے.. اور جب اترا ہوں.. تو وہاں بلند برفانی بھٹکتی شفاف ہوائیں نہ تھیں.. ایک بو تھی..

اپنی کوہ نوردی کی آخری منزل میں اترا ہوں تو خیمہ بستی میں ایستادہ غیر ملکی ٹیموں کے رنگ رنگ خیمے.. آرام دہ خیمے.. کچن ٹینٹ اور ڈائننگ ٹینٹ اپنی جگہ.. لیلے پیک کا بے مثال عکس اپنی جگہ جو ان خیموں کے برابر میں ٹھہرے ہوئے پانیوں میں ٹھہرا ہوا تھا.. اور پندرہ ہزار فٹ سے زیادہ بلند ہسپاں میں پہنچ جانے کی چنچل کھلکھلاتی ہوئی بے پایاں مسرت اپنی جگہ لیکن وہاں ایک بو تھی..

اور یہ انسانی فضلے کی ناقابل برداشت بو تھی.. جہاں کہیں پتھروں کی اوٹ تھی وہاں میں نے استعمال شدہ ٹائلٹ پیپر بھی سرسراتے ہوئے اور آلودہ دیکھے..

عامر نے کیا خوب کہا تھا کہ تارڑ صاحب.. ہم اگرچہ اپنے آپ کو اشرف المخلوقات گردانتے ہیں لیکن ایک معاملے میں جانوروں سے مار کھا جاتے ہیں.. یعنی ان کی بِٹ ہمیں ڈسٹرب نہیں کرتی.. گاؤں میں بھینسوں کے گوبر سے اُپلے تھاپے جاتے ہیں اور کچھ ناگواری نہیں ہوتی.. بکریوں اور بھیڑوں کی مینگنیاں ہماری طبیعت کو اُلٹاتی نہیں اور ہم ان کی نزدیکی سہہ سکتے

ہیں۔ ان پر خیمے لگا سکتے ہیں.... پرندوں کی بیٹ اور ریچھوں کا گوبر ہمیں بالکل اپ سیٹ نہیں کرتا لیکن حضرت انسان کا نظام انہضام کچھ ایسا ہے کہ اگر آپ کے آس پاس صرف ایک انسان کی بِٹ ہو تو وہ برداشت سے مکمل طور پر باہر ہو جاتی ہے.. اس کی بُو کو سہارنا ممکن نہیں ہوتا..

پائیو میں بھی یہی پرابلم تھی..

اور ہسپاں کی خیمہ گاہ میں بھی جو برفیلی سرد ہوا تھی، اس میں بھی اسی انسانی "کمال" کی بُو تیرتی تھی اور برداشت سے باہر ہوتی تھی..

ہسپانوی میڈم بھی اسی بُو سے نالاں ہو کر مجھ سے شکایت کرتی تھی..

میں جب اپنے قدم.. اور ان قدموں میں جو بوٹ تھے، انہیں گھسیٹتا اس خیمہ گاہ میں اُترا.. درہ گندو گورو کے بیس کیمپ ہسپاں میں اُترا.. اس میں داخل ہوا.. بُو کو بڑی مشکل سے درگزر کرتا اس میں داخل ہوا تو دائیں جانب ایک ریتلے میدان میں ان سینکڑوں کوہ نوردوں کے خیمے پُرہجوم تھے جو آج سویرے کے ٹو سے واپسی پر گندو گورو کا درہ عبور کر کے.. ان میں سے کچھ اس کی چوٹی سر کر کے یہاں اُترے تھے..

اور ان پانیوں کے کنارے تھے جن میں لیلے پیک کی لیلے اولیلے برفیں عکس ہوتی جاتی تھیں اور ان پانیوں کے کنارے میں نے ایک سُرخ.. تیز آتشی سُرخ بالوں والی کوہ نورد لڑکی کو بالوں میں کنگھی کرتے دیکھا..

قدرتی سُرخ بالوں والی لڑکیاں یورپ میں بھی کم کم ہوتی ہیں..

اور جن کے بال کسی عام رنگ کے ہوتے ہیں وہ بھی اس امر سے آگاہ ہوتی ہیں کہ محض بالوں کی رنگت کی وجہ سے انہیں جنسی شدت کی علامت سمجھا جائے گا، وہ اپنے بالوں کو سرخی میں رنگتی ہیں..

سٹاک ہوم کی ایک رات میں.. ایک ایسی ہی قدرتی سُرخ بالوں والی بھری بھری لڑکی تھی جس نے ریستوران کے ڈانس فلور پر مجھ سے مکمل بے اعتنائی برتی تھی اور پھر مجبور کہ اس کے فلیٹ کو.. رات کے اس سمے کوئی ٹرام یا بس نہ جاتی تھی میرا ساتھ دیا تھا..

اور اس نے مجھے آگاہ کیا تھا کہ محض بالوں کی سُرخی کی وجہ سے کسی لڑکی کو آسان اور جذباتی سمجھ لینا حماقت ہے..

تو یہ سُرخ بالوں والی لڑکی لیلے پیک کے عکس کے سامنے اپنے بال سنوارتی تھی.. ان

میں کنگھی کرتی تھی..

ہسپاں کی خیمہ گاہ میں دائیں ہاتھ پر تو خیموں کی دنیا تھی اور بائیں جانب پہاڑ کی اوٹ میں متعدد پتھریلی چار دیواریاں تھیں جن میں ان غیر ملکی کوہ نوردوں کے ہمراہ آئے ہوئے پورٹر قیام کرتے تھے اور اگلے روز شائی چو پہنچ جانے کی آرزو کرتے تھے جہاں ان کو پورے ٹریک کی مزدوری مل جاتی تھی.. اور انہوں نے متمول ہو کر اپنے گھروں کو.. اپنی ایک یا دو بیویوں کے پاس لوٹ جانا تھا..

میں اس خیمہ بستی میں داخل ہوا تو وہاں کوئی ہیجان پیدا نہ ہوا..

کسی نے پروا نہ کی کہ کون آیا ہے..

کسی بھی غیر ملکی کوہ نورد نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا..

صرف چند ایک پورٹروں نے مجھے حیرت سے دیکھا.. اس لیے دیکھا کہ میں یہاں تک پہنچنے والا پہلا پاکستانی تھا..

البتہ ایک وحشی داڑھی والے گائیڈ نے مجھے جانے کیسے اس حلیے اور حالت میں پہچان لیا اور چائے کی ایک پُرخلوص دعوت دی..

ایک اور پورٹر جو نہایت بلند قامت تھا اور جس کی مسیں ابھی بھیگی نہ تھیں میرے استقبال کے لیے آگے آیا اور ذرا جھجکتے ہوئے بولا ''صاحب میں نے آپ کو پہچان لیا ہے.. آپ تارڑ صاحب ہونا!''

''کیسے پہچان لیا ہے؟'' میں نے اپنی اس خوش نصیبی پر نازاں ہو کر سوال کیا.. جی ہاں.. یہ کم از کم میرے ایسے لوگوں کے لیے تو ایک بہت بڑی خوش نصیبی ہوتی ہے کہ آپ پہاڑوں کے اندر ایک درے کے دامن میں اُترتے ہیں اور وہاں آپ پہچانے جاتے ہیں..

''سر میں شمشال کا رہنے والا ہوں.. دو برس پیشتر جب آپ ہماری وادی میں اترے تھے تو آپ نے یہی نیلی جیکٹ اور سفید چترالی ٹوپی پہنی ہوئی تھی.. میں نے آپ کو شکل سے نہیں لباس سے پہچانا ہے..''

''تم یہاں.. اپنی وادی سے اتنی دور.. یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''میں ادھر روزگار کے لیے آیا ہوں.. بوجھ اٹھاتا ہوں.. پورٹر ہوں.. میں نے آپ کا کتاب ''شمشال بے مثال'' پڑھا ہے.. شمشال کے سب لوگوں نے پڑھا ہے.. اردو میں ہمارے

علاقے کے بارے میں پہلا کتاب ہے سر.. اور اب کچھ لوگ یہ کتاب پڑھ کر ہمارا وادی میں بھی آنے لگے ہیں سر..''

یہ کیسی خوش بختی ہے کہ آپ کوہ نوردی کی داستانیں اپنے جنون کی تسلی کے لیے لکھتے ہیں.. کسی اعلیٰ اور ارفع جذبے کے تحت نہیں لکھتے.. کسی مقصد کے لیے نہیں تحریر کرتے اور پھر بھی کچھ غیر معروف وادیاں.. ان کی وجہ سے معروف ہو جاتی ہیں..

کبھی کوئی فیری میڈو.. کبھی ترشنگ اور کبھی شمشال!

وحشی داڑھی والے.. فرینڈلی گائیڈ نے مجھے ایک مرتبہ پھر اپنے ڈائننگ ٹینٹ میں چائے کی دعوت دی لیکن میں اس بیس کیمپ میں اُترتے ہی عیش و عشرت میں مبتلا نہیں ہو جانا چاہتا تھا.. پہلے اپنے ان پورٹروں کو تلاش کرنا چاہتا تھا جو مجھے اور گونگے پہلوان کو کراس کر کے آگے نکل گئے تھے اور اب اس وسیع دنیا میں کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے..

پتھریلی آماجگاہوں میں چہلیں کرتے ہر پورٹر کے چہرے کو میں غور سے دیکھتا تھا کہ کہیں یہ وہ تو نہیں.. اور یہ.. کوئی اور ہوتے تھے.. میرے پورٹر نہیں ہوتے تھے..

میں ایک لاوارث گمشدہ بچے کی مانند ہسپاں کے اس میلے میں شناسا چہرے تلاش کرتا تھا.. اور وہ کہیں بھی نظر نہیں آتے تھے..

تب میں نے اس بستی سے پرے.. شوریلی ندیا کے پار ڈھلوان پر جو پتھریلی آماجگاہیں معلق تھیں اور وہاں جیسے ذرم تھے، وہاں اپنے گونگے پہلوان کو اشارہ کرتے دیکھا کہ ادھر آجاؤ.. ادھر آجاؤ..

ادھر جانا اتنا آسان نہ تھا..

اُس ڈھلوان اور خیمہ بستی کے درمیان شوریلی ندیا جو پڑتی تھی.. گھنی اور ابدی برفوں میں سے جنم لیتی.. پگھلتی.. بلندی کی برفوں کی دھند میں سے ظاہر ہوتی نیچے آرہی تھی.. لیکن اس کے پانیوں میں چند پتھر ایسے اُبھرتے تھے جن پر احتیاط سے قدم جما کر دوسری جانب جایا جا سکتا تھا.. دوسری جانب تھوڑی سی چڑھائی تھی جس کے اوپر کچھ کوٹھڑیاں اور غاریں سی تھیں جن میں پورٹر مزے کر رہے تھے اور مختلف مہموں کے سامان کے نیچے ذرم قطار اندر قطار بیٹھے تھے.. میں اپنے گونگے پہلوان کے پاس پہنچا اور اس سے دریافت کیا کہ.. جیسے ایک گونگا دوسرے گونگے سے دریافت کرتا ہے کہ اے گونگے ہمارے پورٹر کہاں مر گئے ہیں.. خیمہ بستی میں تو نہیں ہیں.. اور کمبخت

تو ادھر کیا کر رہا ہے.. بتائے گا تو تلافی دوں گا..

اور تب گونگے پہلوان نے غوں غاں کر کے گندوگورو کی وادی کے نشیب کی جانب اشارہ.. وڑے سے نیچے آنے والی پگڈنڈی کے دامن میں، ندیوں اور گھاس کے میدانوں کے کنارے جو خوابناک منظر والے چار شہزادے خیمے راج کرتے تھے، ان کی جانب اشارہ کیا..

میرا دم رُک گیا.. وہ ہمارے خیمے تھے..

وہ شاندار رنگ برنگے.. ہسپاں کی بھیڑ اور بو سے پرے.. پانیوں کے برابر میں عظیم برفانی چوٹیوں کے آمنے سامنے سب سے الگ تھلگ جو چار خیمے تھے، جنہیں میں نے گلیشیر سے اُترتے ہوئے دیکھا تھا اور حسد کیا تھا، ان باسٹرڈز کی قسمت پر جن کے وہ خیمے تھے.. اور وہ تو ہمارے تھے..

ہمارے کسی پورٹر نے پہلی بار ذوقِ جمال کا مظاہرہ کیا تھا..

میں نے رشک کیا تھا کہ وہ کون سے لکی باسٹرڈز ہیں جن کے یہ خیمے ہیں.. تو اب یہ کھلا کہ یہ ہم تھے.. شرمندگی بھی ہوئی کہ خواہ مخواہ بے احتیاطی کی اور اپنے آپ کو یہ کیا کہہ دیا..

میں نے خوش ہو کر گونگے پہلوان کو انعام کے طور پر متعدد ٹافیاں پیش کر دیں..

ہم دوسری جانب اپنے خیموں کی طرف اُترنے لگے..

خیموں کے آگے ٹھہرے ہوئے پانیوں اور ندیوں کی ایک وسیع گزرگاہ تھی جس کے پار پتھروں کا ایک میدان تھا اور ان کے اوپر برفیلی چوٹیاں جھکی ہوئی تھیں..

دائیں جانب وہی ہسپاں کی وسیع خیمہ گاہ دکھائی دے رہی تھی اور پہلے لیلے پیک وہاں تھی اور اب میرے ساتھ چلتی چلتی خیموں کے تقریباً سامنے آ کھڑی ہوئی تھی..

بائیں ہاتھ پر ایک مختصر وادی وہاں تک چلی جاتی تھی جہاں درّہ گندوگورو کی چٹانیں اور برفیں اس کا راستہ روک کر بلند ہو جاتی تھیں اور وہاں دھند تھی..

میں نے اپنا چھوٹا رک سیک کندھے سے اُتارا.. واٹنگ سنک گھاس پر پھینکی اور زمین پر لیٹ گیا.. زمین میں ہلکی نمی اور ٹھنڈک تھی..

''ہسپاں کی شام.. پکوڑے اور لیلے او لیلے..''

اسحٰق نے مالٹے کے رنگ کا زرد شربت بنا کر مجھے پیش کیا اور اس کے متعدد گھونٹ چڑھانے کے بعد قدرے مخمور ہوا اور اس تنہائی سے لطف اندوز ہونے لگا جس میں ابھی تک میرا کوئی ساتھی شریک نہیں تھا..

تھوڑی دیر بعد مجھے خیال آیا کہ مجھے اپنے ساتھیوں کو خوش آمدید کہنے کے لیے واپس خیمہ بستی میں جانا چاہیے جہاں انہوں نے اُترنا تھا.. انہوں نے اُتر کر وہیں بھٹکتے رہنا تھا کہ ان کے گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ ہمارے خیمے ادھر ہیں.. میں واپس ہوا.. ڈھلان پر چڑھ کر نالے تک گیا اور پہلی بار اوپر دیکھا جہاں سے نالہ اُتر رہا تھا.. اوپر ایک یکتا خوبصورتی کی ہری بھری برف بھری لینڈ سکیپ تھی جس پر دھند اُترتی تھی اور اس لمحے اس دھند میں سے ایک غیر ملکی کوہ نورد اُتر رہا تھا جو شاید آج صبح کہیں اوپر گیا تھا اور اب شام ڈھلے ہسپاں واپس آ رہا تھا..

خیموں سے آگے میں اس مقام پر جا کھڑا ہوا جہاں سے میں ابھی ابھی اُترا تھا.. پھر میرے ساتھی ایک ایک کر کے گلیشیر پر نمودار ہوئے اور آہستہ آہستہ نیچے آنے لگے.. میں آگے بڑھ کر انہیں خوش آمدید کہتا اور پھر ایک بچے کی طرح ان سے پوچھتا کہ ذرا ایک نظر اس درّے کے وسیع دامن پر ڈالیے اور ذرا اندازہ لگائیے کہ ہمارے خیمے کہاں ہو سکتے ہیں..

وہ غیر ملکیوں کے خیموں کے انبار میں اپنے خیمے تلاش کرنے لگتے اور جب وہ کہیں نظر نہ آتے.. ان کا سراغ نہ ملتا تو میری طرف دیکھتے ناراض نظروں سے کہ وہ تھکے ہوئے تھے اور میں ایک چوڑی مسکراہٹ کے ساتھ درّہ گندوگورو کی وادی کی جانب اشارہ کرتا.. اس مقام کی جانب جو ان کے گمان میں بھی نہ تھا.

مجھے خاص طور پر حسن کا انتظار تھا.. اور جب وہ برمانی کی زیرِ نگرانی خیمہ گاہ میں داخل ہوا تو ہم سب نے تالیاں بجا کر اس کا استقبال کیا کہ وہ آج کا "ہیرو" تھا.. بیماری اور نقاہت کے باوجود وہ یہاں تک پہنچ گیا تھا.. اس کے حوصلے اور ہمت کی داد نہ دینا زیادتی ہو گی.. اور اس کے چہرے پر تازگی تھی..

ہم سب ایک قافلے کی صورت خیمہ بستی میں سے گزر کر.. نالے کے پار ہو کر.. اپنے خیموں تک چلے گئے..

اور جب پہنچے تو سب کی تھکاوٹ اور پژمردگی دور ہو گئی.. اور ہر کوئی چہکنے لگا.. حسن ایسے بیمار کا بھی حال اچھا تھا۔ اس کے منہ پر رونق آ گئی تھی..

"کیوں سلمان.. کیسا منظر ہے اور کیا مقام ہے۔" میں نے اسے داد طلب نظروں سے دیکھا..

"اوئے ہوئے.. اعلیٰ سر جی.."

"اور چلو میں تم کہتے تھے کہ سر جی یہیں ہوٹل میں چند روز گزار کر واپس چلتے ہیں، آگے جا کر کیا کرنا ہے۔"

"آپ بھی تو کہتے تھے سر جی.. میں نے تو جھک ماری تھی آپ بھی اقرار کیجیے۔" وہ اتنا پُرمسرت ہو رہا تھا کہ اس نے فوراً کھڑے ہو کر اپنی ہتھیلیاں نیچے کرتے ہوئے اپنا بدن شیک کیا۔ "سر جی بھالو بن کر دکھاؤں؟"

حسن تو ٹھیک ہو چکا تھا لیکن برمانی کی حالت کچھ غیر ہو رہی تھی... کبھی وہ کان میں کھجلی کرتا تھا، کبھی بدن کو کھجانے لگتا.. اور کبھی اپنی گھنی مجرمانہ بھنویں سنوارنے لگتا.. اٹھتا اور ٹہلتا پھر بیٹھ جاتا.. کبھی خیمے کے آگے بیٹھ کر لیلے پیک کو تکنے لگتا اور کبھی سامنے بہتی ندیوں کو پھلانگتا ان کے درمیان کسی پتھر پر جا بیٹھتا اور ہنری مور کے مجسمے "دے تھنکر" کا پوز بنا کر.. سوچ بچار میں گم ہو جاتا..

میاں صاحب بھی اس منظر میں پہنچ کر اتنے راضی ہوئے کہ انہوں نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شاہد کے کندھے پر ایک دھپ لگا کر کہا "خاں صاحب آج آپ بے شک میرے خیمے میں سو جاؤ.. اور بے شک خراٹے پر خراٹا مارو تمہیں ڈر کس کا ہے.. آ ہو.. اجازت ہے۔"

"ہاں بھئی سلمان.. تم یہاں گُڈی نہیں اُڑاؤ گے.. یہ درّہ گندوگورو کا بیس کیمپ ہے۔"

سلمان وہ ورلڈ چیمپئن گُڈی باز ہے جس نے "سنولیک" پر جا کر بھی گُڈی اُڑانے کی کوشش کی تھی.. کہتے ہیں چور چوری سے جاتا ہے، ہیرا پھیری سے نہیں جاتا.. اسی طور ایک لاہوریا بے شک امریکہ اور آسٹریلیا ہو آئے جو کہ سلمان ہو آیا تھا لیکن گُڈی اُڑانے سے باز نہیں آتا۔ اس بار وہ دیسی گُڈی کی بجائے ایک ریڈی میڈ امریکی کائٹ لے کر آیا تھا جو اس نے شاہی پُچھ میں اُڑائی تھی.. یہ کائٹ نے سکس اور کے سیون کی برفوں کے آس پاس تا دیر اُڑتی رہی لیکن اس میں لاہوری گُڈی والا تھرل نہ تھا.. نہ یہ کنی کھاتی تھی نہ بدمعاشی سے کندھے مارتی تھی اور نہ شرلا لے بھرتی تھی۔ بس ایک شریف بی بی کی مانند جسم ہلائے بغیر اُڑتی چلی جاتی تھی.. شاہد صاحب نے بھی اس کی سادہ ڈوری ہاتھ میں لے کر اسے مزید بلند کرنے کی کوشش کی.. اور اس دوران جب ایک جرمن کوہ نورد خاتون قریب سے گزری تو اس نے نہایت حیرت سے اس کائٹ کی اُڑان کو دیکھا تو شاہد صاحب نے فوراً پیشکش کر دی۔ "فلائی کائٹ.. ویلکم لیڈی۔" لیکن لیڈی نے یہ آفر قبول نہ کی بلکہ جواب دینا بھی گوارا نہ کیا اور ایک چڑھی ہوئی تیوری کے ساتھ اپنے خیمے کی جانب چلی گئی..

"تم نے ضرور بے عزت ہونا ہوتا ہے خاں صاحب۔" میاں صاحب اس روز جلال میں تھے۔ "وہ کیا سمجھے گی کہ پاکستانی ایسے ہوتے ہیں۔"

"اور کیسے ہوتے ہیں میاں صاحب۔" شاہد صاحب ترنگ میں تھے اور ابھی نہیں جانتے تھے کہ آج شام انہیں خیمے سے باہر نکال دیا جائے گا۔ "دیکھیں ناں یہ ہمیں ہماری مہمان ہیں اور مہمان نوازی کے کچھ آداب ہوتے ہیں.. میں نے اگر اسے کائٹ اُڑانے کی پیشکش کی تو انہی آداب کے تحت کی.. وہ نہیں مانی تو کیا فرق پڑتا ہے۔"

"ہاں بے عزتی بے شک ہو جائے کیا فرق پڑتا ہے۔" میاں صاحب بڑبڑائے..

اس دوران ایک اور خاتون اُدھر سے گزریں تو شاہد صاحب نے پھر صلح مار دی۔ "گُڈ کائٹ میڈم.. فلائی کائٹ.. پاکستانی کسٹم۔"

یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے کہ اس خاتون نے بھی..

تو اب یہاں گندوگورو کے بیس کیمپ میں بھی ضروری تھا کہ فلائی کائٹ کی جائے اور کم از کم اس لیلے کو تو "بو" کر کے خود ہی لوٹ لیا جائے.. تو میرے اس استفسار پر کہ سلمان یہاں درّہ گندوگورو کے بیس کیمپ میں گُڈی نہیں اُڑاؤ گے.. اس نے نہایت متانت سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں سر جی۔"

"کیوں؟"

"یہ بدتمیزی ہوگی سر.. یہ ایسا منظر نہیں جسے بوکاٹا کیا جائے.. اس میں خلل ڈالا جائے۔" یہ ایک شاندار بھالو فلاسفی تھی..

ہم اپنے خیموں کے آگے میٹرس ڈالے کبھی بیٹھے کبھی لیٹے.. آس پاس کے سفید حُسن کو آنکھوں میں اُتارتے.. بدن پر برف محسوس کرتے نہایت ہائی سپرٹس میں تھے.. اور چونکہ ہم یہاں چندرہ ہزار فٹ ہائی تھے، اس لیے سپرٹس بہت ہی ہائی تھیں..

ہم اتنے سیانے تو تھے کہ ہم خوب جانتے تھے کہ یہاں سے مزید آگے جانا.. کل ہائی کیمپ تک پہنچنا اور پرسوں گندوگورو کی چوٹی سر کرنا ہمارے بس سے باہر تھا۔ اس کے باوجود نہایت سنجیدگی سے چوٹی کو فتح کرنے کے بارے میں تبادلۂ خیال ہوا اور منصوبہ بندی کی گئی..

اور ہاں ہسپاں کے راستے میں مَیں نے دونوں حسینوں میں سے جو اچھا اور مددگار حسین تھا اور کاندے کا تھا، اس کے ساتھ میں نے ایک سازش کی تھی۔ "حسین تم بھی جان چکے ہوگے کہ آج میں گھوڑا ہو چکا ہوں، اس لیے امکان یہی ہے کہ میں اپنے ساتھیوں سے بہت پہلے ہی کیمپ پہنچ جاؤں گا تو آپ بتاؤ کہ وہاں سے وہ ہائی کیمپ کتنا دور ہے جہاں سے گندوگورو کی چوٹی سر کرنے کے لیے نکلتے ہیں اور اس ہائی کیمپ سے بھی پہاڑوں کی سلطنت کی چند خوبصورت ملکائیں دکھائی دیتی ہیں.."

"صاحب ہسپاں سے صرف تین گھنٹے کا سفر ہے اور واپسی صرف ایک گھنٹے میں ہو جاتی ہے.."

"تو پھر حسین میں اور تم کچھ دیر آرام کر کے آگے چلیں گے.. کیا خیال ہے؟"

"چلیں گے سر.."

"کیا خیال ہے میں پہنچ جاؤں گا؟"

"آپ کہتا ہے کہ آپ گھوڑا ہو گیا ہے تو گھوڑے کے لیے تو کوئی مشکل نہیں.."

چنانچہ یہ سازش ہو چکی تھی لیکن ہسپاں پہنچ کر اس سازش کے غبارے میں سے ہوا نکل گئی..

کیونکہ یہاں ہم ایسے منظر میں داخل ہو گئے تھے کہ اسے فوراً چھوڑ کر اوپر چلے جانا.. کسی ہائی کیمپ کی جانب.. جو جانے کتنا ہائی تھا اور گھوڑا ہو جانے کے باوجود.. جانے کتنا ہائی تھا..

ایک کفرانِ نعمت تھا..

اور آپس کی بات ہے اور سچی بات ہے کہ میرا گھوڑا پن... میں جو اسپ تیز رفتار ہوا تھا.. فلائنگ ہارس ہو گیا تھا تو یکدم ہسپاں میں پہنچ کر میری تمام تر ہارس پاور زیرو ہو گئی.. یعنی میری بیٹریاں ڈاؤن ہو گئیں بلکہ ڈاؤن اینڈ آؤٹ ہو گئیں.. پنڈلیوں میں ٹیسیں اُٹھنے لگیں.. پاؤں من من کے ہو گئے اور مجھ میں قطعی طور پر اتنی سکت نہ رہی کہ پھر سے رُک سیک اٹھا کر اس ہائی کیمپ کی جانب چڑھنے لگوں..

"صاحب ہائی کیمپ نہیں چلے گا؟" حسین نے گویا نمک پاشی کی..

"نہیں چلے گا.."

"ہم جانتا تھا کہ نہیں چلے گا۔"

بہر حال گندوگورو کی چوٹی فتح کرنے کے بارے میں نہایت سنجیدگی سے غور و غوض ہوا.. یہ منصوبہ بندی بالکل ایسے تھی جیسے ایک سپاہی اپنے ہتھیار ڈال کر.. وردی اتار کر ایک نیکر میں ملبوس لیٹا ہوا اور فوری طور پر میدان جنگ میں اترنے کی منصوبہ بندی کرنے میں مشغول ہو..

"پہلے تو ہمیں کل ہائی کیمپ تک پہنچنا ہوگا.. پھر پرسوں سویرے بارہ ایک بجے رات کے لگ بھگ گندوگورو گلیشیر کی برفوں پر چڑھتے ہوئے چوٹی کے دامن میں پہنچنا ہوگا.. اور وہاں شاید ہے کہ سامنے ایک برف کی دیوار ہے جیسا کہ سکردو میں ہمیں بتایا گیا تھا.. اس دیوار کے نیچے ہوشے کے چند ہائی پورٹر جنہیں RESCUE کہا جاتا ہے، ہم جیسے ناعاقبت اندیش اور عمر رسیدہ کوہ نوردوں کے منتظر ہوں گے.. وہ ہم سے تین سو روپے فی کس کے حساب سے چارج کریں گے کیونکہ انہوں نے اوپر چڑھنے کے لیے چوٹی تک رسّے لگا رکھے ہیں.. اگرچہ وہ ہماری مدد کریں گے لیکن ان رسّوں کو تھامنا اور ان پر چڑھنا ہمارا ذاتی فعل ہوگا.. اور یاد رہے ایسی برف دیواروں پر چڑھنے کے لیے بوٹوں تلے کرامپون باندھنے ضروری ہیں اور وہ ہمارے پاس ہیں نہیں.. بلکہ میاں صاحب کے پاس تو بوٹ ہی نہیں ہیں بقول شاہد.. بھاٹی گیٹ کے کسی موچی کے چمڑے کی کترنیں ہیں.. بلندی بھی اٹھارہ ہزار فٹ سے زائد ہوگی اور ہم نے آج تک زیادہ سے زیادہ جو سپر درّے کی سترہ ہزار فٹ بلندی ہی تھی اور مرتے مرتے بچے تھے.. تو پھر ان رسّوں کی مدد سے ہم بالآخر چوٹی پر پہنچ جائیں گے.. اگر پھسل کر نیچے گہرائی میں گرنے سے بچ جاتے ہیں تو.. تو وہاں چوٹی سے صبح سویرے زبردست نظارہ ہوگا.. ہم تصویریں اُتاریں گے اور پھر رسّوں کی مدد سے لنگوروں کی مانند

نیچے آئیں گے.. اگر نیچے آئیں گے تو..''

''دفع کریں جی گندوگورو کی چوٹی کو.. میں نے تو پہلے دن کہہ دیا تھا کہ اس کا نام بھی بڑا فحش لگ رہا ہے.. وہاں جا کر کیا کرنا ہے.. مرنا ہے؟.. یہیں ٹھہرتے ہیں اور پکوڑے کھاتے ہیں..''

''پکوڑے؟''

''ہاں جی..'' میاں صاحب نے مونچھوں کو ہلکا سا تاؤ دیا۔'' میں نے ابھی حسین سے بات کی ہے کہ ہمارے پاس بیسن ہے.. نمک مرچ ہے.. بلکہ ہری مرچ ہے.. پیاز اور آلو ہیں تو کیا تم پکوڑے بنا لو گے.. تو وہ کہتا ہے کہ بنالیں گے۔ میں لاہور کے کشمی چوک میں پکوڑے ہی تو بناتا تھا.. تو جناب عالی اس نے کڑھائی چڑھا دی ہے اور تیل چٹاخے مار رہا ہے تو ابھی تھوڑی دیر میں ادھر ہسپاں میں آپ کو گرما گرم پکوڑے ملیں گے.. کاش کہ ہمارے پاس صرف ایک بینگن ہوتا.. بینگن کے پکوڑے تو بادشاہو شاہی پکوڑے ہوتے ہیں..''

''میاں صاحب..'' میں نے موسم اور منظر کا مزا لیتے ہوئے انہیں چھیڑا۔'' ہم اس سے ایک ایسے بلند مقام پر براجمان ہیں.. جس کے پاس کنکورڈیا کے برف زار ہیں.. اپنی شاہ گوری ہے.. چوغولیزا اور مترے پیک ہے.. مشابرم ہے.. اور یہ سامنے ہماری لیلے او لیلے ہے.. پندرہ ہزار فٹ بلندی پر ایک تنہائی ہے جو ساری کی ساری ہماری ہے اور آپ.. پکوڑوں کی بات کرتے ہیں.. حد ہے..''

''کیوں حد ہے..'' میاں صاحب چمک کر بولے۔'' جناب عالی مجھے پتہ ہے کہ آپ اپنا رانجھا راضی کر رہے ہیں.. جانتے ہیں کہ گندوگورو چوٹی پر چڑھنا آپ کے بس کی بات نہیں اور پھر بھی ٹائم ضائع کر رہے ہیں.. منصوبہ بندی کیے جا رہے ہیں..''

''میاں جی.. میری تو ساری عمر ہی رانجھے راضی کرتے گزری ہے.. کوئی ایک رانجھا راضی ہو جاتا ہے تو میرا ہاتھ تھام کر سنولیک تک لے جاتا ہے.. پاک سرائے دکھا دیتا ہے اور اگر کوئی بھی رانجھا راضی نہیں ہوتا تو میں اپنے گھر میں قید ہو جاتا ہوں.. تو آپ مجھے اپنا رانجھا راضی کرنے دیں، آپ کا کیا جاتا ہے..''

''کچھ بھی نہیں جاتا..''

''ویسے وہ اوپر والا رانجھا راضی ہو جائے تو سب کچھ ہو جاتا ہے.. ہم گندوگورو کی چوٹی پر بھی پہنچ سکتے ہیں.. وہ اپنی ونجلی پر ہمیں ایک میٹھی تان سنا دے تو ہم اس کی دھن پر جھومتے

ہوئے.. گندوگورو تو کیا کے ٹو پر بھی چڑھ جائیں.. کیا خیال ہے..''

''سر جی..'' سلمان نے دخل در نامعقولات کیا۔'' کچھ تجریدی سی.. رومانی سی گفتگو شروع ہو گئی ہے.. آپ رانجھے کو چھوڑیں کسی ہیر کو راضی کریں..''

''رانجھا تو بے پروا ہے.. وہی بے پروا جس کے ساتھ دل لگ جاتا ہے.. ہیر کو راضی کرنا البتہ مشکل ہے۔''

میاں صاحب بور ہو گئے۔'' آپ نے جس کو بھی راضی کرنا ہے کریں.. میں پکوڑوں کا نمک مرچ چیک کر کے آتا ہوں۔''

اور تھوڑی دیر کے بعد جب سردی پندرہ ہزار فٹ بلند ہسپاں پر اُتر تی تھی.. ہمارے سانسوں کو سفید کرتی تھی تو ایک طشت میں سجے گرما گرم.. بھاپ دیتے.. دروگندوگورو کے دامن میں.. اس کی وادی میں.. لیلے پیک کے آمنے سامنے.. پکوڑے آئے.. ٹماٹو کیچپ کے ساتھ تو ہم سب کچھ منظر و نظر بھول گئے کہ ان پکوڑوں کا ذائقہ جنت کے میووں ایسا تھا.. اور ان میں خوبی یہ تھی کہ میٹھے نہ تھے، نمکین اور چٹ پٹے تھے..

حسن صاحب حسب معمول اپنی صحت کے بارے میں احتیاط پسند.. تشویش میں مبتلا فوراً اپنی منرل واٹر کی بوتل خیمے سے نکال لائے۔'' سر جی یہ پورٹر جو پانی ہمیں پلا رہے ہیں، کہتے تو یہی ہیں کہ چشمے کا ہے لیکن میں نے دیکھا ہے کہ یہ سامنے والے گدلے تالاب میں سے بھر بھر کر لا رہے ہیں.. اس میں مٹی کے علاوہ پتہ نہیں کیا کیا ہے تو احتیاط کیجیے۔''

''حسن صاحب میں نے کبھی کسی معاملے میں احتیاط نہیں کی.. برالدو اور شیوک کا پانی پیا ہے.. بچپن میں گلمنڈی کے جوہڑوں میں نہاتے ہوئے ان کا پانی بھی حلق سے اُترا ہے، مجھے کچھ نہیں ہوتا..''

''تب کچھ نہیں ہوتا تھا.. اب تو اپنی عمر کا خیال کریں.. احتیاط کریں۔''

''کیسے احتیاط کریں؟''

''صرف یہ منرل واٹر پئیں جو میں لاہور سے اتنی احتیاط سے اور سنبھال کے لایا ہوں.. مان جائیں۔''

چنانچہ میں مان گیا اور احتیاط کی..

پورٹروں کے فراہم کردہ گدلے پانی سے اجتناب کیا اور صرف منرل واٹر کے سفید

گھونٹ بھرے اور پکوڑے کھائے.. بلکہ بقول میاں صاحب پکوڑے کھائے..

یہ ایک عجیب سرمست مدبھری کیفیت تھی..

ہسپاں کی آلودہ بھیڑ بھری خیمہ بستی سے ہمارا کوئی واسطہ نہ تھا.. ہم گندوگورو کی وادی کے واحد مہمان تھے.. ندیوں کے کناروں پر.. برفیلی ابھار والی چوٹیوں کے سامنے ہم بیٹھے تھے اور.. پکوڑے کھا رہے تھے۔

ہر ٹریک کے دوران کم از کم ایک ایسی شام آجاتی ہے جو ساری مشقتیں اور کلفتیں بھلا دیتی ہے اور کہتی ہے کہ.. کیا میں تمہاری پوری زندگی کے لیے کافی نہیں ہوں.. تمہیں اور کیا چاہیے.. میں.. یہ شام پیرس کے قدیمی نائٹ کلب مالن روژ میں.. روم کے ویا وینیٹو میں.. سٹاک ہوم کے تنگز گارڈن.. لندن کے پکاڈلی سرکس.. وینس کے گنڈولوں اور لاہور کی مال روڈ پر بھی نہیں اُتری.. صرف اس لمحے پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر درہ گندوگورو کے دامن میں.. لیلے پیک کے سامنے صرف تم پر اُتری ہوں تو تمہیں اور کیا چاہیے..

اور کم از کم مجھے تو کچھ اور نہیں چاہیے تھا..

یکدم شام گہری ہوگئی..

نالے کے پار ہسپاں کی پُرہجوم بستی کے خیمے تاریکی میں چلے گئے اور وہاں کچھ لالٹینیں روشن ہوگئیں..

شام گہری ہوئی تو بے حد سرد بھی ہوگئی..

اس کی سردی ہمیں بے آرام کرنے لگی..

ہم ٹھٹھرنے لگے..

ہم بدستور پکوڑے کھاتے جاتے تھے اور ٹھٹھرتے جاتے تھے..

نالے کے پار ہسپاں کی خیمہ گاہ میں کچھ اور لالٹینیں روشن ہونے لگیں..

ان کے عکس ان پانیوں پر تھے جن میں لیلے پیک کی برفیں اُتری ہوئی تھیں.. اور جب ہمارے بدنوں نے دوہائی دے کر ہمیں خبردار کیا کہ اگر تم مزید اسی شام میں.. اور اتنی بلند شام میں یونہی پکوڑے کھاتے رہو گے تو پچھتاؤ گے.. یونہی حنوط ہو جاؤ گے.. ایسی حالت میں اگلی سویر دریافت ہو گے کہ تمہارے ایک ہاتھ میں پکوڑا ہوگا اور دوسرے ہاتھ میں کچھ بھی نہ ہوگا.. تو ہم اُٹھے اور بمشکل اُٹھے۔ سردی سے کڑکڑاتے بدنوں کو سنبھالتے اٹھے اور اپنے خیموں میں چلے گئے.. اور

جب ایک بار خیموں میں چلے گئے تو پھر دوبارہ باہر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا چاہے باہر ہیر اپنے رانگلے پلنگ پر لیٹی آمادۂ وصال ہی کیوں نہ ہو..

اتنی سردی میں وصال کی خواہش بھی سکڑ جاتی ہے..

ہم نے اپنے خیموں میں ہی رات کھانا کھایا.. سویٹر اور جیکٹیں پہن کر اپنے سلیپنگ بیگز میں سمٹ کر.. کپکپاتے ٹھٹھرتے نیند میں جانے کی کوشش کرنے لگے..

"ہسپاں کی رات.. اور لیلیٰ پر ستارے گرتے تھے"

اس شب میں بے حد خوفزدہ ہوا..

میں اگرچہ درّہ ہسپر کی ٹاپ پر رات گزار چکا تھا جو ہسپاں سے دو ہزار فٹ زیادہ بلند تھا لیکن وہ گئے زمانوں کے قصے تھے..

میں خوفزدہ صرف اس خیال سے ہوا کہ کہیں اس بلندی پر دل کے راستے میں کوئی اٹک نہ آ جائے.. کسی شریان میں کوئی رکاوٹ نہ آ جائے کہ سانس بھی رکاوٹ سے اٹک اٹک کر آتا تھا.. رکتا تھا اور اسے کھینچنا پڑتا تھا.. اور میں پوری شب اپنے آپ کو تسلی دیتا رہا کہ نہیں.. جو کچھ ہونا ہے اس بلندی پر.. ایک نامعلوم درّے کی وادی میں تو نہیں ہونا.. اگر دل نے رکنا ہے.. کچھ نہ کچھ ہونا ہے تو براہِ کرم تھوڑا انتظار کرے.. ذرا مہلت دے اور لاہور واپس پہنچنے پر جو دل کے دل میں آئے بے شک کر لے..

مجھے نہیں معلوم تھا کہ برمانی بھی اسی کیفیت میں مبتلا ہے اور پوری شب خیمے سے باہر ٹہلتا رہا ہے.. ورنہ کچھ تسلی ہو جاتی کہ جو میرا حال ہے وہ سب کا حال ہے..

ویسے بلندی پر اگر بے چینی اور بے اطمینانی کی کیفیت ہو تو لیٹے رہنا مناسب نہیں ہوتا.. اُٹھ کر بیٹھ جائیں یا اس سے بہتر ہے کہ خیمے سے باہر نکل کر ٹہلنے لگیں تو قدرے افاقہ ہو جاتا ہے.. طبیعت سنبھل جاتی ہے..

میں نے وہ شب شدید ڈر اور موت کی قربت کے خوف میں گزاری..

ایک اور خدشہ تھا..

نہایت عامیانہ اور انسانی خدشہ.. کہیں اس منجمد رات میں مجھے مجبوراً خیمے سے باہر نہ نکلنا

پڑے.. کہیں مثانے پر اتنا دباؤ نہ پڑ جائے کہ میں رہ نہ سکوں.. اپنے آپ پر کنٹرول کرنا ممکن نہ ہو اور خیمے سے باہر جانے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ ہو..

اور یہی ہوا..

اگرچہ میں نے پیش بندی تو بہت کی تھی.. چائے نہیں پی تھی.. خیمے میں جانے سے پیشتر اپنے آپ کو فارغ کیا تھا لیکن اس سرد مہری کی شب میں ایک لمحہ آ ہی گیا جب تمام تر ضبط کے باوجود اس بے اختیاری نے مجھے بے اختیار کر دیا اور میں اپنے سلیپنگ بیگ میں سے سرکتا ہوا حسن اور سلمان کے درمیان میں سے جھکتا ہوا خیمے سے باہر آ گیا..

باہر آ کر میں نے ذرا دور جانے کا تردد نہ کیا..

کہ باہر ایک شدید سرد مہری تھی.. ایک چپ منجمد برفانی سکوت تھا..

وہ طشتری ابھی تک گھاس پر پڑی تھی اور اس میں بچے ہوئے چند پکوڑے سردی سے پتھر ہو رہے تھے..

میں نے دور جانے کا تردد نہ کیا اور ٹھٹھرتے ہوئے اس پریشر سے نجات حاصل کی جس نے مجھے باہر آنے پر مجبور کر دیا تھا..

خیمے کے اندر واپس جانے سے پیشتر جونہی میں نے آس پاس نگاہ کی.. تو میں سردی سے نہیں حیرت سے منجمد ہو گیا.. مجھے احساس ہوا کہ رانجھا مجھ سے راضی ہو گیا تھا اور اسی نے پریشر کا یہ بہانہ میرے لیے تخلیق کیا تھا تا کہ میں خیمے سے باہر آؤں اور اسی سرد رات میں اس کی سفید قدرت کا مشاہدہ کروں.. جو کچھ اس نے تخلیق کیا تھا.. اسے دکھانے کے لیے اس نے مجھے اپنے خیمے سے باہر نکالا تھا..

اس لیے کہ اس نے.. میرے رانجھے نے وہ سب کچھ.. وہ بلندیاں، برفیں، سکوت.. لیلےٰ.. ندیاں اور یہ رات صرف میرے لیے بنائی تھیں..

میرے لیے بنائی تھیں تو وہ کیسے مجھے نہ دکھاتا..

ہسپاں کی خیمہ گاہ کی سب لالٹینیں گھپ اندھیرے میں بجھ چکی تھیں..

لیلےٰ پیک پر ایک نابینا تاریکی کا راج تھا اور اس اندھیرے راج میں ستارے اُترتے تھے اور ٹوٹتے تھے..

اور سامنے برفیلی چوٹیوں پر جو آسمان تھا، اس میں ابھی ابھی چند ستاروں نے جنم لیا تھا،

روشنی حاصل کی تھی اور ابھی ٹوٹتے گم ہوتے تھے..

برفیں بلند سیاہ رات میں مجھے گھیرے ہوئے اور اُن پر ابھی ابھی جنم لینے والے ستاروں کی روشنی..

سرد.. بلند.. ستاروں سے اَٹی رات.. جو سردی کے باوجود بجھتے نہ تھے، بھڑکتے تھے اور ان میں سے کوئی ایک ٹوٹتا تھا اور راکھ ہوتا تھا..

یہ درست کہ میں ہائی کیمپ تک نہیں جا سکا تھا.. گندوگورو کی چوٹی پر نہیں پہنچ سکا تھا لیکن یہ بھی تو درست کہ آسمانوں میں اتنے ستارے دیکھنا اور ان میں سے کچھ کو لیلے پیک پر گرتے دیکھنا.. اس کی برفوں میں گم ہوتے دیکھنا.. ایک خوش بختی ہے..

لیلے پیک کے عین اوپر ایک ستارہ بکھرا ایک روشن لکیر تاریک آسمان میں چھیدتا راکھ ہو گیا..

میں نے اس رات میں خیمے کے باہر کھڑے ہسپاں کی رات میں اپنے آپ کو اس ستارے میں محسوس کیا.. کہ میں اگرچہ آسمانوں میں چھید نہیں کر پایا تھا لیکن درّہ گندوگورو کی اس رات کے حُسن کی تاب نہ لا کر.. بہر طور راکھ ہو گیا تھا.. اور اس راکھ کو میں نے ایک عمر کریدنا تھا.. کہ کہیں اس میں ایک چنگاری لیلے کی مل جائے..

میں نے ایک عمر اس راکھ کو کُریدنا تھا..

لیلے پیک کے اوپر ستارے یوں گرنے لگے جیسے پروانے بھسم ہو کر گرتے ہیں..

میں ابھی ایک ستارہ تھا اور ابھی وہ پروانہ تھا جو لیلے پر گرتا راکھ ہوتا تھا..

"لاہور کی سویر.. اور باقی رہ گیا ایک.. میں!"

ویگن فیروز پور روڈ کے شور میں تھی..

لاہور کی نہر میں گرمی کے مارے ہوئے ننگ دھڑنگ بچے چھلانگیں لگا رہے تھے..

برمائی گُم تھا..

اُس کے ذہن میں جانے کونسی فلم چل رہی تھی.. وہ اپنی سیاہ آنکھیں اور مجرمانہ بھویں اگرچہ لاہور کی بے ہنگم ٹریفک پر رکھتا تھا لیکن وہ اسے دیکھ نہیں رہا تھا.. اپنے ذہن کے پردے پر جو فلم چل رہی تھی، اُسے دیکھ رہا تھا..

ہم بھی جو ویگن میں رہ گئے تھے، ویگن میں نہیں تھے کہیں اور تھے.. ہمارے ذہن کی سکرین پر بھی درّہ گندوگورو کے سفر کی ایک ڈاکومنٹری چل رہی تھی..

کلمہ چوک میں ایک پتھریلا ہاتھ اٹھا ہوا تھا.. اسے کسی مُغنیہ کے ہاتھ سے تشبیہ دی جاتی تھی.. ہمیں اس میں سے لیلے پیک اُبھرتی دکھائی دینے لگی..

برمائی لاہور کی نہر میں بہتا تھا اور بہتا جاتا لیلے کے گلے جا لگتا تھا.. ہم سب کی آنکھیں کھلی تھیں اور جو کچھ سامنے تھا، اسے نہیں دیکھ رہی تھیں، دل کے بھیتر میں جو فلم چل رہی تھی، اسے دیکھ رہی تھیں.. بلند چٹان پر براجمان سُرخ جوڑے میں ملبوس ایک جل پری..

شاید وہ خود بھی پتھر کی تھی لیکن اس کا سُرخ پیراہن ہوا میں پھڑ پھڑاتا جا رہا تھا..

شائی چُو کی رات.. رات میں رقص..

دل سنگ پار کے ستارے.. مشابرم سے باتیں..

ملتان جانے والی بس کی روانگی میں ابھی کچھ دیر تھی..

"تارڑ صاحب.. برمانی کو میرے ہاں ڈراپ کر دیں.. یہ کچھ تازہ دم ہو لے..ذرا نارمل ہو جائے تو پھر میں اسے یہاں چھوڑ دوں گا.."

عامر کے گھر کے آگے بلند بوتل پام کے درختوں کے عقب میں سے کچھ گن مین اور پہریدار نکلے اور عامر اور برمانی کا سامان ویگن میں سے اُتارنے لگے..

شاہد بھی اپنے گھر کے گیٹ کے سامنے خاموشی سے اُتر گیا..

باقی رہ گیا ایک..

وہی ایک جو اس سارے فساد کی جڑ تھا... میں!

"گندوگورو کے میراثی.. ہائے اوئے!"

وہ بھی ایک عجیب سویر تھی..

ہسپاں میں وڑہ گندوگورو کی وادی میں جو سویر تھی.. عجیب تھی..

میں اس سویر کو دیکھ نہیں رہا تھا، اپنے خیمے میں سلیپنگ بیگ میں لیٹا اس سویر کو سُن رہا تھا.. ایک سویر کیسے بول سکتی ہے؟

اگر سویر نہیں تو اسے دیکھنے والے تو بول سکتے ہیں..

اور وہ بول رہے تھے..

سب سے بلند بولی سلمان کی تھی.. ہائے اوئے...

اور یاد رہے کہ جیسے مسٹر بکس والا یوسف کسی منظر یا چہرے کو دیکھ کر بے قرار ہو کر "یہ تو غدر ہے" کا نعرہ لگاتا تھا، اسی طور سلمان ایسے موقعوں پر دل پر ہاتھ رکھ کر ایک شدید لاہوری "ہائے اوئے" کرتا تھا..

چنانچہ یہ اس سویر میں سلمان کی پہلی "ہائے اوئے" تھی..

"اوئے بھالو.. کیوں شور مچا رہے ہو؟" میں سلیپنگ بیگ کی بُکل میں سے بولا..

"تارڑ صاحب ہائے اوئے.. لیلے پیک پر ابھی ابھی سورج کی کرنیں اُتری ہیں اور اس پر سویر کے سنہرے پن کا اثر ہو رہا ہے.. سرچی سُستی اور نامردی کو ترک کر کے باہر آ کر تو دیکھیں کہ لیلے کیسے ہولے ہولے سنہری ہو رہی ہے.. ہائے اوئے.."

"بچے تم اپنی رننگ کومنٹری جاری رکھو.." میں نے اپنے سلیپنگ بیگ میں مزید سکڑتے ہوئے پکارا کہ سردی ابھی پورے جوبن پر تھی.. بیگ میں سے ہاتھ نکالتا تھا تو برف ہو جاتا تھا.. "میں سُن رہا ہوں.."

''سر جی.. میں کیمرے کے لینز کو لیلے پیک پر زوم ان کرتا ہوں تو یوں لگتا ہے کہ یہ لینز لیلے کا بوسہ لینے کو ہے.. ہائے اوئے..''

''بیان جاری رہے..''

''سر جی آپ نے نور جہاں کا وہ گیت تو سنا ہوگا کہ.. سونے دی توتڑی.... جے میں ہوندی ڈھولنا ہوندی ڈھولنا سونے دی توتڑی.. تو سر جی میرا دل بھی یہی چاہ رہا ہے کہ میں اگر یہ زوم لینز ہوتا تو لیلے پیک کی سنہری ہوتی برفوں کے بوسے لے رہا ہوتا بقلم خود..''

''بے چاری لیلے پیک''

''ہائے اوئے..''

میاں صاحب کے چہکنے کی آوازیں بھی مجھ تک آ رہی تھیں.. یقیناً وہ اسی اُدھار شدہ وڈیو کیمرے کو گندو گورو کی سویر کے منظر پر بے دریغ گھما رہے تھے اور اس کے ساتھ آہیں بھی بھرتے جاتے تھے۔ ''ہائے ہائے تارڑ صاحب باہر بڑا نامہ نیم منظر ہے.. نظارہ کرنا ہے تو آ جاؤ..''

شاہد کی آواز بہت دیر بعد آئی کیونکہ وہ اپنے کیمرے کا اپرچر اور سپیڈ سیٹ کرنے میں جتنی دیر لگاتا تھا اتنی دیر میں وہ منظر اکتاہٹ سے پہلو بدلنے لگتا تھا کہ میاں اب تصویر اُتار بھی چکو مجھے دنیا میں کچھ اور کام بھی ہیں.. تو اس کی آواز دیر آید نادرست آید ''مائی لیڈر.. رب سوہنے کی شان دیکھنی ہے تو باہر قدم رنجہ فرمائیں..''

البتہ برماتی کی آواز نہیں آ رہی تھی.. شائد وہ بھی میری طرح پچھلی شب کی بے خوابی کی کسر نکال رہا تھا..

لیکن وہ وہاں تھا..

یہ اطلاع پھر سلمان کی جانب سے آئی۔ ''ڈاکٹر جی آپ.. آپ بھی تو کچھ بولو..''

تو بالآخر وہ بولا۔ ''ہم کیا بولیں سائیں.. ہم تو مرشد کے آگے گونگے ہو کر بیٹھتے ہیں.. محبوب کے سامنے کلام کرنے کی جرأت نہیں رکھتے.. لیلے سامنے ہے تو گفتار کیسے کریں..''

''ہائے اوئے..'' سلمان نے پھر نعرہ لگایا..

''اب کیا ہائے اوئے؟'' یہ سب لوگ مجھے ہی باہر نکالنے پر کیوں تلے ہوئے ہیں..

''سر جی کم از کم اپنے خیمے کی چلمن اٹھا کر ایک نظر لیلے پر ہی ڈال لو.. وہ گندو گورو کی اس برف پٹی کو ہی دیکھ لو جس پر سے کچھ کوہ نورد رسّوں سے لٹکتے نیچے آ رہے ہوں گے.. یاد ہے

سکردو میں ہمیں بتایا گیا تھا کہ صبح سویرے اگر آپ کے پاس دوربین ہو تو یہاں سے ان خوش نصیبوں کو دیکھا جا سکتا ہے جو گندو گورو چوٹی سر کر کے نیچے آ رہے ہوتے ہیں.. رسّوں سے لٹکتے.. ایک جھاتی باہر بھی مار لو سر جی.. ہائے اوئے!''

میں نے اپنے برابر میں نیم خوابیدہ حسن صاحب کے کھلے منہ کو دیکھا اور چونکہ ان کی آنکھیں ابھی نہیں کھلی تھیں، اس لیے ان کے منہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''حسن صاحب.. شاہ جی..''

''ہاں جی..'' وہ نیند میں ہی مسکراتے ہوئے معصومیت سے بولے..

''سید بادشاہ باہر حشر برپا ہے.. ہسپاں میں سویر ہو رہی ہے اور برف بلندیاں آہستہ آہستہ سنہری ہو رہی ہیں.. اور جتنے بھی بین الاقوامی شہرت کے حامل فوٹوگرافر حضرات ہیں، وہ اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دھڑا دھڑ تصویریں اُتار رہے ہیں آپ بھی تو ایک نئے نکور کیمرے کے مالک ہیں.. باہر نکلیے اور تصویریں اتاریے..''

''میں لاہور پہنچ کر شاہد کی کھینچی ہوئی تصویریں دیکھ لوں گا..'' انہوں نے آنکھیں کھولے بغیر کہا۔ ''سونے دیں سر..''

''شاہد کی کھینچی ہوئی تصویروں کا کچھ پتہ نہیں چلتا.. جب تک کہ وہ خود نشاندہی نہ کریں کہ جناب یہ پہاڑ ہے اور یہ برف ہے کچھ پتہ نہیں چلتا.. آپ یہ رسک نہ لیں باہر جائیں۔''

''تو پھر میں سلمان کی تصویریں دیکھ لوں گا اس سویر کی.. وہ تو آسٹریلیا سے کیمرہ لے کر آیا ہے..'' ایک طویل جمائی ان کے کھلے منہ سے برآمد ہوتی گئی..

''شاہ جی آسٹریلیا میں صرف کنگرو اور کوالا ریچھ ہوتے ہیں یا پھر فضول سے آسٹریلین ہوتے ہیں جن کے آباؤ اجداد مجرم تھے تو وہ کیمرہ کرافٹ کیا جانیں.. آپ خود باہر نکلیں۔''

حسن اونگھ رہے تھے'' ..میں جی.. میں.. میاں صاحب کی اُتاری ہوئی مووی دیکھ لوں گا.. سونے دیں۔''

''وہ تو پہلی بار ایک مووی کیمرہ آپریٹ کر رہے ہیں.. کیا پتہ کیا نتائج برآمد ہوں..''

''آپ چپ کیوں نہیں کرتے چودھری صاحب..'' حسن صاحب اس ٹریک میں پہلی بار ذرا تاؤ میں آ کر بولے اور ایک آنکھ کھول کر بولے۔ ''آپ مجھے ہلا شیری دیے چلے جاتے ہیں کہ باہر جاؤ، باہر جاؤ.. خود کیوں نہیں جاتے..''

''دراصل..'' میں نے کھسیانے ہو کر کہا۔ ''مجھے تو سلمان اور دیگر تصویر کش حضرات

پر اعتبار ہے.."

"کیا مطلب؟"

"ایک کافر ادا اور فن موسیقی میں تاک مغنیہ گاتی چلی جاتی تھی اور ایک میرا جیسا کور ذوق سامنے بیٹھا اونگھتا جاتا تھا تو مغنیہ نے اسے جھنجوڑ کر نہایت غصے سے کہا۔ "چوہدری صاحب میں غزل گا رہی ہوں اور آپ سو رہے ہیں.." تو چوہدری صاحب نے ایک طویل جمائی لے کر کہا۔ "بی بی تم گاتی رہو.. مجھے تم پر اعتبار ہے۔"

"یقیناً یہ چوہدری صاحب آپ ہی تھے.." حسن نے بیزار ہو کر کہا۔ "اب چپ کر کے لیٹے رہیں یا باہر نکل جائیں، مجھے ڈسٹرب نہ کریں۔"

"ہائے اوئے.." سلمان کا ایک اور نعرہ ہائے اوئے بلند ہوا..

اس کے بعد میں اور حسن صاحب مشترکہ طور پر میراثی ہو گئے اور اونگھتے اونگھتے سو گئے اور جب بیدار ہوئے.. اور تب بیدار ہوئے جب ہیں کیمپ وزو گندو گورو پر تیز دھوپ اُتر چکی تھی..

بچپن میں.. گاؤں میں گزارے ہوئے بچپن میں.. جب ہم دیر تک.. دن چڑھے تک چھت پر سوتے رہتے تھے تو میری امی ہمیشہ ڈانٹتی تھیں کہ مستنصر کیا میراثیوں کی طرح دھوپ چڑھنے تک سوتے رہتے ہو.. کیونکہ ان زمانوں میں گاؤں کے کوٹھوں پر.. اپنے کچے گھروں کی چھتوں پر سونے والے کسان منہ اندھیرے اُٹھ کر ہل جوتنے کے لیے کھیتوں کو چلے جاتے تھے اور پورے گاؤں میں صرف میراثیوں کے دو چار کوٹھے ایسے ہوتے تھے جن پر بچھی چارپائیوں پر یہ فنکار حضرات اور ان کے خاندان دھوپ چڑھنے کے باوجود کھیس اوڑھے مزے سے سو رہے ہوتے تھے.. اس لیے کہ انہوں نے کہیں نہیں جانا ہوتا تھا.. اپنا رزق محض باتوں سے کمانا ہوتا تھا..

یہ الگ بات کہ ایک ایسا زمانہ آیا جب میرے جیسے عجیب الطرفین کسان اور چوہدری حضرات ٹیلی ویژن پر اداکاری اور میزبانی کرتے کرتے کسی حد تک میراثی ہو گئے اور اپنا رزق باتوں سے کمانے لگے..

تو جناب میں اور حسن صاحب بھی اس سویر میراثی ہو گئے.. دیر تک سوتے رہے اور بھری دھوپ میں اُٹھے..

ویسے گندو گورو کے مناظر میں اگر انسان سیّد اور چوہدری سے میراثی ہو جائے تو بھی یہ گھاٹے کا سودا نہ تھا..

"پندرہ ہزار فٹ بلند برفانی کارواں سرائے سے کُوچ"

ہم خیموں سے باہر آئے تو ہمارے اوپر ڈھلوان پر جو پگڈنڈی تھی اس پر سے پورٹر اُتر رہے تھے..

یہ پورٹر ان کوہ نوردوں کی ایڈوانس پارٹی تھے جو چوٹی سر کرنے کے بعد نیچے ہسپاں میں آ رہے تھے..

ان پورٹروں کو دیکھ کر ایک مرتبہ پھر ہم میں یہ خواہش بیدار ہوئی کہ ہم یہیں ہسپاں میں ٹھہر جائیں.. آج واپس جانے کی بجائے ہائی کیمپ تک پہنچیں اور کل اپنی جان کی بازی لگا کر چوٹی پر پہنچنے کی کوشش کریں..

لیکن ہم سب کی مجموعی صحت اس لائق نہ تھی.. ہم جان کی بازی لگانے سے بھی جھجکتے تھے اور جپو میں جس ویگن کو چھوڑ آئے تھے، اُس کے میٹر پر ڈھائی ہزار روپے روزانہ کا کرایہ بڑھتا جاتا تھا.. چنانچہ اقتصادی پابندیاں بھی عائد تھیں.. ویسے بھی یہ ایک برفانی خودکشی ہوتی..

"سر جی اب باہر آئے ہو تو کیا فائدہ.." سلمان کچھ خفا سا تھا۔ "یہ سامنے والی ندی میں جو سنہری سائے تھے وہ تو دھوپ اُترنے سے بہہ گئے.. سویرے سویرے یہ سامنے والی ساری کی ساری برف پوش چوٹیاں شرمیلی سنہری ہو رہی تھیں اور اب عیاں اور برہنہ ہو گئی ہیں.. کیا فائدہ؟ آپ دونوں حضرات اب خیموں کی لُک آفر کریں، ہم ان ندیوں کے پار جو پتھروں کا علاقہ ہے وہاں کوئی پائی پیس تلاش کرتے ہیں کیونکہ پیٹ بڑھ رہا ہے۔"

ناشتے کے دوران.. ڈھیلے اور چربیلے پراٹھوں کے ساتھ فرائی انڈوں کا ناشتہ کرتے ہوئے.. آج کہاں پہنچنا ہے.. واپسی پر رات کہاں کریں گے.. کے بارے میں گفتگو ہونے لگی..

اصولی طور پر تو دل سنگ پا.. اور کہاں..

لیکن سلمان نے ایک آئیڈیا پیش کیا.. "تمام گائیڈ بکس یہ کہتی ہیں کہ ہسپاں سے واپسی پر چونکہ اُترائی ہے، اس لیے آسانی سے دو منزلیں طے کی جا سکتی ہیں یعنی دل سنگ پا سے گزر کر آگے شائی چو میں پہنچا جا سکتا ہے.."

"اس مارا ماری مسافت کا فائدہ؟"

"ایک تو یہ کہ ویگن کا ایک دن کا کرایہ مبلغ ڈھائی ہزار روپے بچ جائے گا اور دوسرے یہ کہ ہم ایک روز پہلے اپنے اپنے گھروں میں پہنچ جائیں گے.."

"ہم میں جو شادی شدہ ہیں، انہیں اپنے اپنے گھروں میں ایک روز پہلے پہنچنے کی کوئی جلدی نہیں.." یہ سب کے دل کی آواز تھی..

"اگر ہم ایک روز پہلے پہنچ جاتے ہیں تو ہو سکتا ہے کہ میں اپنے چھوٹے بھائی کو خدا حافظ کہہ سکوں جو امریکہ جا رہا ہے.. کوشش کر دیکھتے ہیں ورنہ دل سنگ پا سے آگے بھی تو ایک کیمپ سائٹ ہے، وہاں رات گزار لیں گے اور کل ہوشے پہنچ جائیں گے.."

"پابندی کوئی نہیں ہے.." یہ میاں صاحب نے کہا۔ "ہسپاں سے سیدھا شائی چو جانا تو قتل و غارت ہے... دیکھتے ہیں کہ کہاں تک پہنچتے ہیں۔"

چونکہ میں کل ایک گھوڑا تھا، اس لیے آج بھی مجھے توقع تھی کہ میں گھوڑا ہی رہوں گا.. چنانچہ مجھے کوئی اعتراض نہ تھا..

تب سلمان نے خطرے کا ایک بگل بجایا۔ "سر جی.. دل سنگ پا سے آگے جو پہلے چڑھائی تھی اور اب اُترائی ہوگی تو وہاں سے بھی تو اُترنا ہوگا۔"

"اُتر جائیں گے۔" حسن صاحب نے سر ہلایا..

"اور آج ذرا آسمان پر نظر کیجیے کہ ہلکے ہلکے بادل ہیں تو وہاں اس اُترائی کے دوران اگر بارش ہوگی تو ہم کیسے نیچے اتریں گے.. لڑھکتے ہوئے پتھروں کے شکار ہو جائیں گے.. ہم پر حدود آرڈیننس لگ جائے گا اور سنگسار ہو جائیں گے.. وہاں سے نکلیں گے تو گندو گورو گلیشیئر کے کناروں پر جو راستہ ہے.. جس کے اوپر مٹی میں پھنسی سینکڑوں چٹانیں ہیں وہ بھی تو بارش کی وجہ سے ڈی لوکیٹ ہو سکتی ہیں.. ہم پر گر سکتی ہیں.. اگر بارش ہوگی تو کیا یہ بہتر نہیں کہ وہ اُترائی اور وہ راستہ آج ہی سمیٹ دیا جائے.."

سلمان کسی بے راہ رو قوم کو فنا کی خبریں سنانے والا پیغامبر لگتا تھا..

چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ ٹھیک ہے سفر کا آغاز کرتے ہیں.. اور جب دل سنگ پا پہنچیں گے تب یہ فیصلہ کریں گے کہ ہم میں مزید آگے جانے کی سکت ہے یا نہیں..

ایک ایک کر کے جب ہمارے خیمے ایک پیراشوٹ کی مانند زمین پر گرے تو ہمیں بے حد قلق ہوا..

ایک قلق تو یہی ہوا کہ یہ ہماری کوہ نوردی کی آخری منزل تھی اور اب ہمیں الٹے پاؤں انہی راستوں پر چل کر واپس ہونا تھا جہاں سے ہم آئے تھے.. وہی منظر.. وہی بلندیاں.. وہی پتھر.. دوبارہ نظروں کے سامنے آئیں گے.. ان میں کوئی اجنبیت کوئی سحر کوئی سسپنس نہیں ہوگا..

اگرچہ واپسی پر ہمیشہ منظر بدلتے ہیں.. جن کی جانب آپ کی پُشت ہوتی ہے، آتے ہوئے تو وہ سامنے ہوتے ہیں جاتے ہوئے.. لیکن سب کچھ جانا پہچانا ہوتا ہے.. اس میں کوئی تھرل نہیں ہوتا..

لیکن زیادہ قلق اس بات پر ہوا کہ... ہائے اوئے ہم یہ سپاٹ.. گندو گورو کی یہ وادی اور لیلے پیک کا آمنا سامنا آج خالی کر دیں گے تو آج شام یا کل کوئی اور ہوگا جو یہاں خیمہ زن ہو جائے گا.. جیسے ایک صحرا نورد ادیب کے بارے میں اس کے حاسدوں نے.. ادبی مافیا نے یہ روایت گھڑ رکھی تھی کہ ایک قومی اعزاز ملنے پر اس نے کہا تھا کہ مجھے یہ اعزاز ملنے پر بے حد مسرت ہوئی ہے لیکن مجھے یہ دکھ ہے کہ اگلے برس یہی اعزاز کسی اور کو مل جائے گا..

ورنہ یہ ایسے حاسد اور بانجھ ادیب ہیں جو ہر برس کوئی نہ کوئی اعزاز حاصل کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں اور حکام بالا کے تلوے چاٹ چاٹ کر انہیں رام کر لیتے ہیں.. ایسے گدھ جو دوسروں کا رزق کھا جاتے ہیں..

ڈھلوان پر پتھریلی آماجگاہوں کے آس پاس جو نیلے ڈرم سجے تھے، اب وہ وہاں نہیں تھے..

ہسپاں کی خیمہ بستی میں جو خیموں کی رونق تھی، وہ اُجڑ چکی تھی اور اس کی ریت پر ان کی کچھ نشانیاں تھیں.. خالی ڈبے.. پیکٹ.. آلودہ ٹائلٹ پیپر.. پلاسٹک کے لفافے.. ٹِن.. کوئی ایک میخ کسی خیمے کی.. بستی ویران ہو چکی تھی..

یقیناً سرخ بالوں والی لڑکی بھی کوچ کر گئی ہوگی..

جس جھیل میں لیلیٰ عکس ہوتی تھی، اُس کے پانیوں میں کوئی سرخ بال نہ تھے..

ہمارے پورٹر کندھوں پر ہمارا سامان بوجھ کئے.. اس الگ تھلگ وادی میں سے نکلنے گے..

ہم مڑ کر دیکھتے تھے.. اور بار بار اس سپاٹ کو تکتے تھے جس پر ابھی ابھی ہماری حکومت تھی.. اور جسے دور سے جو کوئی بھی دیکھتا تھا تو یہی کہتا تھا کہ یہ کیسے کئی باسٹرڈ ہیں جن کے خیمے ان برفانی منظروں میں تنہا لگے ہیں.. ہم نے وہاں سے سب کچھ سمیٹ لیا.. اپنے خیمے، سامان، طشت میں اکڑے چند پکوڑے.. کچھ لفافے.. فلم کی خالی ریلیں.. سب کچھ سمیٹ لیا لیکن ہم اپنی ایک شب کی موجودگی کو نہ سمیٹ سکے..

جہاں ہمارے خیمے نصب تھے.. اور جہاں جہاں ہم اُن کے آگے چلے تھے وہاں ہمارے بوٹوں کے نشان گیلی زمین پر ثبت تھے جو ہم نہ سمیٹ سکے.. یہاں تک کہ لیلیٰ پیک کے برف چہرے پر بھی ہماری حریص نظروں کے نشان باقی تھے..

یہ سب نشان.. دھیرے دھیرے.. وقت کے گزرنے سے.. موسموں کے بدلنے سے.. برفوں کے پڑنے سے.. ہواؤں کے چلنے سے.. یکسر معدوم ہو جائیں گے.. مٹ جائیں گے.. اور پھر آنے والے زمانوں میں کسی کو خبر نہ ہو گی کہ یہاں اس ہسپاں کی پندرہ ہزار فٹ بلند برفانی کارواں سرائے میں کچھ مسافر آئے تھے.. آئے تھے اور ایک شب گزار کر چلے گئے تھے.. لیکن.. اپنی لیلیٰ کو ساتھ لے کر چلے گئے تھے.. اپنے بدنوں اور روحوں میں اُتار کر ساتھ لے گئے تھے.. اور اب یہ جو لیلیٰ پیک نظر آتی ہے تو یہ موجود نہیں.. یہ محض ایک دکھاوا ہے.. دھوکا ہے.. اصل لیلیٰ جو تھی اسے تو اس کے مجنوں لے گئے تھے..

''پہاڑوں کی رات میں بھٹکتے اندھے فقیر''

آج میں نے پھر ہنہنانے کی سعی تو کھسیا کر رہ گیا.. تیز چلنے کی کوشش کی تو ٹانگوں نے جواب دے دیا.. اپنی ہمت کو مجتمع کرنے کا چارہ کیا تو بدن نے دوہائی دی کہ میاں اس بوسیدگی کی عمر میں مَیں تمہاری حرص کا ساتھ نہیں دے سکتا..

چنانچہ کُھلا کہ میں آج گھوڑا نہیں تھا بلکہ پھر سے مستنصر حسین تارڑ ہو چکا تھا.. اور یہ بھی کُھلا کہ روزانہ گھوڑا نہیں ہوا جا سکتا.. یہ محض ایک فلوک تھا جو کل لگ گیا تھا.. میں محض ایک دن کا گھوڑا تھا..

ہم انہی راستوں پر.. گزرے تھے ہم جہاں سے.. وہاں سے سر جھکائے چلتے ہانپتے چلتے رہے.. البتہ بلندی کم ہوتی جا رہی تھی اس لیے سانس اتنا بے ربط نہیں ہوتا تھا..

جب ہم ہسپاں کو جانے والے سفید گلیشیر اور اونچی نیچی پہاڑیوں پر اونچے ہو کر اور نیچے ہو کر بالآخر گنڈو گورو گلیشیر پر اُترے.. اسی مقام پر اُترے جہاں ایک بڑی دراڑ تھی اور برف کا کنواں تھا اور پھر اس کی برفیں ناپتے ہوئے اس کی مسافت تمام کر کے اس سے جدا ہونے کے لیے اس کے بلند کنارے پر چڑھے تھے تو وہاں ایک سانحہ ہو گیا..

لیلیٰ پیک ہمیشہ کے لیے نظروں سے اوجھل ہو گئی..

''سائیں اِدھر دوبارہ آنا ہے اور پھر لیلیٰ کے دامن میں.. اس کے بیس کیمپ تک جانا ہے.. اس کے چرن چھونے..'' یہ برمانی نے کہا..

اور یہ سائیں نے کہا.. ''ڈاکٹر یہ تمنا کہ ہم دوبارہ یہاں آئیں گے، کبھی پوری ہونے والی نہیں ہے.. آپ کبھی براَلدو کے پار اس گاؤں میں نہیں جاتے.. جو آپ پر سحر طاری کر دیتا

ہے.. جیسپر گلیشیئر کی بلندی پر اس سرسبز قطعے تک نہیں جاتے جہاں آپ کو خبر ملتی ہے کہ ایسے ہرن ہیں جنہوں نے آج تک انسانی شکل نہیں دیکھی اور وہ آپ کو بھی اپنے جیسا سمجھ کر تھوتھنیاں اُٹھائے آپ کے قریب آ جاتے ہیں۔ بیافو کی چٹانوں میں کھدے شکاری جھونپڑے میں رات بسر نہیں کرتے.. تو ایسی خواہشیں کبھی پوری نہیں ہوتیں.. لیلیٰ پیک کے دامن میں پہنچنے والی خواہش بھی ایسی ہے.. اسے تم آخری بار دیکھ چکے.. دوبارہ یہاں کون آئے گا.. کس نے آنا ہے۔"

"نہیں بھی آنا سائیں تو ایک مجنوں کا دل رکھنے کی خاطر کہہ دیں کہ ہاں ہم آئیں گے.. اس جدائی کے پہلے لمحے میں کچھ تو ڈھارس بندھائیں.. دو بول اُمید کے بول دیں۔" برمانی واقعی اس برفانی لیلیٰ کا اسیر ہو چکا تھا..

"میں تو اپنے لیے کہہ رہا تھا کہ میں تو نہیں کہ میرے پاس عمر کی جو گھڑی ہے، اس میں گنجائش کم رہ گئی ہے.. مسلسل تنگ کر رہی ہے اور سانسیں کم کر رہی ہے.. سانس نقارہ کوچ کا باجت ہے دن رین.. اور کسی روز گھڑیال منادی کر دے گا.. اور پھر لوگ پوچھیں گے FOR WHOM THE BELL TOLLS.. لیکن تم دوبارہ آؤ گے، مجھے یقین ہے۔ تم میں جو بلوچ ہٹ ہے وہ تمہیں یہاں لے آئے گی اور تم اس کے دامن میں پہنچ کر اس کے وصال سے سرشار ہوتے ہوئے تب مجھے یاد کرو گے.. کہ پہلی بار تارڑ مجھے لیلیٰ تک لایا تھا۔"

تقریباً دو بج رہے تھے جب ہم دل سنگ پا کی ویرانی میں اُترے..

دل سنگ پا خالی اور بے روح تھا.. تیز دھوپ اس کے رنگ نچوڑ چکی تھی.. جھیل کے پانیوں تلے اس کی کیچڑ بھری تہہ دکھائی دے رہی تھی.. اس میں مشابرم کا کوئی عکس نہ تھا..

ہم نے دھوپ میں جلتے ہوئے کچھ بدمزہ قسم کی چیزیں خوراک کے طور پر نگلیں اور فیصلہ کیا کہ ابھی کچھ وقت ہے، کچھ ہمت ہے اس لیے سفر جاری رکھا جائے.. اگر ممکن ہو تو شائی چو تک ورنہ راستے میں رات بسر کریں گے.. اگر ہمت نہ بھی ہوتی تو بھی ہم دل سنگ پا کی نامہرباں ویران دھوپ میں نہ ٹھہرتے.. اور سلمان کی دلی آرزو بھی یہی تھی کہ ہم آج ہی اس ہولناک اُترائی کا کشٹ کاٹ لیں.. اس ایک بڑے ڈر کا سامنا کر کے اس سے فارغ ہو جائیں۔

"سر جی کچھ پتہ نہیں کب بارش آ جائے۔" حالانکہ آسمان بالکل خالی پڑا تھا۔ بادلوں کا شائبہ بھی نہ تھا۔ "بارش آ گئی تو وہاں پھسلن ہو جائے گی.. پتھر گرنے لگیں گے، آج ہی اس سے نپٹ لیں۔"

دل سنگ پا سے ہم شتابی سے نکلے.. گندوگورو کے بلند کناروں پر چلتے.. پھولوں کے سوکھے ہوئے کھیتوں میں سے چلتے.. خشک ہو چکی ندیوں کے نشانوں پر سے گزرتے جب ہم وہاں پہنچے جہاں جھانکنے سے وہ اُترائی نظر آتی تھی تو جھانکا ہے تو ٹھٹک گئے.. اگرچہ ہم ذہنی طور پر اس اُترائی کے لیے کل سے اپنے آپ کو تیار کر رہے تھے لیکن اس کے باوجود اس کی پاتال گہرائی اور ناممکن گہرائی کو دیکھ کر ٹھٹک گئے کہ ہم اس کے لیے تو قطعی طور پر تیار نہ تھے..

اور اس پر طرّہ یہ کہ جانے کہاں سے ایک گھٹا بادل نمودار ہوا.. خالی آسمان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور ٹپ ٹپ بارش اُترنے لگی.. یہ صرف سلمان کا ڈر تھا جس نے بارش برسائی تھی.. ورنہ تو کوئی امکان نہ تھا..

سب لوگ سراسیمہ ہو گئے اور سلمان کا رنگ تو باقاعدہ فق ہو گیا.. ہم چونکہ اپنے رنگ نہ دیکھتے تھے.. اگر دیکھتے تو بھی وہ فق تھے کہ اب کیا ہوگا..

بارش باقاعدہ نہیں ہوئی تھی.. بس کبھی کبھار ایک آدھ بوند گرتی لیکن وہ ایک آدھ بوند بھی ہمارا خون آدھا کر دیتی..

پورٹروں نے ہمیں اس بلندی سے ایسے نیچے دھکیلا جیسے اناڑی پیراٹروپرز کو پہلی بار زبردستی جہاز سے دھکیلا جاتا ہے..

اور ایک ایک کر کے دھکیلا..

ان چند بوندوں نے بھی اپنا کام دکھایا اور خشک مٹی کو پھسلن میں بدل دیا..

مجھے دو پورٹر نیچے لے جا رہے تھے.. مجھے کسی بھی تعین پر اختیار نہیں.. اس اُترائی کے دوران یہ نہیں کہ ہم اُترے اور اُترتے ہی چلے گئے.. بلکہ متعدد مقامات پر میرا سانس پیچھے رہ جاتا اور میں آگے نکل جاتا اور آپ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہوں گے کہ سانس کے بغیر جینے میں کچھ دشواری ہوتی ہے۔ چنانچہ میں ایک حالت مردنی میں کہیں کوئی بھاری پتھر تھام کر پیچھے رہ جانے والے سانس کا انتظار کرتا اور جب وہ مجھ تک پہنچ جاتا تو پھر پورٹروں کی بانہوں میں جھولتا نیچے جانے لگتا..

ہم باری باری نیچے آ رہے تھے..

سلمان بھی لڑھکتا ہوا نیچے آیا اور ایک ڈری ڈری سی.. "ہائے اوئے" کر کے کہنے لگا۔

"لو سر جی یہاں سے بچ گئے ہیں ناں تو اب انشاءاللہ لاہور تک ہمیں سات کی سات خیریں ہیں.."

یہ پنجابی کے محاورے "ستے خیراں" کا ترجمہ تھا..

آگے وہی بکری اُترائی والا راستہ تھا اور راستے کے بعد نالہ تھا اور نالے کے بعد گندوگورو کے برابر میں وہ پگڈنڈی تھی جس کے عین اوپر مٹی میں پھنسی سینکڑوں چٹانیں ہم پر جھانکتی تھیں کہ اس پر گریں یا اس پر گریں لیکن ہم کچھ زیادہ فکرمند نہ ہوئے کہ اگر مرنا ہوتا تو وہ اُترائی اس کام کے لیے بے حد آئیڈیل تھی.. یہاں سے بچ نکلیں گے..

اس پگڈنڈی کے اختتام پر اوپر کنارے کی بالائی سطح پر پہنچنے کے لیے ایک وہی آسمانی چڑھائی جو آتے ہوئے پاتال اُترائی تھی.. اور جب آپ پھسلتے لڑھکتے بال بال بچتے.. سانس سنبھالتے.. اپنے پورے بدن میں پسینے کے فوارے چھوٹتے محسوس کرتے.. بے سکت ٹانگوں کو گھسیٹتے بالآخر اوپر پہنچتے ہیں.. آپ کا سر بلند ہوتا ہے تو اس پر لگی ہوئی دو آنکھیں یکدم اپنے سامنے ایک وسیع گھاس بھرا میدان دیکھتی ہیں اور جب آپ دونوں ہاتھوں سے پتھروں کو تھامتے اوپر اٹھ کر اس میدان کے کنارے پر دھڑام سے جا گرتے ہیں تو آپ کے کچھ سابق ساتھی وہاں پہنچ چکے ہیں اور گھاس پر لیٹے پتھروں سے ٹیک لگائے استراحت فرما رہے ہیں اور استراحت فرماتے ہوئے آپ کے دھڑام سے اوندھے گرتے ہی دانت نکال کر کہتے ہیں "ہاں جی.. لیڈر صاحب.. پہنچ گئے ہو۔"

اور آپ میں جواب دینے کے لیے ایک سانس بھی نہیں ہوتا.. منہ کھلا ہوا ہے.. ٹانگیں لرزش میں ہیں جہاں گرے ہیں وہاں بس گرے ہیں اور اس حالت میں وہ مسخرے سوال کرتے ہیں.. پہنچ گئے ہو.. اگر بولنے کی سکت ہوتی تو میں انہیں ایسی بامعنی اور مردانہ گالیوں سے نوازتا کہ سکھ حضرات بھی شرم سے سرخ ہو جاتے اور اگر ذرا سی بھی ہمت باقی ہوتی تو گھسٹتا ہوا ان تک جاتا اور ان کے ٹینٹوے دبا دیتا..

لیکن بیان کا قصور نہ تھا..

رسم دنیا یہی تھی..

میں بھی جب ایک پتھر سے ٹیک لگا کر سانس بحال کر چکا.. اتنی طاقت آ گئی کہ گھاس پر ہاتھ پھیر کر اس کی ہریاول سے لطف اندوز ہونے لگا تو نیچے سے ہمارے ایک اور ساتھی کا سر نمودار ہوا تو سب سے پہلے میں نے ہی دانت نکال کر پوچھا "ہاں جی پہنچ گئے ہو.."

اور اگر وہ سر.. سلمان کا تھا تو اس نے صرف اتنا کہا "ہائے اوئے" اور ڈھیر ہو گیا..

یہاں سے چلے ہیں تو کچھ دیر میں اس وسیع میدان کے کناروں پر جو نہایت اونچی اور گھمبیر چٹانیں آسمانوں میں تھیں، اُن کے سائے میں ایک خیمہ گاہ نظر آنے لگی.. اور وہاں ڈھلتی دوپہر میں چٹانوں کے بڑھتے سائے میں بہت رونق تھی.. بہت سے خیمے لگے تھے اور ان کے قریب چٹانوں میں سے اُترتے ایک چشمے میں ان خیموں کے غیرملکی مکین اشنان کرتے تھے، چھینٹے اڑاتے تھے.. ہم نے انہیں اس لیے بھی حسرت سے دیکھا کہ ان میں کچھ ایسی خواتین بھی تھیں جو کچھ زیادہ حیادار نہیں تھیں۔ طالبان کے فلسفے سے بالکل مخالف کنارے پر تھیں اور بے دریغ تھیں.. انہیں دیکھ کر کچھ ساتھیوں کے ایمان ڈولے کہ سرجی یہیں ٹینٹ لگا لیتے ہیں لیکن فیصلہ یہی ہوا کہ شائی چوٗ زیادہ دور نہیں.. تھوڑی سی ہمت کریں تو وہاں تک پہنچ سکتے ہیں..

اور کم از کم میں نہیں جانتا تھا کہ شائی چوٗ ابھی بہت ہی دُور ہے....

ہمیں اصولی طور پر وہیں اسی خیمہ گاہ میں رک جانا چاہیے تھا... لیکن ہم اپنی اس انا کے اسیر ہو چکے تھے جو یہ کہتی تھی کہ اگر فلاں گائیڈ بک میں یہ درج ہے کہ ہسپاں سے شائی چوٗ تک دو منزلیں طے کی جا سکتی ہیں تو ہم بھی کریں گے... ورنہ یہ نئی خیمہ گاہ ہمارے لیے ایک اور منظر ہوتی.. ایک نیا تجربہ ہوتی.. ان چٹانوں تلے جو رات ہوتی، وہ پتہ نہیں کیسی نادر کیفیت کی ہوتی..

ہماری انا نے ہمیں ایک احمقانہ فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا اور ہم آگے بڑھ گئے..

یہاں تک تو ہم سب تقریباً اپنے حواس میں رہے... اور پھر شدید تھکاوٹ اور درماندگی نے ہمیں بدحواس کر دیا... ہم سب ایک عجیب دیوانگی اور بیگانگی میں الگ الگ ہو گئے، بھٹکنے لگے... کسی کو کوئی خیال نہ رہا کہ کون کہاں ہے... کس حال میں ہے... زندہ بھی ہے یا مر گیا ہے... ہر ایک کا سفر الگ تھا... تنہا اور دوسروں سے کٹا ہوا تھا... پھر میں اس نالے کے کناروں سے اُترا... جس کے دوسرے کنارے پر میں تادیر بھٹکا تھا جسے عبور کرنے سے جھجکتا اور جان کے ڈر سے ٹھٹکتا تھا... اسے بھی میں نے ایک عجیب لاتعلقی اور بیزاری سے بے پروا ہو کر عبور کیا کہ مجھ میں تھکاوٹ ایسی تھی جو کہتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا... میں اس میں ڈوب جاؤں گا... بہتا ہوا ہوشے پہنچ جاؤں گا تو کیا ہوگا...

گندوگورو کا میدان شروع ہوا تو وہ ختم ہونے کو نہ آتا تھا..

کبھی پتھروں کی دنیا میں لاچارگی اور بے بسی کی تھکن بدن کو مسمار کرنے لگتی اور کبھی ریتلے علاقوں کی وسعت ایک صحرائے گوبی ہو جاتی جس کا کوئی انت دکھائی نہ دیتا..

ہم نے حماقت کی تھی..ہمیں اُسی خیمہ گاہ میں ٹھہر جانا چاہیے تھا..ہم وہاں اُس بڑی چٹان کے سائے میں اپنے خیموں کے سامنے میٹرس پر آرام کرتے چکن کارن سوپ پی رہے ہوتے..اور اس سے پیشتر ہم غیر ملکی گوری مخلوق کے ہمراہ ایک اشنان کر چکے ہوتے..ہم نے حماقت کی تھی لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا..

اور شائی چو کہاں تھا؟..

اللہ جانے کہاں تھا.

کہیں تھا بھی یا نہیں..

لیکن پورٹر ڈھارس بندھاتے تھے کہ اس گندوگورو میدان کے پار..دور افق کے آس پاس جو سبزہ ہے،اس کے دامن میں وہیں کہیں ہے..

اور سورج بھی طوطا چشم ہوتا اپنی روشن آنکھ بند کر رہا تھا اور شام ہوتی تھی..

اس طویل..اور انسانی برداشت سے باہر..یعنی میری برداشت سے باہر کے سفر کا بیان طولانی ہے اور اس پر آسانی سے ایک الگ کتاب تحریر کی جاسکتی ہے لیکن یہ قصہ مختصر کر دوں تو بہتر ہے..

تو مختصر یہ کہ جب بالآخر گندوگورو کے گوبی صحرا کے پار ہم گلیشیئر کے اونچے کناروں کے آس پاس اور دامن میں جھاڑیوں اور درختوں کے اندر پہنچے تو شام رخصت ہو کر رات کی سیاہ چادر میں روپوش ہو رہی تھی...راستے کے پتھر معدوم ہوتے جاتے تھے..جھاڑیاں شجر تاریکی میں گھلتے جاتے تھے..نظر کام کرنے سے انکار کرتی تھی۔پاؤں تو کب کے اٹھنے سے انکاری ہو چکے تھے لیکن جانے کیسے اٹھتے جاتے تھے..

ہمارے ساتھی آگے نکل چکے تھے.

صرف میں..حسن اور شاہد پیچھے رہ گئے تھے..

ہم تینوں اندھے فقیر ہو چکے تھے...اپنی واکنگ سٹکس ٹیکتے..کبھی اس پتھر سے ٹھوکر کھاتے..کبھی اُس جھاڑی میں گرتے اپنے بدن زخمی کرتے..راستہ ٹٹولتے اپنی قسمت کو کوستے ٹھپ..ٹھپ..چلتے جاتے تھے..

جب تاریکی بڑی ہوگئی..نابینائی کی سلطنت وسیع ہوگئی..سوائے اندھیروں کے اور کوئی ساتھی نہ رہا تو کہیں نیچے سے دو پورٹر اوپر چڑھتے آئے اور ان کے ہاتھوں میں ٹارچیں تھیں..

اُنہیں ہمارے ساتھیوں نے شائی چو پہنچ کر ہماری مدد کے لیے بھیجا تھا..

وہ ہماری رہنمائی کرنا چاہتے تھے..ہمیں راستہ دکھانا چاہتے تھے لیکن ہمیں کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا..وہ بھی نظر نہ آتے تھے..

ایک ہاتھ میں اُن کی عطا کردہ ٹارچ اور دوسرے میں واکنگ سٹک اور اندھیرے اور خوف کی غار میں اُترتے جانا..ٹارچوں کی ناکافی روشنی میں..راستے کا تعین کرتے کہ کہیں اس بلند کنارے سے نیچے گندوگورو گلیشیئر میں ہی نہ جا گریں۔کہیں راستے سے ہٹ کر کسی درخت کی ٹہنیوں میں اُلجھ کر اپنے آپ کو زخمی نہ کر لیں..ہم لاچار،غریب الدیار اُترتے رہے..

شائی چو ایسا مقام لعنت تھا جو آتا ہی نہ تھا.

بدن اور ہمت نے مجھے جواب دے دیا تھا.

کئی کوہ پیما کے ٹو یا ایورسٹ کی چوٹی تک پہنچنے کے لیے پوری زندگی منصوبہ بندی کرتے ہیں..وہاں تک پہنچ جانے کی آس میں جیتے ہیں..ان کے لیے وہاں تک پہنچ جانا خدا تک پہنچ جانے کے برابر ہوتا ہے اور پھر جب وہ اس چوٹی سے دس بیس میٹر دور ہوتے ہیں تو یکدم ان کا بدن اور ہمت بھی جواب دے جاتے ہیں..جانتے ہیں کہ دوبارہ یہ موقع نہیں آسکے گا۔اس کے باوجود ان میں سکت نہیں ہوتی،ایک اور قدم اُٹھانے کی..

مجھے یہ جواب دو مرتبہ پہلے بھی ملا تھا..

مجھ پر یہ بیچارگی اور لاچارگی پہلی بار تب وارد ہوئی تھی جب ہم ورگوتھ کی مرگ ندیاں پار کر کے ایک گھنے جنگل میں اُترے تھے اور پھر رات گئے خیمہ گاہ میں پہنچے تھے..اور دوسری بار جب میں بُرجی لا درّے سے اتر کر اپنی منزل شتونگ تک پہنچنے کی خواہش میں دن کے بعد رات کر بیٹھا تھا اور ہمارے آس پاس ریچھوں کے وہم اندھیروں میں سے نمودار ہوتے تھے اور بھوک بدن کو بے جان اور لاغر کرتی تھی اور یہ بھی یقین نہ تھا کہ ہمارا رُخ شتونگ کی جانب ہے یا ہم دیوسائی میں بھٹکتے پھرتے ہیں اور میں اپنی مدد کے لیے آنے والے پورٹر عباس سے کہنے والا تھا کہ تم مجھے اپنے کندھوں پر اٹھا لو جب شتونگ میں روشن ایک لالٹین دکھائی دی تھی.

کاش آج بھی میرے ہمراہ عباس ہوتا..ہم نے سکردو میں اس کا کھوج لگایا تھا لیکن وہ کسی اور مہم کے ساتھ جا چکا تھا..

ٹارچ کی روشنی میں بھی مجھے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا،میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا

چھارہا تھا..

میرے برابر میں.. مجھے سہارا دینے کی کوشش میں ایک پورٹر نے ہاتھ آگے کیا..

''صاحب میں آپ کا ہاتھ پکڑتا ہوں۔''

''نہیں..''میں نے اُسے جھڑک دیا.. کیونکہ میں جانتا تھا کہ اگر اس نے مجھے ہاتھ لگایا.. یا کسی درخت کی ٹہنی نے بھی میرے بدن کو چھو لیا تو میں مسمار ہو جاؤں گا..ایک مرتبہ گر گیا تو اُٹھ نہ پاؤں گا..

ایک اور قصہ مختصر..

ہم نیچے شائی کو میں پہنچ گئے..

ٹارچ کی روشنی میں راستے میں پڑتی ندیوں کے پانی چمکتے تھے اور میں کبھی انہیں پھلانگ کر پار جاتا تھا اور کبھی نقاہت کے عالم میں اپنے بوٹ بھگوتا ان میں چلتا ہوا دوسری جانب پہنچتا تھا..ایک بے جان پتلے کی مانند چلتا جاتا تھا..

ہمارے خیمے اندھیرے میں کہیں تھے.....وہیں تھے جہاں ہم نے آج سے کچھ ماہ پیشتر لگائے تھے.. یا چند ہفتے پہلے لگائے تھے.. پتہ نہیں کب لگائے تھے لیکن وہی مقام تھا..ہم تینوں کی آمد پر کسی نے تالیاں نہیں بجائیں، ہمارا استقبال کرتے ہوئے شاباش نہیں دی کیونکہ جو ہم سے پہلے پہنچ گئے تھے، ان میں بھی زندگی کی رمق کم کم تھی.. برمانی خیمے کے باہر اپنی میٹرس پر تقریباً مردہ پڑا تھا اور لاکھ جھنجھوڑنے پر بھی بیدار نہ ہوتا تھا..

اس نے اگلی سویر بتایا کہ تارڑ سائیں مجھے بھی راستے میں شام ہو گئی اور میں اکیلا تھا..تھکاوٹ اور بدن کی لاچارگی اتنی تھی کہ میں ٹھوکریں کھاتا گرتا تھا اور سنبھل جاتا تھا..تب میں نے ایک بار اپنے آپ کو گرنے سے بچانے کے لیے ایک درخت کے تنے کا سہارا لیا، اسے دونوں بازوؤں میں تھام کر اس پر سر رکھا تو مجھے درخت کے تنے میں سے ایک صدا آئی..بھاگ جاؤ.. یہاں سے بھاگ جاؤ ورنہ مر جاؤ گے..مر جاؤ گے..تو سائیں میں وہاں سے جو اندھا دھند بھاگا ہوں..کچھ یاد نہیں کہ کس سمت میں کس راستے پر بھاگا ہوں..میں آسانی سے گلیشیر میں بھی اُتر کر گم ہو سکتا تھا لیکن کسی نہ کسی ہاتھ نے میری مدد کی..مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں ندیاں پھلانگ رہا ہوں..اور آخر میں کوئی مقام ہے جہاں ایک لالٹین روشن ہے..

مجھے اس سے پوچھنے کی ضرورت نہ تھی کہ کیا واقعی درخت کے تنے میں سے آواز آئی

تھی کیونکہ مجھے پورا یقین ہے کہ ایسا ہی ہوا ہوگا..تھکن اور بے بسی کی وہ کیفیت ایسی تھی جس میں درخت ہی آپ کو راستہ دکھاتے ہیں اور خبردار کرتے ہیں کہ بھاگ جاؤ ورنہ مر جاؤ گے..

میں نے کے ٹو کے سیکس اور کے سیون کی برفوں کی جانب ایک نگاہ بھی نہ کی کہ میری نگاہ میں تو صرف میرا خیمہ تھا جس کی جانب میں لڑکھڑاتا ہوا بڑھتا تھا..

میں اپنے سلیپنگ بیگ پر جہاں گرا..اگلی سویر تک وہیں گرا رہا..

''وادیِ ہوشے پر بچھا گندم کی بالیوں کا تخت''

ہم ہوشے کے قریب ہوئے تو سامنے ایک عجیب نظارہ تھا ہوشے کے باغ میں..

شائی چو سے ہم صبح سویرے نہیں بھری دوپہر میں چلے..کہ ہمارے مُردہ بدن سویر تک اس قابل نہ ہوئے کہ انہیں ہلایا جلایا جا سکے..جب ذرا دھوپ پھیلی تو ان میں بھی زندگی کی کچھ حرارت پیدا ہوئی..

اور جب ہم دو بجے کے قریب ہوشے کے سامنے پہنچے تو وہاں ایک عجیب نظارہ تھا..جو ہم نے پہلے نہیں دیکھا تھا..

ہم سے دور کھیتوں کے پار ایک بلند سطح پر ہوشے کے گھر دکھائی دیتے تھے اور یہ جو کھیت درمیان میں تھے، یہ سراسر سنہری ہو رہے تھے اور پھر تہہ در تہہ بلند ہوتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ چٹانوں کی قربت میں پہنچ کر رک جاتے تھے..البتہ وہاں تک پہنچ کر وہ سنہری سے ہرے ہو جاتے تھے کیونکہ وہاں ابھی تک گندم پکی تھی..

بلندیوں پر جیسے شالیمار کا ایک تخت بچھا ہوا تھا۔تختہ بہ تختہ یہ کھیت بلند ہوتے جاتے تھے اور گندم کی بالیوں کے سنہری پن میں رنگے جاتے تھے..

کسی بھی منزل سے واپسی پر راستے تو یقیناً وہی ہوتے ہیں لیکن منظر سراسر بدل جاتے ہیں..

پہلے آپ اُن سے نکل رہے ہوتے ہیں اور وہ آپ کی پشت پر ہوتے ہیں اور واپسی پر وہ آپ کے سامنے ہوتے ہیں اور آپ ان میں داخل ہو رہے ہوتے ہیں..

ہم بھی اپنے راستے سے اُتر کر کھیتوں میں چلے جاتے تھے اور گندم کی بالیوں سے بچے

مٹر کے پودے تلاش کرتے تھے اور اُن کی پھلیاں توڑ کر انہیں ناخنوں سے اُدھیڑ کر انہیں کھول کر ان میں سے ہرے بھرے دانے نکال کر اپنے منہ میں رکھتے تھے اور اس تازہ سبز ذائقے کے انوکھے مزے لیتے تھے..

بچوں میں ٹافیاں تقسیم کرتے جب ہم اوپر ہوشے کے پہلے گھر تک گئے اور پھر گاؤں میں داخل ہوئے تو یہاں بھی ہمیں دیکھ کر کسی نے تالیاں نہ بجائیں..ہمیں خوش آمدید نہ کہا..کہ اہلِ ہوشے کے لیے یہ ایک روزانہ کا معمول تھا کہ اوپر دو گندو گورو سے ایسے پریشان حال کوہ نورد اُترتے ہی رہتے ہیں..

سلمان نے ستانے کی بجائے فوری طور پر کاندے جانے والی کسی جیپ کا بندوبست کیا اور یہ وہی حوالدار کی جیپ تھی..پھر وہ سامان جو ٹریک سے نکلنے سے پیشتر یہاں سے کرائے پر حاصل کیا گیا تھا..کچن ترپال، کچھ دیگچے..اُسے واپس کیا گیا اور پھر اشرف کی خیمہ گاہ میں پورٹروں کا حساب کتاب کیا گیا۔حسین، اسحاق اور علی موسیٰ جو ہمارے خیر خواہ نکلے تھے، انہیں ان کی مہربانی کے عوض میں اُن کی اجرت میں کچھ اضافہ کیا گیا..کچھ خوراک تقسیم کی گئی..

اور پھر روانگی سے پیشتر ایک پیالی چائے کے لیے..جو نہایت دھواں دار تھی، ہم اشرف کی خیمہ گاہ کے ڈائننگ روم میں چلے گئے..

اور یہاں پر یوسف سے ملاقات ہوگئی۔

جی ہاں ''سنولیک'' کے مفرور..حرامی..گائیڈ..یوسف اوئے یوسف سے..جو نہ گائیڈ تھا اور نہ کک تھا..بس یوسف اوئے یوسف تھا..

انسانی خصلت میں شامل ہے کہ بے شک ایک اور انسان اُسے تقریباً مار ڈالنے کا باعث بنا ہو لیکن وہ اس کو دوبارہ ملنا چاہتا ہے..چنانچہ ہم نے بھی ایک بار سکردو میں اس کا کھوج لگانے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ وہ دو برطانوی کوہ پیماؤں کو جھانسا دے کر سنولیک پر لے گیا تھا جہاں ایک کوہ پیما ایک دراڑ میں گر کر ہلاک ہو گیا تھا اور اس کی لاش کو سنولیک پر چھوڑ کر یوسف سکردو واپس آ گیا تھا..اور ان دنوں وہی کوہ پیما یوسف کے خوابوں میں آتا تھا اور کہتا تھا..جوزف تم نے مروا دیا..چنانچہ جوزف یعنی یوسف کو خوف کے مارے بخار ہو گیا تھا اور وہ بستر میں پڑا تھا..

ہوشے میں معلوم ہوا کہ یوسف دراصل سکردو کے ہسپتال میں چوکیدار ہے اور وہاں کے ایک ڈاکٹر صاحب نے لاہور سے آنے والے تین نوجوانوں کو اس کے ہمراہ کر دیا تھا تا کہ وہ

انہیں مشابرم بیس کیمپ تک لے جائے..

یوسف اور وہ تین مبتدی کوہ نورد مشابرم کے بیس کیمپ سے واپس آ کر اب اشرف کے سوکی ڈائننگ روم میں آنکھیں جھپکتے تھے اور سب کے سب بارلیش تھے اور یہیں پر ان سے ملاقات ہوگئی۔

سب سے پہلے تو میں نے اور سلمان نے ان تین نوجوانوں کو مبارکباد دی کہ وہ یوسف کی رہنمائی کے باوجود زندہ سلامت لوٹ آئے ہیں اور پھر یوسف سے چہلیں شروع ہوگئیں..

''یوسف..'' سلمان نے سنولیک سٹائل میں ذرا لنک کر کہا'' اوئے یوسف..''

''جی صاحب..'' وہ ہمیں دیکھ کر اگرچہ خوش بھی ہوا تھا لیکن کچھ شرمندہ سا بھی نظر آتا تھا..

''یوسف تم تو چاول بھی نہیں اُبال سکتے تھے اور پھر بھی کک تھے اور نملا سے آگے بھی نہیں گئے تھے اور پھر بھی گائیڈ تھے..تو کیا اب بیافو ہسپر کراس کیا ہے ہمارے بعد؟''

''بیافو ہسپر تو میں نے چھ سات بار کراس کیا ہے صاحب۔'' یوسف اپنی اناڑی ٹیم کے سامنے اپنی عزت نفس کا دفاع کرنا چاہتا تھا۔'' بہت مرتبہ گیا ہے۔''

سلمان، یوسف کے پول کھولنے پر تلا ہوا تھا۔'' اور جب گیا ہے تو کتنے کوہ نوردوں کو دراڑوں میں دھکیلا ہے یوسف..یاد ہے تم تارڑ صاحب کو ایک بلندی پر سہارا دے کر لے جا رہے تھے اور پھسل گئے تھے اور تم نے جواباً تارڑ صاحب کو جپھا مار لیا تھا اور ان کو بھی لے ڈوبے گئے تھے۔''

''نہیں صاحب..'' وہ بغلیں جھانکنے لگا..

''جھوٹ مت بولو یوسف..'' سلمان لٹکنے لگا..

''نہیں نہیں..وہ تو گرتا تھا تو صاحب کو پکڑ لیا تھا۔''

''اور یوسف تم نے دوسرا شادی بنایا؟''

یوسف نے رب کا شکر کیا کہ موضوع بدلا ہے۔'' ہاں صاحب..بنالیا ہے۔''

سنولیک کے دوران یوسف دوسری شادی کے لیے پر تول رہا تھا لیکن عباس کی موجودگی میں یہ تول مول خفیہ رکھتا تھا کیونکہ وہ اس کا سسر تھا..

اس کی داڑھی کے بہت سے بال سفید ہو چکے تھے لیکن وہ اب بھی سگریٹ کو ایک کش

میں آدھا کر دیتا تھا..

ان نوخیز کوہ نوردوں نے بتایا کہ مشابرم کا بیس کیمپ کچھ اتنا دل پذیر نہ تھا اور راستے میں جو دو چار سخت مقام آئے وہاں پر یوسف انہیں ڈھارس دیتا تھا کہ ہم تو تارڑ صاحب کا ٹیم کو دنیا کے طویل ترین برفانی راستے کے پار لے گیا تھا، یہ تو بچہ لوگ کا کھیل ہے..بہرحال یوسف جیسا بھی تھا، ایک ہمدم دیرین تھا اور مجھے اور سلمان کو جو سنولیک کے ویٹرن تھے، اُسے ہوشے میں دیکھ کر پرانی رفاقت کا ایک خوشگوار احساس ہوا تھا..

اسی سوکی ڈائننگ روم میں ایک سخت اور مشقتی چہرے والا بارلیش پورٹر عجیب نظروں سے مجھے دیکھے چلا جا رہا تھا..پھر وہ اپنی نشست سے اٹھا اور کہنے لگا۔'' صاحب آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔''

''نہیں..''

جیسے ایک عام فوجی کی شکل ایک ہی سانچے میں ڈھلی عام سی ہوتی ہے، اسی طور بیشتر پورٹر بھی کوئی خاص انفرادیت نہیں رکھتے..وقت سے پہلے بوڑھے ہوتے ہوئے مشقت کی جھریوں سے بھرے چہرے..دو چار دانت گرے ہوئے..کندھے جھکے ہوئے اور آنکھوں میں غربت کی دھندلاہٹ..

''جب آپ اُدھر ہوشے میں پہنچے تو اوپر جانے کے لیے..تو میں نے تب بھی آپ کو پہچان کر سلام کیا تھا..میرا نام یحییٰ ہے سر..''

''یحییٰ؟''

''جی صاحب۔ آپ..دس برس پہلے کی بات ہے آپ اس سیزن میں کنکورڈیا گئے تھے..جب بہت کم پاکستانی اُدھر کو جاتا تھا..آپ کا کک غلام محمد تھا..جسے ڈائریا ہو گیا تھا..اور آپ کو آرمی کا ہیلی کاپٹر اٹھانے آیا تھا اور آپ ہمیں چھوڑ کر اس میں چلا گیا تھا..''

''بالکل صحیح..''

''تو میں آپ کا پورٹر تھا سر..آپ کے ساتھ گیا تھا..''

اس کا چہرہ شناسا سا لگنے لگا..لیکن اس چہرے پر دس برس کی مشقت اور مزدوری کا بوجھ تھا..تنگدستی کی جھریاں اور روزی کے حصول کی دربدری کی دھول تھی..وہ محض اس لیے شناسا لگنے لگا کہ اس نے خود بتایا تھا کہ وہ کنکورڈیا مہم میں میرے ساتھ گیا تھا ورنہ میں اب بھی اسے پہچان

نہیں پار رہا تھا..

اسی طور سنولیک کے سفر کے دوران اشکولے سے چلتے ہوئے وحید پورٹر بھی میرے سامنے آ گیا تھا.. اسے میں نے پہچان لیا تھا کہ وہ کے ٹو کہانی کے دوران مسلسل میرے ساتھ رہا تھا اور مددگار رہا تھا..

شمال بہت بڑا ہے اور بہت مختصر بھی.. اتنا مختصر کہ گئے برسوں کے چہرے کہیں نہ کہیں سامنے آ جاتے ہیں اور کہتے ہیں۔'' صاحب آپ نے مجھے پہچانا؟''

اشرف کی کیمپنگ سائٹ کے پھاٹک کے باہر ہوشے کی گلی میں حوالدار کی جیپ پر ہمارے رک سیک اور دیگر سامان لوڈ ہو رہا تھا..

ہمیں اصولی طور پر تو آج کی شب یہیں ہوشے میں قیام کرنا چاہیے تھا لیکن ٹیم کے ہر فرد کو اب کوئی نہ کوئی انتہائی ایمرجنسی والا کام یاد آ رہا تھا جو اس نے فوری طور پر لاہور پہنچتے ہی سرانجام دینا تھا.. ایسے انتہائی اہم کام ہمیشہ کوہ نوردی سے واپسی کے آخری دن ہی یاد آتے ہیں.. سلمان نے ہسپاں میں کہا تھا کہ اس کا بھائی امریکہ جا رہا ہے اور اسے لاہور ایئرپورٹ پر خدا حافظ کہنا بے حد ضروری تھا ورنہ بھائیوں میں دراڑ پڑ سکتی تھی.. میاں صاحب اپنی بیگم کی صحت کے بارے میں فکرمند تھے.. حسن صاحب اپنی بیگم کے لیے فکرمند نہیں بلکہ اداس ہو گئے تھے اور وہ خوبانی چہرے والی مچلو کی خاتون کو یکسر بھول گئے تھے.. برمانی کو پہلی بار احساس ہوا کہ وہ ڈاکٹر بھی ہے اور چوٹی زیریں کے علی کلینک میں داخل چند مریض جانے کس حال میں ہیں.. عامر کو بھی کوئی بزنس میٹنگ یاد آ گئی تھی.. شاہد صاحب کو بھی یقیناً کچھ یاد آ رہا تھا لیکن وہ اقرار نہ کرتے تھے..

اور مجھے... مجھے گھر یاد آ رہا تھا... پورے کا پورا... یہاں تک کہ فوارے کے کائی زدہ پانیوں میں بڑے گلمھڑوں والا وہ بوڑھا مینڈک بھی یاد آ رہا تھا جو ساری رات ٹرا ٹرا کر کے میری نیند برباد کرتا تھا.. اپنے بچوں کے دمکتے روشن چہرے یاد آ رہے تھے جو پہاڑوں کی یاترا سے واپسی پر مجھے دیکھ کر مزید دمکتے تھے، مزید روشن اور سونے ہوتے تھے... وہ اگرچہ اب اتنے بچے بھی نہ تھے اور مجھ سے قد میں نکلتے تھے لیکن اس کے باوجود مجھے دیکھ کر وہ بندر ہو جاتے تھے... میرے گرد اچھلتے کودتے نعرے لگاتے تھے کہ ابو آ گئے... ابو آ گئے... اور تو اور میری واپسی پر میمونہ کے چہرے پر بھی زندگی میں ایک بار نمودار ہونے والی مسکراہٹ کھیلنے لگتی تھی...

چنانچہ ہم ہوشے میں ٹھہرنا نہیں چاہتے تھے... یہاں سے نکل جانا چاہتے تھے اور کسی نہ

کسی طور آج شب جاوا پہنچ جانا چاہتے تھے...

بڑے ڈیل ڈول کے مالک حوالدار کی پرانی جیپ ڈھلتی دوپہر میں ہوشے کی گلیوں میں سے نکل کر یکدم اترائی پر ہمیں بے قابو ہوتے ہوئے محسوس ہوئی لیکن حوالدار فل کنٹرول میں تھا کیونکہ وہ صرف آج بارہ سو پھیرے کے حساب سے کاندے سے ہوشے اور ہوشے سے واپس کاندے کے گیارہ چکر لگا چکا تھا... یہ اس کا بارھواں پھیرا تھا... اس راستے کو وہ اپنی ہتھیلی کی لکیروں کی طرح جانتا تھا اور آنکھیں بند کر کے بھی اس پر جیپ چلا سکتا تھا... اور دراصل وہ آنکھیں بند کر کے ہی اس راستے پر جیپ چلاتا تھا.. کیونکہ وہ روڈ کی جانب کم ہی نگاہ کرتا تھا... مجھ سے ایک خاص لاتعلقی سے باتیں کرتا جاتا تھا... آس پاس کی لینڈ سکیپ کو دیکھتے ہوئے خود سے باتیں کرتا جاتا تھا اور سٹیئرنگ گھماتا جاتا تھا... اتنے وسیع تجربے کے بعد اس کی آنکھیں دراصل سٹیئرنگ میں منتقل ہو چکی تھیں...

اترائی کے خاتمے پر وہی پل آیا جہاں سے ہوشے کا علاقہ ختم ہوتا تھا اور کاندے والوں کی زمین شروع ہو جاتی تھی...

کاندے تک تو پہنچنے کا بندوبست ہو گیا تھا تو اب وہاں سے آگے خپلو تک کسی جیپ کے ملنے یا نہ ملنے کی تشویش شروع ہو گئی...

''صاحب آپ چکر لگا آیا؟'' حوالدار نے اسی لاتعلقی سے پوچھا...

''ہاں....''

''کدھر تک گیا؟''

''ذرا گنڈوگورو کے بیس کیمپ تک..''

''اچھا.'' اس کا منہ کھل گیا۔'' پیدل گیا ہے؟''

''تو اور کیا حوالدار صاحب.. ادھر جیپ تو نہیں جاتا..''

''بہت ہمت کیا ہے صاحب اس عمر میں..''

''آپ تو ادھر گیا ہوگا؟''

''نہیں سر.. اسی تے ہوشے دے اگے کدی نئیں گئے سو جیو..''

''ہیں؟'' میں اس کی ٹھیٹھ پنجابی سن کر ٹھٹھک گیا۔ پھر یاد آیا کہ ادھر آتے ہوئے اس نے بتایا تھا کہ اس کی ملازمت کا ایک بڑا حصہ پنجاب میں گزرا ہے۔'' کیوں نئیں گئے حوالدار جی..''

''ساڈھا کوئی دماغ خراب اے..'' وہ ہنسنے لگا..

''نہ تے ساڈھا دماغ خراب اے حوالدار جی؟''

''آہو..'' اس نے سر ہلایا اور قہقہہ مار کر ہنسنے لگا.. ''پنجاب چھوڑ کر ادھر آتے ہو تو دماغ خراب ہے ناں سوہنیو..''

روڈ ہموار ہو گئی۔

بائیں جانب ہم سے دور ہوتے نالے کے پار جو چٹانیں تھیں، وہ ڈھلتی دھوپ میں رنگ بدلتی تھیں.. ان کے اندر عجیب سرمئی سی وادیاں نظر آتیں جن پر سفید پانیوں کی خاموش آبشاریں اُتر رہی تھیں..

کچھ اور فاصلہ طے ہوا..

ہم نے بدن کو اپنی ہمت سے بہت پرے تک دھکیلا تھا.. کل صبح سے رات تک ایک دن میں دو منزلیں طے کی تھیں اور آج بھی مارو مار کرتے چلے جا رہے تھے.. مجھے جیپ کے آس پاس جو منظر گزرتے جاتے تھے، اُن میں کوئی دلچسپی نہ تھی اور میں نے جو کچھ دیکھنا تھا.. دیکھ لیا تھا.. یہ میرا خیال تھا کہ میں نے جو کچھ دیکھنا تھا.. دیکھ لیا ہے.. ابھی چند لمحوں میں اس منظر نے نمودار ہونا تھا جو اب تک دیکھے گئے تمام منظروں پر بھاری ہونے والا تھا.. چند لمحوں میں..

بائیں ہاتھ پر کاندے کے سیلاب زدہ گھرانوں کی وہ نئی پتھریلی بستی نظر آنے لگی جو انہوں نے اس بے آب و گیاہ ویرانے میں آبسائی تھی.. اور پھر جیپ کی کھڑکی میں سے بستی کے آخر میں ایک بلند تانبے رنگ کی چٹان بلند ہونے لگی..

''چٹان پر ایک لڑکی... اب وہاں نہیں تھی''

چٹان پر ایک لڑکی..

چٹان بلند ہوتی جا رہی ہے اور جب چوٹی پر پہنچتی ہے تو وہاں ایک لڑکی..

چٹان کی چوٹی پر ایک لڑکی.. براجمان!

اور چٹان.. جیسے جیسے جیپ حرکت کرتی تھی ویسے وہ بھی حرکت کرتی جاتی تھی اور اس پر براجمان لڑکی بھی حرکت کرتی جاتی تھی.. جیسے میں ایک تیز رفتار ہیلی کاپٹر میں بیٹھا اس کے قریب سے گزر رہا ہوں..

چٹان پر اطمینان سے بیٹھی لڑکی سرخ لباس میں تھی..

وہ ایک جل پری کی مانند چوٹی پر ٹانگیں سمیٹے بیٹھی تھی..

کاندے کی ''لٹل مرمیڈ'' اپنی چٹان پر شاید پیاسی بیٹھی تھی کہ اس نئی بستی میں پانی نہ تھا اور وہ دور بہتے دریائے شیوک کے پانیوں کو حسرت سے تک رہی تھی اور صرف انہیں دیکھنے کے لیے اتنی بلندی پر.. اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر.. آ بیٹھی تھی..

یا شاید.. وہ کسی کی منتظر تھی!

اُس کا چہرہ اگر میری جانب ہوتا تو میں اس پر لکھی عبارت پڑھ لیتا اور جان جاتا کہ وہ کس کی منتظر ہے اور کتنے برسوں سے منتظر ہے کہ ہر چہرے پر اپنے عشق خاص کے انتظار کی تحریریں ہوتی ہیں.. وہ پڑھی جا سکتی ہیں اور اگر انتظار طویل ہو جائے تو یہ تحریریں جھریوں میں بدل جاتی ہیں..

چٹان پر بیٹھی لڑکی ایک ہیلی کاپٹر سے فلم بند کیے جانے والے منظر کی مانند تیزی سے

گزرتی تھی..اور اس کے پس منظر میں جو نیلا آسمان تھا وہ بھی اتنی ہی تیزی سے جیپ کی کھڑکی کے فریم میں سے گزرتا جاتا تھا..

یہ وہی سکہ تھا جو زمانے اور منظروں کی ٹکسال میں ڈھل گیا تھا اور اس پر اس چٹانی جل پری کی شبیہ..کسی سکندر..اشوک یا مِنندر کی مانند ثبت ہو چکی تھی اور اس سکے نے جب ہزاروں برس بعد کسی کھنڈر میں سے برآمد ہونا تھا تب بھی کھرا رہنا تھا کہ دمشق شام کے سونے میں ڈھلنے والا ایسا سکہ کبھی زنگ آلود نہیں ہوتا..ہاں اس نادر سکے کو ڈھلتے دیکھنے والی میری بھوری آنکھیں خاک اندر خاک ہو جاتی تھیں..لیکن اسی خاک میں سے تو یہ سکہ دستیاب ہونا تھا ہزاروں برس بعد!

وہ چٹان..اس پر براجمان سرخ پیراہن والی وہ لڑکی لمحوں میں گزر گئی لیکن اس کی شبیہ وہیں موجود رہی..کھڑکی کے فریم میں جڑی رہی..

یہ کیسی عجیب بات ہے کہ کوہ نوردی کی اس برس کی بائبل میں اگرچہ شائی چو..دل سنگ پا..ہسپاں اور لیلے پیک ایسے مقدس مقام آتے ہیں لیکن جب یادوں کی ٹکسال میں کوئی ایک سکہ ڈھلتا ہے تو اس پر چٹان پر براجمان ایک سُرخ پیراہن والی جل پری کی شبیہ ابھرتی ہے..

چٹان کی چوٹی پر کوئی نہ تھا؟

چٹان خالی پڑی تھی اور جیپ کی کھڑکی میں سے گزر گئی تھی..

تو میں نے اسے کب دیکھا تھا؟

ہوشے کی جانب جاتے ہوئے یا اپنی کوہ نوردی سے لوٹتے ہوئے؟

دیکھا بھی تھا یا نہیں؟

بس یہی عجیب بات تھی..

اور یہ بھی تو کیسی عجیب بات ہے کہ ہم ہوشے سے کاندے پہنچتے ہیں..کاندے کے نالے پر رکھے ان شہتیروں پر سے بے خطر پار جاتے ہیں جن پر ہماری ٹانگیں اور حواس جواب دیتے تھے اور اس کے پار ہمیں فوراً ایک نئی نویلی آرام دہ جیپ مل جاتی ہے جو ہمیں رات اُترنے سے پہلے چھلو لے جاتی ہے..اور ہم ایک مرتبہ پھر اس کے شاندار شالیمار طرز کے موٹل میں موج کرتے ہیں..ابھی سے شائی چو اور ہسپاں کے لیے اداس ہو کر ان کا تذکرہ کرتے ہیں..اس شالیمار میں ہم شاہ جہاں ہو جاتے ہیں..لیکن کسی ممتاز محل کے بغیر..لیکن ہمیں اس کی خواہش نہیں تھی کیونکہ ہمارے پاس لیلے پیک تھی جو خود ایک برفانی تاج محل تھی..

اگلی سویر ہم سکردو پہنچتے ہیں..

پھر شام تک گلگت میں ہوتے ہیں..

پھر بشام، مانسہرہ، ایبٹ آباد، حسن ابدال، راولپنڈی..اور موٹروے پر.. کلر کہار..

بھیرہ..یعنی وہی ایکشن ری پلے چلتا جاتا ہے..

اور آخرکار ہم موٹروے کو چھوڑ کر کالا شاہ کاکو میں اُتر کر جی ٹی روڈ پر آ جاتے ہیں..

اور لاہور میں داخل ہو جاتے ہیں۔

''میں کیا جانوں میں کون ہوں..دروازہ کھولو''

اور تب ایک عجیب سی وحشت مجھے گرفت میں لے لیتی ہے..

میں نے آج تک.. پچھلے بیس برسوں میں شمال کے جتنے بھی سفر کیے تھے..اپنی سالانہ کوہ نوردی سے جب بھی گھر لوٹا تھا..تو گھر میں..ہمیشہ میرے تینوں بچے میرے منتظر ہوتے تھے..میں پتھروں اور برفوں کا مارا ہوا مرجھایا ہوا ان کے چہرے دیکھ کر کھل جاتا تھا..میرے تن بدن میں موسم کے اور بغیر موسم کے جتنے بھی پھول شمار ہو سکتے ہیں، وہ سب کے سب انہیں دیکھ کر کھل جاتے تھے..کہیں ہارسنگھار مہک دیتا تھا..کہیں نرگس اور فریزیا..کہیں پٹونیا..زینیا اور کہیں کیکر کے زرد پھول..سب کے سب یکبار کھل جاتے تھے..

لیکن جی ٹی روڈ پر اترتے ہی..ٹریفک کی بھیڑ میں جب ہماری ویگن داخل ہوئی تو مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا..یہ احساس ایک دھماکے کی طرح پھٹا کہ اس برس تو وہ وہاں نہیں ہیں..

سلجوق..نہیں ہے..فارن سروس میں ہے..پاکستان کونسلیٹ جدہ میں وائس کونسل کے عہدے پر اپنے سفارتی فرائض سرانجام دے رہا ہے..بیٹی..قرۃ العین..نہیں ہے..کنگ ایڈورڈز کالج سے متعدد گولڈ میڈل حاصل کرتی، اب باقاعدہ ڈاکٹر ہو چکی ہے..شادی شدہ ہو چکی ہے اور پاکستان میں نہیں ہے..فلوریڈا کے شہر آرلینڈو میں اپنے بلال کے ساتھ خوش و خرم ہے..

یہ پرندے تو اڑ چکے ہیں..

گھونسلا تقریباً ویران ہو چکا ہے..

وہ دن گئے جب وہ اپنی چونچیں کھولے میرا انتظار کرتے تھے..

صرف سمیر ہے اور وہ بھی اڑنے کی تیاری کر رہا ہے..سول سروس اکیڈمی میں ایک

زیر تربیت بیوروکریٹ ہے..اس کی پوسٹنگ جانے کہاں ہوتی ہے..میں ابھی تک اس خیال سے غافل رہا تھا..

اور اب..موٹروے سے اتر کر کالا شاہ کاکو میں داخل ہوتے ہوئے ٹریفک کی بے پناہ بھیڑ میں داخل ہوتے ہوئے مجھے پہلی بار یہ خیال آیا کہ پرندے تو گھونسلا چھوڑ چکے ہیں..ایک شدید ڈیپریشن نے مجھے شکار کر لیا..میں اب ویگن میں تنہا تھا..

حکیم بے چین تھا کہ کب یہ صاحب بھی اُترے اور میں اپنے گھر جاؤں..

فردوس مارکیٹ..گلبرگ نمبر تین..بائیس بے..

ویگن میرے گھر کے سامنے رُک گئی..میں نے اپنا سامان..رک سیک..اتارا..مونگیائی رنگ کا آہنی گیٹ بند تھا جسے میں نے دھکیلا تو اندر خاموشی تھی..

کوئی بھی نہیں تھا..

ہاں پورچ کے اوپر وہ بیل تھی جو ان موسموں میں پورچ کے اوپر بندھی رسیوں پر پھیلتی انہیں اپنی گرفت میں لیتی، دن رات پتے نکالتی بڑھتی جاتی تھی..اور ہمیشہ سے ایسا ہوتا چلا آیا تھا کہ جب میں کوہ نوردی کے لیے گھر سے نکلتا تھا تو اس بیل کے گچھے اور سرسبز ہونے کے دن ہوتے تھے..ہر بارش کے بعد یہ راتوں رات دوگنی گھنی ہو جاتی تھی اور پورچ کے فرش پر دھوپ کم سے کم ہوتی سائے میں بدل جاتی تھی..اور پھر ہمیشہ یہ بھی ایسا ہوتا تھا کہ میں گھر لوٹتا تھا تو جس بیل کو میں سبز پتوں میں رسیوں میں لپٹا چھوڑ کر گیا تھا، اب اس میں سے تیز گلابی رنگ کے پھولوں کی لڑیاں لٹکتی تھیں..پھولوں کی لڑیاں جن کا پتوں میں سے لٹکنے کا انداز چینی لالٹینوں کی طرح تھا..املتاس کے پھولوں کی مانند تھا..صرف یہ کہ وہ زرد لالٹینیں تھیں اور یہ آتشی گلابی..ہمیشہ!

ان لڑیوں میں سے گرتے چھوٹے چھوٹے گلابی شگوفے پورچ کے سُرخ فرش پر پڑے ہوئے تھے..کار کی چھت پر گرے ہوئے تھے..

سمیر بھی موجود نہ تھا..اسے علم نہ تھا کہ میں شیڈیول سے ایک روز پہلے پہنچ جاؤں گا اور وہ سول سروس اکیڈمی کے چند دوستوں کے ہمراہ کسی پکنک پر جا چکا تھا تو اندر خاموشی تھی..پھولوں سے ڈھکی بیل تھی..گلابی لڑیاں لٹکتی تھیں اور شگوفے گرتے تھے تسبیح کے دانوں کی طرح..اور ان کی آواز نہیں تھی گرنے کی اس لیے اندر خاموشی تھی..

پنک شگوفے..چھوٹے چھوٹے پِن سائز کے..پورچ کے فرش پر گرتے تھے..

ان میں سے کوئی ایک شگوفہ ہوشے کی گلیوں کا تھا..
کسی پرشائی مُچوکی شب رقص کرتی تھی..
کہیں دل سنگ پا کی برفیں اتنی سفید ہوتی تھیں کہ شگوفے کی گلابی رنگت بھی ہلکی ہوتی تھی.. کسی پر ہسپاں کی پندرہ ہزار فٹ بلندی سانس لیتی تھی..
ہر شگوفے پر کوئی ایک مقام نقش تھا..
لیکن ایک ایسا مقام تھا جسے کوئی ایک شگوفہ سنبھال نہ سکتا تھا.. جابجا ایسے شگوفے بکھرے تھے جو اپنی رنگت کھو چکے تھے اور ان پر لیلے پیک کی سفیدی راج کرتی تھی..
لٹل میر میڈ کا سرخ لباس ایک شگوفے پر بکھرا اُس کے رنگ سے میچ کرتا تھا..
ان سب میں گارڈن لائٹ کے قدموں میں پڑا البتہ ایک شگوفہ ایسا تھا جس پر کوئی مقام تصویر نہ ہوتا تھا.. صرف ایک سوالیہ نشان تھا جو سرگوشی کرتا تھا.. اگلے برس تم کہاں جاؤ گے؟.. کہاں جاؤ گے؟..
اگلے برس؟... کل کس نے دیکھا ہے.. ہاں اگر زندگی رہی، ہمت رہی تو کہیں نہ کہیں تو جاؤں گا.. شائد ہراموش کی وادی میں.. شائد بتورہ گلیشیر کے پار.. شائد ایک مرتبہ پھر رتّی گلی کی جھیلوں کو تلاش کرنے کے لیے.. اگر زندگی رہی اور ہمت رہی.. اور اگر میرا رانجھا مجھ سے راضی رہا تو.. جاؤں گا!
میں نے اپنی بڑھی ہوئی داڑھی کو اُنگلیوں کی پوروں سے محسوس کیا.. بُوٹوں کو ایک نظر دیکھا کہ ابھی انہوں نے ایک برس کے لیے رُک سیک کے کُنج تنہائی میں چلے جانا تھا اور سفید دروازے سے لٹکے ہوئے شیر ببر کے مہاندرے والے ناکر کو اٹھا کر دستک دی..
''کون ہے؟'' اندر سے میمونہ کی آواز آئی..
''میں ہوں..
''میں کون؟''
''میں کیا جانوں، میں کون ہوں.. دروازہ کھولو۔''